
www.paksociety.com
رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

ابتدائیہ

سچی کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

ناول

مغرب سے انتخاب

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

یا اللہ مدد فرما......!

وطن عزیز کے طول وارض میں ہاہا کار مچی ہوئی ہے' ہائے بجلی' ہائے گیس' ہائے روٹی اب لوگ تنگ آمد بجنگ آمد احتجاج پر اتر آئے ہیں۔ بجلی کی لوڈشیڈنگ ہے کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی' سونے پہ سہاگا گیس کی لوڈشیڈنگ میں بھی اضافہ ہی ہورہا ہے۔ حکومت اس لوڈشیڈنگ کی آڑ میں نا صرف بجلی کے نرخوں میں اضافہ کررہی ہے' بلکہ گیس کے نرخوں کو بھی آسمان پر پہنچارہی ہے۔ گیس نہ گھر میں آرہی ہے نہ ہی گیس اسٹیشنوں پر' نہ گاڑیوں کے لیے دستیاب ہے' اب تو پیٹرولیم وگیس کے وزیر موصوف نے بلا تکلف یہ اعلان بھی فرمادیا ہے کہ گیس بچاؤ چولہا جلاؤ' اس کا مقصد ہے کہ تمام گیس اسٹیشن جو ملک کے قریہ قریہ میں پھیلے ہوئے ہیں' یک لخت کم از کم ایک ماہ کے لیے بند کردیئے جائیں یعنی ہر قسم کی گاڑیوں کو گیس کی فراہمی بند کردی جائے' گاڑی چاہے ذاتی استعمال کی ہو یا پبلک ٹرانسپورٹ رکشہ' ٹیکسی' منی بسیں اور بڑی بسیں جنہوں نے مہنگائی کے اژدھے سے نمٹنے کے لیے پہلے اپنی گاڑیوں کو ڈیزل مہنگا ہونے کی وجہ سے گیس پر منتقل کیا تھا تاکہ کچھ بچت ہوسکے۔ پہلے ڈیزل سستا تھا اور پیٹرول مہنگا تھا اور گیس پیٹرول سے سستی تھی۔ یہ وجہ تھی کہ لوگوں نے اپنی گاڑیاں جو پیٹرول سے چلتی تھیں ایک بڑی رقم خرچ کرکے گیس پر تبدیل کرایا' اب سنا ہے کہ گیس پیٹرول سے مہنگی کی جارہی ہے۔ اگر دیکھا جائے' سمجھا جائے تو پاکستانی عوام کے کروڑوں روپے حکومت کی نااہلی کی وجہ سے ضائع ہورہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جیسے اب نہ بجلی مل رہی ہے نہ گیس پھر پیٹرول بھی نہ ملے کیوں کہ جو گاڑیاں اب گیس سے چل رہی تھیں وہ سب کی سب ایک دم سے مجبوراً ہی سہی پیٹرول پر چلانا پڑیں گی یعنی پیٹرول کی طلب میں ایک دم سے اضافہ ہوجائے گا۔ کیا پھر پیٹرول کے لیے بھی یوں

ہی لمبی لمبی قطاریں لگا کریں گی؟

تمام ہی سیاسی جماعتیں ایک دم سے عوامی رابطہ مہم پر نکل کھڑی ہوئی ہیں' ایسا محسوس ہورہا ہے کہ شاید اسی ماہ یا آنے والے مہینے میں الیکشن ہونے والے ہیں' ہر کوئی اپنی ڈفلی اپنا راگ الاپ رہا ہے۔ عوامی مسائل کے حل کے لیے صرف زبانی کلامی باتیں ہورہی ہیں اگر ہمیں اقتدار نصیب ہوگیا تو ہم یوں کریں گے' ووں کریں گے' سب آنے والے کل کی نوید سنا رہے ہیں۔ جبکہ آج کے درپیش مسائل کے حل کے لیے کسی کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے نہ ہی حکومتی جماعت اور نہ حکمران اس طرف توجہ دے رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہورہا ہے کہ حکمرانوں نے بھی یہ طے کرلیا ہے' جو کرنا ہے جیسے کرنا ہے کرلو۔ کل کس نے دیکھا ہے' آنے والا وقت کس کے سر پر تاج سجاتا ہے' کون جانے کون حکمرانی کے سنگھاسن پر براجمان ہوتا ہے' اسی سبب شاید حکومت کرنے والوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگ رہی' وہ تو جیسے تیسے وقت پورا کررہے ہیں' اپنی حکمرانی کی مدت پوری کرکے اسکور بنا رہے ہیں۔ کون جانے کل کس کا ہو۔ وقت کے ساتھ ساتھ مسائل بڑھتے جارہے ہیں' کرپشن بدعنوانی نئے نئے عنوانات سے پھیلتی ہی جارہی ہے۔ عوام کو درپیش مسائل سے ایسا محسوس ہورہا ہے کہ کسی کو کوئی دلچسپی ہے' ہی نہیں' ہر کوئی اقتدار کی بیل سے اسکور توڑ لینا چاہتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ ہم اہلِ پاکستان کو عقلِ سلیم عطا فرمائے اور اپنے مسائل خود حل کرنے کی توفیق عطا فرمائے' ہمارے اہلِ سیاست اور اقتدار کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اہلِ وطن کے دکھ درد کو سمجھ سکیں' اس کا مداوا کرسکیں۔ اللہ پاکستان کی اور اہلِ پاکستان کی حفاظت فرمائے' اپنی پناہ عطا فرمائے۔ یا اللہ! ہماری مدد اپنے غیب سے فرما' مدد فرما...... مدد فرما...... آمین یارب العٰلمین۔

گفتگو

عمران احمد

> حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم اس وقت تک جنت میں نہیں جاسکتے‘ جب تک مومن نہ ہو اور اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ ہو اور کیا میں تمہیں ایک ایسا طریقہ نہ بتاؤں کہ اس پر عمل کرنے سے تم میں باہمی محبت پیدا ہو؟ (وہ طریقہ یہ ہے کہ) تم ایک دوسرے کو سلام واضح طریقے سے کیا کرو۔“ (مسلم‘ ترغیب)

عزیزان محترم...... سلامت باشد

ہم سوچ رہے ہیں کہ آپ کو یوم آزادی کی مبارک باد دیں یا نہ دیں۔ ہم تو اس سوچ میں ہیں کہ آیا ہم آزاد بھی ہیں یا نہیں۔ ہم نے یعنی ہماری نسل نے تقسیم ہند ہوتے نہیں دیکھا بلکہ بہت سوں نے تو تقسیم پاکستان ہوتے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ البتہ بزرگوں سے سنا اور پڑھا ضرور ہے کہ برصغیر میں انگریزوں نے مسلمانوں کو کچلنے کے لیے ہندو قوم کی سرپرستی کی اور یہاں کے عوام کو آپس میں لڑایا اس وقت مسلمانوں میں بڑا اتحاد تھا۔ وہ مل کر انگریزوں اور ہندوؤں کی سازشوں کا مقابلہ کرتے تھے جب بہار میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تھا تو سندھ اسمبلی سے ایک آواز بلند ہوئی تھی کہ اب بہار میں ایک بھی مسلمان مارا گیا تو سندھ میں کوئی ہندو نہیں بچے گا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اس سرزمین میں جسے 20 لاکھ انسانوں نے اپنے خون سے پاک کرکے اس کا نام پاکستان رکھا وہاں مسلمان کے ہاتھوں مسلمان محفوظ نہیں۔ اتنی مساجد تو تقسیم ہند کے وقت بھی غیر مسلموں نے نہیں تباہ کی ہوں گی جتنی خود ہمارے کلمہ گو بھائیوں نے بم دھماکوں سے تباہ کردیں۔ ایک حدیث کہیں پڑھی تھی کہ قیامت تب قائم ہوگی جب ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے خوف سے رات جاگ کر گزارے گا۔ آج ہم زبان اور فرقہ کی بنیاد پر ایک دوسرے کو شناخت کرکے مار رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنے حقوق کا قاتل اور لٹیرا قرار دے رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہم خود کو مہذب مسلمان قرار دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے حال پر رحم کرنے کی توفیق دے۔

طاہرہ جبیں تارا...... لاہور سے لکھتی ہیں محترمی عمران صاحب آداب‘ کچھ موسم کی گرما گرمی اور کچھ سیاسی گرما گرمی ان حالات میں نئے افق کا ٹائٹل چمکتا سورج امید سحر کا پیغام لیے ہوئے آیا کہ آنے والے دن چمکتے چاند‘ ستاروں اور سورج کی مانند ہوں گے۔ سی این جی اور پیٹرولم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے سے ہم ایک بار پھر گھوڑوں اور اونٹوں کے ہمراہی ہوں گے۔ فضا صاف وشفاف دھوئیں اور آلودگی سے پاک ہوگی۔ سبز کونپلیں اور گھاس تروتازگی بخشے گی۔ ریئلی نئے افق کا ٹائٹل تو ہمارے فیوچر کا عکاس ہے۔ بہرحال اب بات ہوجائے نئے افق کے بارے میں۔ دستک میں مشتاق انکل آج مسلمانوں کے زوال کی وجہ ہی اسلام سے دوری ہے۔ اسلام سے دوری نے بے راہ روی کو جنم دیا ہے لوگ اپنے گناہوں کا بوجھ کوڑا کرکٹ پر پھینک کر چلے جاتے ہیں‘ جہالت کا دور ہے کہ انسان کو اپنے نفس پر قابو نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے مرکز کی طرف رجوع کرنے کی توفیق دے۔ ”گفتگو“ میں تمام ساتھیوں سے ملاقات رہی۔ عالیہ جی آپ کی کمی محسوس ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے نام مبارک سے آگہی نے دل ودماغ کو نور ربانی سے منور کردیا۔ لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے نام نہاد پیروں اور عاملوں سے رجوع کرتے ہیں جو کالے علم سے لوگوں کو اسلام سے دور لے جارہے ہیں جبکہ زندگی کے مسائل کا حل تو قرآن مجید میں پوشیدہ ہے صرف آگاہی کی ضرورت ہے۔ یہ سلسلہ ننانوے ناموں کا ختم نہیں ہونا چاہیے بلکہ پھر اسمائے مبارک حضور کی صفات شروع کردیجیے گا۔ اقرأ‘ اللہ تعالیٰ ہمارے اندر صبر وقناعت کی دولت پیدا کردے استقلال اور ثابت قدمی کی دولت ہمیں نصیب ہو۔ سب سے پہلے مستقل سلسلے پڑھے۔ ”گردش“ شہناز آپی ویل ڈن کہانی نیا موڑ لے رہی ہے جب شمروز‘ سرمئی اور بیگم سطوت تین تکونیں اکٹھی ہوں گی تو پھر سطوت کی ستم ظریفیوں کا پردہ چاک ہوگا۔ سیاسی میدان میں باپ‘ بیٹی‘ بیٹے اور بیوی یہاں تک کہ ماں‘ باپ کا رشتا بھی نہیں رہتا آپ نے سیاست کی موشگافیوں پر صحیح روشنی ڈالی ہے۔ ”سیوک“ اپنے انجام کو پہنچی روی اور آشا‘ وکرال اور وچترا ملے مگر انجام کچھ غیر حقیقی لگا۔ جنوں کی بارات اور ولیمہ کا انتظار کرنا

پھر رشتا مانگنا‘ بہرحال غیر حقیقی سہی مگر مزے کی رہی۔ ”بازی گر“ حسام بٹ آپ نے کس کو مار دیا۔ تجسس کو ہوا دی ہے۔ بہرحال دیکھیں اب بازی گر کیا کرتب دکھاتا ہے۔ کہیں عبدالخالق تو نہیں؟ ”خالی دامن“ امیر بننے کا شارٹ کٹ راستا‘ آج کل ہمارے عامل اور پیر بھی یونہی گدوں کے نیچے پیسے جمع کرتے ہیں۔ ویسے دو تین مہینے پہلے میں نے ان کے خلاف سروے کیا تھا اور جب سروے رپورٹ شائع ہوئی تو کافی نام نہاد پیروں اور عاملوں کے اڈوں پر چھاپے پڑے۔ اللہ ایسی حرام دولت سے بچائے۔ سچی کہانیوں میں پانی کا محل‘ بہترین رہی۔ محمد سلیم اختر نے سیلاب کے بعد حکومت کی مہربانیوں کو بڑی چابکدستی سے بیان کیا۔ یوں ہی تو ہوتا ہے کسی ویرانے اور دور افتادہ بنجر زمینوں کو الاٹ کردینا اور پھر میڈیا پر اپنی رحم دلی کی تشہیر کرنا‘ یہی تو حکومت کا شیوہ ہے۔ ”محبت زدگان“ شہنی جی‘ محبت کے حساس موضوع کو معاشرے میں رہتے ہوئے نفس پرستی کے حوالے سے بیان کرنا واقعی کمال ہے پھر اپنی غلطی تسلیم کرنا اور اس کا مداوا کرنا بہترین ہے۔ ویسے اس کہانی کا نام مداوا ہونا چاہیے تھا۔ (پلیز ڈونٹ مائینڈ) ”آشیانہ“ ظلیل جبار‘ بعض لالچی والدین اپنے ہاتھوں سے اپنی اولاد کے آشیانے کو آگ لگادیتے ہیں صد شکر کہ زینت کا آشیانہ سلامت رہا۔ ”مداوا“ مہتاب خان‘ محبت غرور وتکبر‘ انتقام اور شرارت کے تناظر پر لکھی گئی کہانی یہ جو سیل ہے یہ ایسے ہی رنگ دکھاتا ہے کہ انسان بغیر سوچے سمجھے اس کو سچ جان لیتا ہے۔ میسج کو میسج نہیں سمجھتا حقیقت سمجھ لیتا ہے۔ ”ادھورا انسان“ فاخرہ سلطانہ‘ معذرت کے ساتھ موضوع تو اچھا تھا مگر کہانی بے ربط سی رہی بلکہ سر سے گزر گئی۔ شروع میں ایک ادھوری لڑکی کی کہانی لگی پھر طالب علم کچھ سمجھ نہیں لگی دراصل کہانی ہے کس کے بارے میں۔ مغربی ادب سے انتخاب‘ ”محبت کا امتحان“ راحیلہ تاج نے مغربی لوگوں کی محبت کو کامیاب کردیا اور فلرٹ اپنے انجام کو پہنچا۔ ”ترجمان“ احمد صغیر صاحب شکر ہے پاکستانی پولیس نہیں تھی ورنہ تو پال سلاسٹر جیل میں ناکردہ گناہ کی سزا میں چکی پیس رہے ہوتے۔ روحانی مسائل کا سلسلہ ایک اچھی کاوش ہے۔ بہرحال اس دفعہ کا نئے افق خوب صورت رنگوں سے مزین تھا۔ قارئین اور نئے افق کو سجانے والوں کو پیشگی رمضان مبارک اللہ تعالیٰ یہ مقدس اور بابرکت مہینہ اہل پاکستان کے لیے مبارک ثابت کرے۔ آمین

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہِ جولائی کا شمارہ اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے اور میں حیرانی اور خوشی کے ملے جلے جذبات لیے اس کے سرورق کو دیکھ رہا ہوں۔ اتنا سندر اور خوب صورت سرورق بہت خوب بنانے والے کے ہاتھ چومنے کو دل چاہتا ہے۔ آگے ورق الٹا تو فہرست پر نظر پڑی۔ اس بار پھر مایوسی‘ خیر بوجھل دل لیے اپنے پسندیدہ رائٹر مشتاق احمد قریشی صاحب کی ”دستک“ تک پہنچے۔ مشتاق بھائی اس بار عورتوں پر ہونے والے ظلم اور ناروا سلوک کی کہانی سنا رہے ہیں۔ سیانے کہتے ہیں کہ جب تک کلہاڑی کے ساتھ لکڑی کا دستہ شامل نہ ہو کسی درخت کو کاٹنا محال ہے۔ اس طرح عورت پر ظلم ڈھانے کے سلسلے میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ چاہے وہ ساس کے روپ میں ہوں‘ نند کے روپ میں یا کسی اور وسیلے سے ہوں۔ بہرحال یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے۔ اب باری آتی ہے اپنی محفل کی۔ شہناز بانو اپنے طویل تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ بہن اتنے طویل تبصرے میں آپ نے میرا ذکر بھولے سے بھی نہیں کیا۔ خیر ایک آپ پر کیا موقوف کسی بہن بھائی نے مجھے یاد نہیں کیا۔ خیر اس موقع کے لیے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ۔

عمر بھر کون کسے یاد کیا کرتا ہے
وقت کے ساتھ خیالات بدل جاتے ہیں

شہنی ارشاد بہن اس بار آپ کی کہانی موجود ہے۔ بڑی خوب صورت اور اچھی کہانی ہے۔ خاص کر کرداروں سے خوب انصاف کیا ہے۔ مجاہد ناز عباسی بھائی اس ملک میں کون سا کام ٹھیک ہو رہا ہے۔ لوگوں کی اپنی اپنی مجبوریاں ہیں۔ تبھی ٹھگ لوگوں کی بن آئی ہے۔ باقی خطوط میں عصمت اقبال‘ سید عبداللہ شاہد‘ بہن ناز سلوش ذشے‘ عبدالمالک کیف اور محمد بخش لنگاہ صاحبان کے خطوط اپنی مثال آپ تھے۔ اب بڑھتے ہیں باقی سلسلوں کی طرف۔ اس بار بزم شعروسخن پھر غائب ہے۔ کیا آپ نے یہ سلسلہ بند کردیا ہے۔ ضرور بتائیں۔ خوش بوئے سخن میں حمد باری تعالیٰ غلام سکینہ صابر لنگاہ‘ ریحانہ سعیدہ لاہور کی نظم‘ ناز سلوش ذشے‘ آزاد کشمیر کی مہربان زیادہ پسند آئیں۔ باقی بہن بھائیوں کا انتخاب بھی خوب ہے۔ ذوق آگہی میں مفلس کون‘ وجہ نام کشمیر‘ سوال کی مذمت‘ ایک بادشاہ کی حکایت‘ بہت اچھی ہیں۔ کہانیوں میں گردش‘ اور بازی گر اچھی جارہی ہیں۔ لمحہ لمحہ بدلتے حالات واقعات کو بڑے موثر انداز میں آگے بڑھایا جارہا ہے۔ حالانکہ مجھے سلسلے وار کہانیوں سے الرجی ہے لیکن ان دو سلسلے وار کہانیوں نے الرجی کو میرے قریب بھی نہیں بھٹکنے دیا ہے۔ مداوا‘ پانی کا محل اور ادھورا انسان بھی پسند آئیں۔ محبت زدگان کے متعلق پہلے عرض کرچکا ہوں۔ مغربی ادب سے انتخاب مجھے کم ہی پسند آتا ہے۔ کیونکہ

ہمارا اپنا ادب بڑا وسیع ہے۔ پھر کچھ لوگ ایسی کہانیاں پسند کرتے ہیں اس لیے یہ کہانیاں بھی پرچے کے لیے ضروری ہیں۔ روحانی مسائل کا سلسلہ بھی ایک اچھی با مقصد کاوش ہے۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہوں گا۔ اگلے ماہ ان شاء اللہ پھر حاضر ہوں گا۔ اللہ حافظ

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم۔ محترم عمران بھائی! السلام علیکم! امید ہے آپ بالکل خیریت سے ہوں گے خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ نئے افق سامنے ہے۔ دستک، اسماء الحسنیٰ، اقرا، خوش بوئے سخن اور ذوق آ گہی رسالے کی شان بڑھا رہے ہیں۔ عمران بھائی آج کل ہر طرف توہم پرستی اور جادو ٹونے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ان کے توڑ اور طریقے بتائے جا رہے ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں اپنی ایک شرارت یاد آ گئی۔ جو میرے بہن بھائی اور کزن نے مل کر کی تھی۔ مختصر کر کے بتاتی ہوں۔ ہمارے ہمسائے میں کافی بڑی فیملی رہتی تھی۔ ان کی دادی اماں اکثر میری والدہ کے پاس آ جاتیں اور ان کی باتوں کا موضوع زیادہ تر جادو ٹونے سے متعلق ہوتا۔ انہیں یہ بھی وہم تھا کوئی ان پر جادو کرتا ہے۔ ہم سب بہن بھائی بڑے غور سے ان کی باتیں سنتے ان کی باتوں سے ہی معلوم ہوا کہ جادو میں کون کون سی اشیاء استعمال ہوتی ہیں۔ میں میٹرک کے پیپرز دے کر فارغ تھی اور ذہنوں میں شرارتوں کا کارخانہ پہلے ہی فٹ تھا۔ سو ہم نے مل کر جھوٹ موٹ جادو کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلا مرحلہ وہ اشیاء اکٹھی کرنا تھیں اس کام کے لیے ایک کالا کپڑا، ایک گڑیا میں کامن پنیں چبھوئیں، ایک کاغذ پر خانے بنا کر اردو میں گنتی لکھی دوسری طرف ایک کھوپڑی اور کراس میں ہڈیوں کی تصویر بنائی ایک لمبا سائز کا کانٹا لیا والدہ کے بالوں کا گچھا لیا جو والدہ ایک لفافے میں اکٹھے کیا کرتی تھی۔ یہ سب کچھ کالے کپڑے میں ڈال کر پوٹلی بنالی۔ اب مسئلہ تھا ان کے گھر کیسے رکھا جائے یہ کام بھائی کو سونپا وہ اپنی چھت سے ہمسایوں کی چھت پر گیا اور سیڑھیوں کے قریب پوٹلی رکھ دی۔ آگے کی کارروائی دیکھنے ہم ان کے گھر چلے گئے۔ دادی اماں کی پوتیاں ہماری اچھی دوست تھیں تھوڑی دیر گزری کہ ان کی چھت سے زور زور سے چیخنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ سب چھت کی طرف بھاگے پیچھے ہم۔ گھر کا جو فرد اس پوٹلی کو دیکھتا چیخنا چلانا شروع کر دیتا۔ تھوڑی دیر تک سارا محلہ ان کے گھر جمع ہو گیا۔ ان میں سے کسی نے مشورہ دیا علاقے کے مشہور و معروف پیر صاحب کے پاس جانے کا۔ اس دوران دادی اماں نے ایسی ایسی بددعائیں دیں کہ اللہ کی پناہ۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ سب کچھ بتا دیا جائے لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پیر صاحب کی بات ہوئی تو ہم نے سوچا وہ مانے ہوئے پیر ہیں۔ وہ دیکھتے ہی بتا دیں گے کہ یہ کسی کی شرارت ہے ہو سکتا ہے وہ یہ بھی بتا دیں کہ یہ ہماری کارستانی ہے۔ تو اس وقت ہم بتا دیں گے ہم نے تو مذاق کیا ہے اور ان لوگوں کی پریشانی ختم ہو جائے گی۔ دادی اماں نے جاتے ہی پوٹلی پیر صاحب کے آگے رکھی اور روتے ہوئے کہنے لگیں یہ دیکھیں کسی نے ہم پر کیا ظلم کیا ہے۔ پیر صاحب پوٹلی دیکھتے ہی جلال میں آ گئے۔ پوٹلی کو تھوڑا دور پھینکا اور اونچی آواز میں گرجے سب پیچھے پیچھے ہٹ جاؤ۔ چھڑی سے اسے ٹٹولا اور کہا شکر کریں بی بی آپ لوگ بچ گئے۔ ورنہ یہ تو انتہائی خطرناک قسم کا کالا جادو ہوا ہے۔ پیر صاحب کا یہ کہنا تھا کہ اماں جی نے پھر گالیاں اور بددعائیں دینا شروع کر دیں۔ ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے یہ کیا ہو گیا۔ اب تو ہمیں بھی شک ہونے لگا کہیں ہم لوگوں سے اصلی جادو تو سرزد نہیں ہو گیا۔ پیر صاحب نے کہا گھبرائیں نہیں اب اس جادو کا توڑ کرنے کے لیے ایک کالا بکرا اور مرغے اور کچھ رقم لے آئیں۔ ہمارے ہمسایوں نے یہ سب کیا کافی عرصہ تک محلے میں اس خوفناک کالے جادو کا تذکرہ ہوتا رہا۔ آج بھی ہم بہن بھائی اس شرارت کو یاد کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہم اردگرد دیکھیں تو اس طرح کے کئی نام نہاد پیر نظر آئیں گے۔ جو سادہ لوح لوگوں کو لوٹ رہے ہیں۔ محترم مشتاق احمد صاحب کی ایدھی کے جھولے کے عنوان سے فکر انگیز تحریر تھی۔ خدا ہم سب کو نیکی کے رستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ شہنی ارشاد آپ کی کہانی محبت زدگان اچھی لگی۔ خدا ہمیں شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔ پانی کا محل، مداوا اور آشیانہ بہترین کہانیاں تھیں۔ مغربی ادب سے انتخاب میں امتحان دلچسپ لگی شہناز باجی دل کے قریب رکھنے کا شکریہ۔ ناز سلوش میر پور میں ہمارے کافی عزیز اور ملنے والے رہتے ہیں۔ میں اکثر وہاں جاتی رہتی ہوں نئے افق بھی النور بک سینٹر سے خریدتی ہوں۔ دعوت دینے کا شکریہ۔ گفتگو میں شرکت کرنے والے تمام احباب کو سلام۔

حیدر...... حسن ابدال۔ محترم عمران بھائی، السلام علیکم! آپ ایک طویل عرصے سے نئے افق شائع کر رہے ہیں۔ میں آپ کا میگزین اس وقت سے پڑھ رہا ہوں جب آپ ابن صفی مرحوم کی عمران سیریز اور کرنل فریدی کی اسٹوری شائع کرتے تھے جب سے وہ سلسلے ختم ہوئے تو پھر میں نے نئے افق پڑھنا چھوڑ دیا لیکن پچھلے دو سال سے آپ کا ناول پھر سے پڑھ رہا ہوں اور اس کی وجہ این شاہین ہیں۔ آپ کے لیے اور این شاہین کے لیے اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ۔

خوش رہیں آپ سدا

بس یہی ہے میری دعا

اللہ آپ کو اور این شاہین کو صحت و کامیابی عطا فرمائے آمین۔ باقی سب کے لیے دعا۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ اچھے عمران جی، السلام علیکم! اچھے ہوں گے بمع احباب مجلس کے۔ جولائی کا خوب صورت سرورق والا شمارہ موصول ہوا۔ مگر ساتھ ہی ہمارے ملک کے حالات، غریبوں اور سفید پوش طبقہ کی زبوں حالی ذہن کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ منافقت، مطلب پرستی، حقوق العباد کی پامالی، چوری، ڈاکے، جھوٹ یہ سب ہمیں کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ کبھی ہم دل پر ہاتھ رکھ کر پوری سچائی سے مانیں کہ ہم بڑے لوگوں، حکمرانوں کو 24 گھنٹے کوستے ہیں اور خود اپنے طور پر کتنے نرم دل ہیں۔ دوسروں کی تکلیف میں اسے کم کرنے کے لیے کتنا ساتھ دیتے ہیں۔ ہم بحیثیت اپنے آپ کے بھی اتنے ہی منافق، اتنے ہی کمینے اور بے صبرے نہیں واقع ہوئے؟ اور پھر اللہ، جیسی قوم ہوا کرتی ہے ویسے ہی حاکم مسلط کر دیتا ہے۔ ہمارا اپنا چناؤ تھا نا پھر بھگتیں مگر ہم اپنے آپ کو تو ٹھیک کریں نا۔ جاپان میں جو تباہی آئی اس میں جاپانی قوم کا ضبط اور ایک دوسرے کی اعانت عظیم ترین مثال بنی ہے اور ہم ایسے کئی مواقع پر امداد کی اشیاء خود کھا جاتے ہیں۔ وگرنہ یہ سب لاہور کے مخصوص بازاروں، پشاور کے صدر، باڑا مارکیٹوں اور راولپنڈی کے لنڈا بازار میں سر عام نہ بک رہی ہوتیں۔ اپنا گہرا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اس قدر ذلت کے گہرے کنویں میں اتر جانے کے بعد ایسے بندوں، ایسے انسانوں اور ایسی قوم کو زندہ رہنے کا حق ہے؟ تم لاکھ دعائیں کرو، وظیفے پڑھو، نمازیں ادا کرو، حج کرو، عمرہ ادا کرو مگر کیا ہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کے ناتے حرام کھانا بند کر دیں گے؟ حرام کھا کھا کر جسم بھی حرام کا ہو جاتا ہے پھر یہ سب کیسے قبول ہو؟ ذرا سوچیے، غور کیجیے اپنے آپ کو سدھاریے بات دور چلی گئی۔ آئیے خوب صورت فہرست کے بعد گفتگو میں شامل ہوتے ہیں۔ محترمہ شہناز بانو کا بھرپور تبصرہ سوچنے کے لیے بھی بھرپور مواد دے گیا اور ہاں نازش بانو صاحبہ کی باتوں پر فوری عمل کریں وگرنہ ڈانٹ پھر پڑے گی۔ عبداللہ شاہد کو تسلی دی ہماری طرف سے بھی بھرپور تسلی دے دیں۔ اور...... اور آپ یہ معذرت کیوں کر رہی ہیں۔ نازش کی طرح ہمیں بھی ڈانٹ کر واپسی کا گیئر لگانے کا کہہ سکتی ہیں۔ آپ کی باتیں بے حد اچھی رہیں ہمارے میگزین کے لیے آپ، عالیہ انعام، شہنی ارشاد، راحیلہ تاج ایک قیمتی اثاثہ ہیں اور آپ سب کی ہم لوگ دل سے قدر کرتے ہیں۔ باقی اپنی صنف کے لوگوں کی فہرست پھر کبھی سہی۔ لیجیے شہنی ارشاد صاحبہ نے تو قلم بھیجنے کی دھمکی دے دی۔ نہیں بھئی یہ سب آپ لوگوں کی محبت ہے۔ احساس ہے اور ہم جیسے لوگوں کے لیے صحرا میں نخلستان جیسے ہیں۔ سب کو اللہ سلامت رکھے آمین۔ ناز، سعیدہ آپ شامل ہیں۔ مجاہد ناز عباسی آپ نے بے نظیر انکم سپورٹس میں یہ حرام کاری بتائی ہمارے معاشرے میں ایسی حرکتیں ہر محکمہ اور ہر جگہ در آئی ہیں۔ سچی بات ہے جب محافظ ہی چور بن جائیں تو پھر کیا توقع رکھیں۔ تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ بھرپور تبصرہ تھا آپ کا بہت اچھا لگا۔ عصمت اقبال عین آپ کا درد سے لبریز تبصرہ دل میں اتر گیا اور شعر تو بڑا ہی اچھا تھا۔ لیجیے یہ ہمارے پڑوسی آ گئے ہیں مگر حق ادا نہ کر سکے کہ غیر حاضری پر ہمارا پوچھ ہی لیا ہوتا حالانکہ ان کی جاسوسی کہانیوں کے سب سے بڑے فین ہم ہیں۔ دوسرے رسالوں میں آپ کی حاضری دیکھتے رہتے ہیں۔ ہاں اس دفعہ یاد کرنے کا بے حد شکریہ اور بھئی آپ فہرست سے غائب کیوں ہیں؟ تبصرہ اچھا تھا ریاض بھائی۔ انجم فاروق ساحلی مختصر اور عجیب قسم کی وضاحت کرنے کے بعد غائب؟ آپ کی تحریروں کا میں منتظر رہتا ہوں۔ عبداللہ شاہد کا تلخی اور شکایتوں سے بھرپور تبصرہ بھی خوب لگا مگر شاباش ہمارے عمران جی نے تحمل اور صبر سے خوب صورت جواب سے نوازا۔ لیجیے شاہد بھائی میں نے تو ابھی سے اگست کے شمارے کا انتظار کرنا شروع کر دیا ہے کہ کب آئے اور آپ کی کہانی پڑھیں۔ ناز سلوش کا تبصرہ خوب تھا۔ ویسے بھی نا شکری نہ کرو ٹافی بنا دیا یا سفیدے کے درخت کی طرح لمبا کھینچ دیا گیا۔ تبصرہ صدارتی کرسی اختیار کر گیا نا۔ بہرحال، ہر حال میں شکر کرو۔ کیف یہ کیا ہاہاہاہا تھا؟ ہاں آپ نے یاد کیا اور ہم حاضر ہوئے کہ اپنے انکل کو اتنے یاد کرنے والے بھی تو یاد رکھتے ہیں۔ عبدالمالک کیف بھئی سمجھتے ہیں کہ جیسے عورت اپنے گھر میں کسی دوسری عورت کو کبھی برداشت نہیں کرتی اسی طرح یہ آنچل کی محفل میں مردوں کو کیسے برداشت کریں کہ ان کی اپنی حصار کی ہوئی فصیل میں دراڑیں پڑنے کا خطرہ ہے۔ بھئی یہ مردوں کا ہی دل گردہ ہے کہ ہر مردانہ ڈائجسٹ اور میگزین میں یہ آ ٹپکتی ہیں۔ (بھئی یہ کیف کی تسلی کے لیے صنف نازک کو ہرگز ابال میں آنے کی ضرورت نہیں)۔ لیجیے یہ فقیر محمد لنگاہ صاحب بھی شکوہ اور شکایت سے بھرپور تبصرے سے آئے ہیں۔ اتنا گلہ، اتنی شکایات، براہ کرم بھائی عمران جی کی باتوں پر غور کریں اور اپنی کہانیوں کو اسی سانچے میں ڈھال کر سرخرو ہو جائیں۔ بہرحال بہت سلام اور عمر خضر اور محبت جاوداں کی دعائیں۔ کچھ ہمارے پیارے کہاں ہیں جیسے کہ شاہین صاحبہ، ریحانہ سعیدہ، ناظم بخاری، محمد علی کیف، آکاش بخاری وغیرہ پلیز جلدی حاضری دیں

شکریہ۔ یہ منچن آباد کے تمام ساتھی تو پورے کا پورا گروہ ہی غائب ہے کہیں سرور شاذ کے لشکر تلے تو نہیں جمع ہو گئے یہ سن لو کہ اس کی پیروی کر کے کہیں کے......! واپسی جلدی کریں۔ ''دستک'' زبردست ایمان افروز اور دماغ کی کھڑکیاں کھولنے کے لیے نسخہ خاص رہا جزاک اللہ۔ مشتاق قریشی صاحب' احادیث کی تعریف نہیں ہو سکتی بلکہ عمل کرنے پر ہی جزا ملے گی۔ طاہر صاحب کی کاوش دین و دنیا میں کامیابی کا راز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ حسام بٹ صاحب کی پر تحقیق اور جامع تحریر نے اسماء الحسنیٰ کے مضمون کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ''حیی'' اللہ تعالیٰ کے افضل ترین ناموں میں سے ایک ہے اور اس کا دن بھر ورد بمع ''یا قیوم'' مسلمانوں کے دلوں کو کھول دیتا ہے' برکت ہی برکت ہے۔ سچی کہانیوں کی طرف پہلے چلتے ہیں۔ اس دفعہ سچی کہانیوں میں مداوا (مہتاب خان) اور محبت زدگان (شہنی ارشاد) دونوں ٹاپ پر رہیں۔ دونوں میں بڑے گہرے انداز سے معاشرے کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اور کسی بھی لحاظ سے عام کہانی نہیں لگتیں۔ شہنی صاحبہ تو احادیث اور آیات کے جلو میں انسانوں کو بہت بڑا اسبق دے جاتی ہیں۔ پھر آشیانہ (خلیل جبار) ایک پر معانی اور زبردست معاشرتی کہانی ہے۔ ادھورا انسان (فاخرہ سلطانہ) درمیانہ درجہ کی رہی کہ پوری کہانی ہی فلسفہ تھی۔ خیر جی آیا نوں اور پانی کا محل (محمد سلیم اختر) تو سیلاب کے پس منظر میں مظلوم عوام کی داستان لکھ دی ہے مگر مسلسل طویل پیرے بھی ذرا دماغ پر بار گزرتے ہیں۔ مغربی ادب میں کبھی کبھی تو مزا ہی آ جاتا ہے مگر اس دفعہ دونوں کہانیاں نرم نرم سی رہیں کیونکہ مغربی ادب کا معیار آسمان کو چھوتا ہے اور اس لیے بے حد اچھوتی اور خوب صورت کہانیوں کا ان دونوں مصنفین کو انتخاب کرنا چاہیے۔ ناول میں سیوک اچھا موڑ لے کر ختم ہوا اور اب عمران جی زبردست گزارش ہے کہ کوئی سلسلہ وار ناول نہ شروع کریں۔ بلکہ یہ 30 تا 40 صفحات میں سچی کہانیاں (4 عدد) جو 15 تا 20 صفحات لے لیں اور بہت سے لوگ لکھاری کی پینڈنگ اور منتظر کہانیاں ہر ماہ ان صفحات کی زینت بن سکتی ہیں۔ باقی صفحات پر بدیسی کہانیاں (مغرب سے 2 سے 3 کردیں) اور برصغیر کے بامعنی اور زبردست ادبی چاشنی لیے ہوئے مصنفوں کی 2 عدد کہانیاں دے دیں۔ علاقائی ادب سے' برصغیر کے ادب سے' خاص کر پاکستانی ادب سے یہ کہانیاں لی جا سکتی ہیں۔ قارئین آپ بھی ذرا حمایت کر دیں۔ ناول ''خالی دامن'' بہر حال روایت سے ہٹ کر لکھا جا رہا ہے خوب ہے۔ مستقل سلسلوں میں زبردست ہے گردش' شہناز بانو صاحبہ تو قاری کو اپنی تحریر کے جادو کے حصار میں لے کر لکھتی ہیں' بہت خوب۔ شہاب اور اسعد کو بے حد پیار اور دعائیں۔ دونوں کہاں کہاں کام کر رہے ہیں آپ کے لیے بتا رہا ہوں کہ میرے بیٹے (ایم فل اور انجینئر) اللہ کے کرم سے بزنس کر رہے ہیں۔ دعاؤں کی ضرورت ہے۔ سعودی عرب والا بڑا بیٹا آپ سب کی دعاؤں سے ڈپٹی جنرل منیجر (الیکٹرک انجینئر) سیمنس میں ہوا ہے۔ دعاؤں کا طالب ہوں۔ ارے جناب روحانی مسائل تو بہت ہی زبردست جاری ہوا ہے۔ حافظ صاحب جزاک اللہ۔ عمر اسرار کی خوش بو سخن تمام ہی زبردست ہوتی ہیں۔ عمر اسرار اچھے لگے کہ میرے چھوٹے بیٹے کا نام بھی عمر ہے۔ آزاد نظموں میں ریحانہ سعیدہ' ناز سلوش ذشے اور این شاہین تینوں قابل ستائش ہیں۔ بے حد گہری اور دل پر اثر کرنے والی یہ نظمیں بڑی کاوش سے تخلیق کی گئی ہیں۔ حمد باری تعالیٰ تو سر آنکھوں پر۔ غلام عباس جتوئی سب پر بھاری رہے اور باقی بھی اچھے تھے۔ ذوق آگہی زبردست مواد لیے ہوئے تھا۔ عفان احمد صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں اور شاعری والا صفحہ ختم کر دیا۔ یہ آپ اور پر میری تجاویز میں سے صفحات نکال سکتے ہیں اور کیا لکھوں ان شاء اللہ وقت ذرا بھی ملے تو اس طرح تفصیلاً تبصرہ سے حاضر ہوا کروں گا۔

سید عبداللہ شاھد...... حیدر آباد محترم جناب من بھائی عمران احمد صاحب! السّلام علیکم ورحمۃ خدائے مطلق سے امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور میرے ہر دلعزیز رسالے نئے افق کی تمام وحدتوں' وسعتوں اور رفعتوں کے ساتھ مصروف کار ہوں گے۔ اور اس موقر جریدے کی بدولت سماجی' ثقافتی اور ادبی حلقوں میں میرے وطن کے پرجوش نوجوانوں کے روشن اور خوش حال مستقبل کے لیے کوشاں ہوں گے۔ اللہ عزوجل آپ کو صحت و سلامتی دے اور عمر دراز کرے' آمین ثم آمین۔ مجلس ادارت میں سر پرست اعلیٰ بابا مشتاق احمد قریشی صاحب کی خدمت میں نیاز مندانہ سلام عرض کرتا ہوں اور دعاؤں کا درخواست گار ہوں۔ اسٹاف میں شامل جناب طاہر احمد قریشی' جناب اقبال بھٹی' جناب عمر اسرار' جناب حافظ شبیر احمد' برادر عفان احمد اور جناب برادر حسام بٹ کو بھی پر خلوص محبتوں اور مروتوں بھرا اسلام رمضان المبارک کی آمد باسعادت کی مبارک باد اور ساتھ ہی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کی رفاقتوں کا احساس ہمیشہ ترو تازہ اور جاوداں رکھے آمین۔ برادر حسام بٹ کو یہ گناہ گار شاید یاد نہ ہو لیکن مجھے بٹ صاحب اپنی فیملی سمیت خوب یاد ہیں۔ انہوں نے اختر سعیدی کا ایک شعر سنایا تھا۔ وہ کچھ یوں تھا۔

زمیں کی نعمتوں کا مستحق ہے' اگر چھو لے حد افلاک کوئی

اس کی تعظیم کی مگر میں نے چند قدموں کا فاصلہ رکھا

وہ اچھے خوش مزاج اور دوستانہ رکھ رکھاؤ کے مالک شخص ہیں۔ ان کی تحریر ''آتش فشاں'' جسے وہ دفتر میں بیٹھ کر لکھتے تھے مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ عقل و منطق سے دل کے سودائیوں کو لاجواب کرنے والے بذلہ سنج اور خوش فکر آدمی ہیں۔ ان کی ''بازی گر'' پڑھ کر اور ناول کے تانے بانے سمجھتے ہوئے دل آویز انداز میں مسکرا اٹھتا ہوں۔ بٹ صاحب گفتگو میں شریک نہیں ہوتے ورنہ اس بارے میں ضرور استفسار کرتا کہ ناول کا مرکزی خیال پھر فرحانہ نامی لڑکی کی پر فریب محبت کے گرد گھومتا ہے میں اسد اللہ جیسے تعلیم یافتہ' قابل اور خوبرو نوجوان شخص کو کیوں ذلیل و خوار کر رہے ہیں؟ دیکھیے ساتویں قسط ہو چکی ہے مگر فرحانہ کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ مکالمے کی وجہ سے زبانی جمع خرچ کا احساس ہوتا ہے ایک دو واقعات میں ہی قسط پوری ہو جاتی ہے۔ مزید اس فرحانہ کی وجہ سے اب اس کے گھر میں بھی کوئی افتاد آ پڑی ہے۔ شاید اسد کی ماں یا پھر بہن کی موت ہو گئی ہے۔ محض ایک فضول اور لاابالی لڑکی کی وجہ سے آپ ہمارے ہیرو اسد اللہ کی زندگی برباد کر رہے ہیں۔ براہِ کرم اسے جلد سے جلد نمٹا دیں۔ عمران بھائی یہ ''بازی گر'' کے بارے میں کچھ جذبات تھے۔ جن کو ناول کے مصنف کے لیے بصورت پیغام تحریر کیا ہے ممکن ہے حسام بٹ اس کا جواب دیں۔ اب آتے ہیں جولائی کے تازہ شمارے کی جانب۔ اس دفعہ کا دلکش سرورق دیکھ کر مسحور کن کیفیت سے دوچار ہو گیا۔ رنگ و نور سے آنکھوں کو لبھاتا' زندگی کی خوشیوں اور جگمگاتی امنگوں' تمناؤں اور خوب صورت خوابوں سے جذبات میں جوش و ہیجان پیدا کرتا یہ ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ آپ نے ٹائٹل کے انتخاب میں قدرے من چلا اور شرارتی انداز اختیار کیا اور مست' بے کیف اور پھیکی زندگی میں چلبلاہٹ کا احساس ملایا ہے۔ اس کے بعد شربت فولاد اور روح افزا سے مستفید ہوتے ہوئے آنچل کے جولائی کے شمارے کی جھلکیاں پڑھیں۔ اس مرتبہ دستک میں بابا مشتاق قریشی ''ایدھی کے جھولے......!'' کے بارے میں دل گداز جذبوں سے تذکرہ فرما رہے تھے۔ میں سوچتا ہوں بزرگوار کہ جب ہم مسلم معاشرے میں غریب اور نچلے طبقے کی بات کرتے ہیں تو خود کو دین اسلام کی تعلیمات حتیٰ کہ فرائض کی بجا آوری میں بھی شرمسار پاتے ہیں کجا یہ کہ ہم مسلمان اپنے گناہ کا اعتراف کریں اور اپنے ناجائز بچوں کو کھلے بندوں قبول کرتے ہوئے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کریں۔ ناجائز بچوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کرنا یا یتیم خانوں کے جھولوں میں ڈالنے کا گناہ عام طور پر نچلے اور متوسط طبقے کا شاخسانہ ہے۔ یہ کتنے افسوس اور دکھ کا مقام ہے کہ ہمارا یہ متوسط اور نچلا طبقہ اس مسلم معاشرے میں اپنی ہستی کے جنون میں اور شریعت اور طریقت کے معاملات میں تو خود کو باصفا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا داعی اور غلام کہتے نہیں تھکتا ہے لبرل اور سیکولرازم پر مذہبی حد دو لگاتا ہے لیکن اپنے گناہوں کی کمائی اپنے ناجائز بچوں کا اعتراف کرتے ہوئے ذلت اور بدنامی سے ڈرتا ہے۔ کیا ایسے نچلے طبقے کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے سے بہتر یہ نہیں ہے کہ اس طبقے کی معاشرت اور سوچ و فکر کی اصلاح کی جائے۔ جوش و مستی میں حد سے تجاوز کرنے اور حرص و ہوس میں باغیانہ روش اختیار کرنے پر سخت اصول اپنائے جائیں۔ تب ہی ہم ایک اسلامی معاشرہ اقوام عالم کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اقرأ کے روشن صفحات میں طاہر قریشی صاحب کا اس بار موضوع قناعت و استغنا اور حرص و طمع تھا۔ انہوں نے احادیث کی روشنی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی عمدہ تقلید کرتے ہوئے ایمان و یقین کو جلا بخشی اور درس و تدریس دیتے ہوئے سہل اور دل نشین لفظوں میں تشریح بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ شخص بڑا مبارک ہے جس پر اللہ نے فضل فرمایا کہ اسے دل کی قناعت اور طمانیت عطا فرمائی اور دولت مندی کے جنون سے بے نیاز کیا اور عافیت بخشی' خدا کرے ایسی تونگری ہم گناہ گاروں کو بھی میسر آ جائے۔ اسماء الحسنیٰ میں اس مرتبہ محترم حسام بٹ صاحب نے نئے افق کے قارئین کے لیے ''یا حیی'' کا ورد تفویض کیا تھا۔ اس سلسلے کو شروع ہوئے چھ سات ماہ ہو چکے ہیں۔ اس دوران بہت سے افراد نے ان اسماء الحسنیٰ سے استفادہ کیا ہوگا۔ میری تجویز ہے کہ ہر ماہ اس سے فیض یاب ہونے والے ایک شخص کے تاثرات کو اس سلسلے کے تحت شائع کیا جائے تاکہ دلچسپی اور اللہ کی ذات و صفات سے ہمارے خشوع و خضوع میں اضافہ ہو۔ کیا خیال ہے عمران بھائی۔ تازہ اور رنگ برنگی کہانیوں میں بھی اس مرتبہ تنوع اور دلچسپیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ جاذب نظر فہرست کے ساتھ ساتھ کہانیوں کے جدا جدا عنوانات میں بھی پیراستگی کا جواب نہیں ہے۔ مغربی تراجم میں اس بار راحیلہ تاج کی ''امتحان'' کو خلاف توقع پہلے نمبر پر شائع کیا۔ وجہ سمجھ نہیں آئی۔ سینڈرا کی کہانی متاثر کن تھی۔ اس خوددار لڑکی نے درست وقت پر درست فیصلہ کیا اور اپنی مستقل مزاجی اور فہم و فراست سے گیری اور جیسن میرڈیتھ کی شخصیت کے فرق کو پہچان لیا۔ محبت کے معاملے میں لڑکیاں بہت کم سمجھداری کا ثبوت دیتی ہیں۔ دوسری کہانی ''ترجمان'' جسے احمد صغیر صدیقی نے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ مطالعے اور جستجو میں تندی و تیزی کو بڑھاوا دیتی ایک قتل کے عینی گواہ کی پریشانیوں کا ماجرا تھا اور وہ شخص تھا پال سلاسٹر۔ عدالتی کٹہرے

میں پال چلا چلا کر اپنی بے گناہی کا بیان دے رہا تھا لیکن اس پر محض اس لیے کوئی کان نہیں دھر رہا تھا کہ وہ مقامی زبان سے نابلد تھا۔ اگر اس کی خوب صورت فرانسیسی بیوی جیوری کے آگے اس کی ترجمانی نہیں کرتی تو بے چارے عینی شاہد کے گلے میں پھانسی کا پھندا ہوتا۔ صدیقی صاحب نے خوب صورت بیوی کے دہرے فائدے کو اچھے انداز میں اور ذو معنی لفظوں میں قلم بند کیا۔ اب کیا خیال ہے عمران بھائی ''گفتگو'' ہو جائے۔ اس دفعہ صدارتی کرسی پر میری محترم بجیا شہناز بانو پورے ذاتی تفخر سے رونق افروز نظر آ رہی تھیں۔ پیاری بجیا آپ کے پر خلوص اور مروت آمیز جملے پڑھ کر اپنائیت کا احساس ہوا' میں اپنی جگہ مبہوت رہ گیا تھا۔ ایک بڑی بہن کو بھائی کے لیے ایسے ہی جذبات کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ سر تسلیم خم کہ ہر عورت بے وفا نہیں ہوتی۔ لیکن میرا تجربہ ہے کہ مرد اپنی زندگی کو عورت کی خوشی اور آسائش کی خاطر انتھک جدوجہد کرتے ہوئے گزار دیتا ہے۔ اس کے باوجود عورت مطمئن نہیں ہوتی۔ وہ محض بچوں میں منقسم ہونے کی وجہ سے مرد کے لیے مطلق العنان ہی ہوتی ہے۔ کسی سمجھوتے کے بغیر محض خلوص دل سے مرد کے دکھ سکھ میں رفاقت کے حق کو نبھانے والی عورتیں کم ہی ہوتی ہیں۔ ویسے دنیا کے بیش بہا خزانے ایک اچھی' وفا شعار اور نیک سیرت عورت کے آگے ہیچ ہوتے ہیں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ آج عورت کی افواہ سازی نے اس صنف نازک کو فساد کی علامت بنا دیا ہے۔ اس لیے ایسے خوش نصیب مردکم ہوتے ہیں جنہیں نیک عورت میسر آتی ہے۔ بجیا آپ نے دوسری شادی کا مشورہ دے کر مجھے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ آپ نے مستقبل میں بڑھاپے کی تنہائی پر بھی ازدواجی رفاقت کی اہمیت کا احساس دلایا ہے تو بجیا ایک سال پہلے میں نے اپنے بھائی سے دوسری شادی کی بات چلانے کو کہا تھا اور اس نے مناسب رشتہ دیکھنے کی غرض سے دوڑ دھوپ بھی کی تھی لیکن میری بھابی نے اس پر ناراضگی اور جھنجلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے دخل اندازی کی اور بھائی کو روک دیا۔ اس کے بعد تو شادی کا خیال ذہن سے کہیں محو ہو کر رہ گیا۔ کہتے ہیں زندگی کو تین مختلف انداز میں آرام اور خوش گوار طریقے سے گزارا جا سکتا ہے۔ عورت' موسیقی اور مطالعہ میں نے عورت کو چھوڑ کر موسیقی اور مطالعہ کو اپنا دوست اور خلوت کا ساتھی بنا لیا ہے۔ آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا اس لیے آپ کے پر خلوص مشورے کو غور طلب باتوں میں سر فہرست لکھ لیا ہے۔ حالات سازگار دیکھ کر ہی اس پر خود کو آمادہ کرنا بہتر اور مناسب ہوگا۔ ''گردش'' کی اقساط کو ایک بڑے کینوس میں پھیلا کر اسے مشاقی قلم سے سمیٹ بھی رہی ہیں۔ شمروز اور سرمئی کے مدمقابل سطوت الاسلام کو جرائم مافیا کا سب سے بڑا سرغنہ اور اثر و رسوخ کا حامل شخص کری ایٹ کیا ہے۔ اس لیے شمروز اور سرمئی کو اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے جوش کے ساتھ ساتھ ہوش مندی سے کام لینا ہوگا۔ اور یہ کام آپ کا قلم خوب انجام دینا جانتا ہے۔ شہنی ارشاد مبارک ہو محترمہ! پرستان والوں نے تمہیں پریوں کی ملکہ سلیکٹ کر کے اچھا نہیں کیا نازش نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے پریوں کو مراعات اور عہدوں کا لالچ دے کر ان کے ذریعے ووٹنگ میں دھاندلی کروائی۔ ایسا حسد اور بے ایمانی اچھی بات نہیں ہے شہنی! اب ذشے کی حزب اختلاف سے بچنا۔ میں نے ذشے سے کہا تھا کہ وہ پرستان چھوڑ کر ہنزہ کی وادی کافرستان کے الیکشن میں ملکہ بننے کے لیے کاغذات نامزدگی جمع کروا دے لیکن اس نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپوزیشن میں بیٹھ کر شہنی کا ناک میں دم کر دے گی۔ تم نے سوری کہا اچھا لگا۔ بات یہ ہے کہ جب ہم پر خلوص محبت سے ایک دوسرے سے اپنی سوچ اور رائے کا اظہار کرتے ہیں اور اس کا جواب نہ ملے تو افسوس ہوتا ہے۔ کہانیوں کو شائع نہ کرنے کا گلہ شکوہ مجھ سمیت سبھی کر رہے ہیں لیکن تازہ شمارے میں تمہاری کہانی دیکھ کر لگ رہا ہے کہ تم نے عمران بھائی کو رشوت کے طور پر مٹھائی پہنچائی ہے۔ ''محبت زدگان'' کہانی کا عنوان بھی ہائی کلاس رکھا ہے تم نے۔ یہ جدت اور ندرت تحریر میں کہاں سے کشید کر لاتی ہو؟ جواب ضرور دینا۔ مجاہد ناز عباسی اور عصمت اقبال عین یاد رکھنے اور دعاؤں کا بے حد شکریہ۔ بھائی ریاض بٹ' میں نے دکھوں کی پوٹلی کو بالائے طاق رکھ چھوڑا ہے۔ اطمینان قلب کے لیے درود ابراہیمی کا ذکر کرتا ہوں تو طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے آپ بے فکر ہو جائیں بھائی انجم فاروق ساحلی' تم نے سلام تک نہیں لکھا۔ فیملی میں ناول سلسلے وار چل رہا ہے نا شاید مصروف زیادہ ہو اس لیے۔ کوئی بات نہیں عزیزم سدا پھلتے پھولتے رہو۔ نازش عرف ذشے صدارتی کرسی کی ترنگ میں وفور جذبات سے تمہارا قہقہہ بار جملہ کانوں میں چہک رہا تھا۔ میری کہانیاں عمران بھائی التوا میں رکھے ہوئے ہیں۔ یقین کرو ذشے کہانی لکھ لکھ کر تھکن سے چور ہو جاتا ہوں مگر عمران بھائی یہی ہدایت کرتے ہیں اور لکھو' بس لکھتے جاؤ کہانی دیر سویر سے شائع ہو ہی جاتی ہے۔ اگر حیدر آباد کے لمبے روڈ پر تمہارا اطلاع دینے پر ملاقات ہوتی تو میں اپنے مسودات کا پلندہ تمہیں ضرور دکھاتا۔ دعاؤں کی سوغات کا تہہ دل سے شکریہ۔ عبدالمالک کیف میرے بھرپور تبصروں کو پسند کرنے کا شکریہ۔ خدا کرے میرے خطوط سے شیوۂ آبروئے اہل نظر سرخرو ہو جائے۔ تم نے میرے لیے اچھا اور نیک ساتھی ملنے کی دعا کی ہے۔ میں اپنی بڑی بہن بجیا شہناز بانو سے کہوں گا کہ کیف کی اس دعا پر وہ ضرور آمین کہیں کیونکہ نیک

جیون ساتھی مقدر سے ملتا ہے۔ ''انوکھا انتقام'' کے بعد تمہاری دوسری کہانیوں کا انتظار رہے گا۔ فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب آپ کا شکایتی تبصرہ ان تمام دوستوں اور ساتھیوں کے دل کی آواز تھی جن کی کہانیاں ایڈیٹر صاحب نے کسی نہ کسی وجہ سے روک رکھی ہیں۔ اس مرتبہ آپ نے کلیاتی لحاظ سے رسالے کی کہانیوں پر تبصرہ نہیں کیا۔ بہت افسوس ہوا۔ اس دفعہ بزم سخن گفتگو میں عالیہ انعام الٰہی کی کمی کا احساس ہوا۔ وہ ریگولر ہو گئی تھیں لیکن پھر غچہ دے گئیں۔ منچن آباد سے بھی کوئی نہیں تھا کیا سرور شاذ ڈر گئے ہو میرے چیلنج کرنے سے۔ ریاض حسین قمر' ناظم بخاری' لاہور کی دونوں بہنیں ریحانہ اور طاہرہ آپ بھی نہیں ہیں محفل میں۔ آپ سب کو سلام اور نیک خواہشات۔ کہانیوں میں نمبر ایک پر آشیانہ (خلیل جبار) محبت زدگان دوسرے نمبر پر شہنی ارشاد اور پانی کا محل (محمد سلیم اختر) تیسرے نمبر پر ہے۔ عمران بھائی نفسا نفسی کے اس ماحول میں آپ کے جواب سے اطمینان ملا۔ آپ جواب نہ دیتے تو میں کیا کر سکتا تھا۔

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد۔ بڑی آرزو تھی ملاقات کی۔ پھولوں کی طرح مسکراتے رہو۔ جناب مشتاق احمد قریشی' السلام علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں۔ شدید گرمی کی حالت میں شہر گیا ضروری کام کے سلسلے میں وہاں بکسٹال پر ماہ جولائی کا تازہ پرچا دیکھ کے میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ ایسا خوب صورت پرچہ نکالنے پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کریں۔ ذرا آپ سرورق پر توجہ دیں تو بہتر ہوگا۔ تمام حسن سرورق میں ہوتا ہے۔ ویسے یہ ایک معیاری رسالہ ہے۔ نئے افق کے تمام مضامین اپنی اپنی جگہ پر بہتر ہیں۔ آپ جس محبت سے ہمیں یاد فرماتے ہیں یہی جذبہ ہمیں آپ کو خط تحریر کرنے پر مائل کرتا ہے۔ آپ ہم سے ہزاروں میل دور ہیں تو کیا ہوا میرے دل کی دھڑکنوں میں چھپے رہتے ہیں۔ پرچے میں کچھ تبدیلیاں کریں تو بہتر ہے اس مہنگائی کے دور میں ایسا دل کش پرچہ نکالنا آپ کا ہی کام ہے۔ اقرأ' دستک' ناقابل فراموش واقعات' تراجم کہانیاں اور قسط وار تحریریں اپنی اپنی جگہ پر خوب صورتی سے نمایاں ہیں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے۔ تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ آپ کی زندگی میں سدا رنگ برنگے پھول کھلتے رہیں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں۔ زندگی نے وفا کی پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد قریشی صاحب سلام مسنون۔ ماہ اگست کا نئے افق خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ دستک میں محترم و مکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے ایک بہت بڑے گمبھیر مسئلے کی نشاندہی فرمائی ہے۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب جس طرح ہمارے قومی مسائل اجاگر فرماتے ہیں یہ انہیں کا حصہ ہے لیکن اصل مسئلہ تو بات کی شنوائی ہے۔ جس کا ہمارے ہاں بہت بڑا فقدان ہے۔ یہاں پر کوئی اپنی انا کا مارا ہوا ہے کوئی کسی کی سنتا ہی نہیں ہر کوئی اپنی جگہ پر ارسطو اور سقراط ہے۔ خدا ہمیں عقل و شعور عطا فرمائے آمین۔ عمران صاحب دی گریٹ گفتگو کے آغاز میں آپ نے صف بندی کے بارے میں حدیث پاک کا حوالہ دیا ہے۔ ہم نے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو پس پشت ڈال دیا اور افراتفری کا شکار ہو گئے۔ میں جس مسجد میں نماز ادا کرتا ہوں وہاں ہر نمازی اپنی مرضی سے صف میں کھڑا ہوتا ہے۔ ان کی بنائی صفوں کو اگر درست کیا جائے تو ہر صف میں کم از کم سات افراد اور سما سکتے ہیں۔ امام صاحب بھی کہہ کہہ کر تھک گئے ہیں مگر نمازیوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی گفتگو میں محترمہ شہناز بانو صاحبہ کرسئ صدارت پر متمکن ہیں ان کی میٹھی میٹھی اور پیاری باتیں لیے ان کا نام کرسئ صدارت کا حق دار بناتا ہے۔ باقی گفتگو کے شرکاء کے تبصرے خوب صورت اور پر کشش ہیں۔ عمران بھائی اس بار محترم سید عبداللہ شاہد اور محترم فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب آپ کے رویے سے بہت نالاں نظر آئے۔ لکھاری واقعی بہت محنت کرتا ہے اور اگر ان کی تحریروں کی رسید بھی نہ ملے تو دکھ تو ہوتا ہے۔ آپ ان کی تحریروں کے بارے میں اگر انہیں مطلع فرما دیا کریں تو ان کی تسلی ہو جایا کرے۔ اسماء الحسنٰی ایک ایسا سلسلہ ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ محترم حسام بٹ صاحب سے اتنا پوچھنا ہے کہ اس میں بتائے وظائف کی ہر کسی کو اجازت ہے؟ اقرأ میں جناب طاہر قریشی صاحب نے قناعت و استغنا اور حرص و طمع کا جس طرح احادیث مبارک کی روشنی میں تذکرہ فرمایا ہے۔ وہ قابل ستائش ہے۔ اس بار انتخاب نظم و نثر خوب ہے۔ خدا ہمارے اس محبوب جریدے کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین

عبدالمالک کیف...... صادق آباد۔ ہمارے ملک میں جو صورت حال دن بدن بھوک' بدحالی' غربت خطرناک حد تک تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے۔ اب بھی اگر عام آدمی نے آنکھیں نہ کھولیں تو شاید ہماری آنے والی نسلیں بھی اس کا خمیازہ بھگتیں گی۔ عجیب بات ہے عوام کی چپ کو سیاستدانوں نے جانے کیا سمجھ رکھا ہے۔ جب بھی جو بھی ان کے ناکارہ ذہن میں کھچڑی پکتی ہے فوراً ہی

اس پر عمل بھی شروع کر دیتے ہیں۔ نہ یہ سوچتے ہیں کہ صحیح ہے یا غلط ان کے فیصلے سے عوام کو فائدہ پہنچے گا یا ان کے آزار کا سبب، مگر انہیں تو خریدے ہوئے ایم این اے ایم پی ایز کے ووٹوں کو دیکھنا ہوتا ہے جو منٹوں میں بل پاس کروا دیتے ہیں۔ چار ساڑھے چار سال تک بجلی و پانی کا وزیر راجا پرویز اشرف کے نام سے ہم پر تھوپ دیا گیا اور اس دوران بجلی کا ستیاناس کر دیا گیا اور آج ہم بجلی کو ترس گئے ہیں اور وہی موصوف ہمارے او پر وزیر اعظم بنا کے مسلط کر دیے گئے ہیں۔ شاید ہمارے اعمال کی سزا ہے جو ہمیں مل رہی ہے۔ خدا ہمارے وطن عزیز پر اور عوام پر رحم فرمائے آمین۔ اب آتا ہوں نئے افق جولائی 2012ء کے تبصرے کی جانب۔ بہت ہی جاذب نظر اور حسین منظر کے ساتھ خوب نچ رہا تھا۔ پہلا ورق کھولا تو شربت فولاد کا ذائقہ چھکنا پڑا۔ اس کے بعد آنچل کا ایڈ نظر سے گزرا اور پھر ارے واہ بھئی گرمیوں کے اس جھلساتے موسم میں روح افزا کی پوری بوتل مل گئی۔ جس سے بدن کو سیراب کیا۔ ہمدرد والوں کی ہمدردی کا شکریہ۔ کچھ آگے بڑھتے ہیں۔ مدیر اعلیٰ مشتاق احمد قریشی، مدیر عمران احمد قریشی، مدیر معاون اقبال بھٹی سے ملاقات ہوگئی۔ ان سے حال احوال لیے تو انہیں مخلص پایا۔ ان سے اجازت لی سامنے ہی ابتدائیہ کے کمرے کی طرف بڑھے۔ جس میں چار بہنیں دستک، گفتگو، اسماء الحسنیٰ، اقرأ سے ملاقات ہوئی۔ جنہوں نے بہت ہی محبت سے ہمارے خالی ذہن کو علم کے جوہر عطا کیے اور آگے چل دیے۔ اب ہمارا رخ ''سچی کہانیوں'' کی بستی کی جانب تھا۔ جس میں پہلا گھر ''پانی کا محل'' جناب محمد سلیم اختر کا تھا۔ پھر ''آشیانہ'' خلیل جبار۔ ''ادھورا انسان'' فاخرہ سلطانہ ''مراد'' مہتاب خان اور ''محبت زدگان'' شہنی ارشاد۔ تھوڑا تھوڑا کر کے سب کو ٹائم دیا۔ پانی کا محل، مداوا، محبت زدگان کے ساتھ اچھا وقت گزرا۔ ان سے الوداع ہو کے نکلے ہی تھے کہ سامنے مغربی ادب سے انتخاب لکھا نظر آیا۔ تجسس سے مجبور ہو کے اندر چلے آئے۔ راحیلہ تاج نے اچھا خاصا امتحان لے ڈالا اور احمد صغیر صدیقی صاحب ''ترجمان'' بنے بیٹھے تھے۔ دونوں سے ملاقات خوب رہی اگلی نشست ناول کی تھی۔ سیوک، خورشید پیرزادہ نے سنایا اور ''خالی دامن'' محمد اعظم خان نے پھر اک شام مستقل سلسلے کے نام سے سنائی گئی۔ جس میں حسام بٹ تو بڑا بازی گر نکلا۔ ہمیں تو خبر ہی نہ تھی بھئی اور شہناز بانو کسی ڈاکٹر شاہ زمان کو (جس کے ستارے گردش میں تھے) اسے گردش سے نکالنے کے چکر میں تھیں۔ خیر اس سفر میں ہم حافظ شبیر احمد کی جانب جا نکلے اور ان سے ''روحانی مسائل'' پر بات۔ چیت ہوتی رہی۔ وہاں عمر اسرار سے تعارف ہوا تو وہ ہمیں خوشبو سخن میں لے آئے جہاں محفل میں بڑی رونق تھی۔ بہت سے شاعر خواتین و حضرات کو قریب سے دیکھا سنا۔ سارے بہت ہی مہربان تھے اور یوں تھکن سے برا حال تھا مگر اختتامیہ تقریب عفان احمد نے ہمارے لیے ارینج کی تھی۔ ''ذوق آگہی'' کے نام سے اس میں بھی شامل ہونا پڑا اور یوں ہمارا سفر نامہ ''نئے افق'' اپنے اختتام کو پہنچا۔ ہم نے واپسی کی ٹکٹ لی اور اپنے گھر آ کر ہی لمبی نیند کے مزے لوٹے۔ نئے افق سے تعلق رکھنے والے سب دوست شامل گفتگو تھے گم شدہ رائٹر حضرات (اگر انہیں کوئی مسئلہ ہے تو اللہ پاک ان کا حامی و ناصر ہو) ان کی مشکلات دور فرمائے اور وہ پھر سے ہماری محفل میں قدم رکھیں۔ سب خواتین چھوٹی بڑی جیسے ادی شہناز، شہنی ارشاد، ناز سلوش، این شاہین، ریحانہ سعیدہ، عصمت اقبال عین، نائمہ رحمان، فاخرہ سلطانہ، راحیلہ تاج، قمر جہاں وغیرہ وغیرہ (جو رہ گئیں وہ دل چھوٹا نہ کریں یاد آنے پر اگلے تبصرے میں) اور بھائی ناظم بخاری، سید عبداللہ شاہد، اللہ دتہ عابد، سہیل عمران، آکاش بخاری، میثم علی آغا، احمد علی کیف، محمد اسحاق انجم، ڈاکٹر واجد نگینوی، ریاض حسین قمر، وسیم اختر، محمد اسلم جاوید، زین شانی، شہروز، غلام عباس جتوئی، محمد فاروق انجم، انجم فاروق ساحلی، فقیر محمد بخش لنگاہ، ریاض بٹ، حسام بٹ، مہتاب خان، محمد ارشاد قریشی، حکیم ساجد، فہد جتوئی اور جو ذہن میں نہیں آ رہے مگر نئے افق کا حصہ تھے یا ہیں سب کو دل کی گہرائیوں سے سلام اور دعا ہے کہ ماہ رمضان کی برکتیں ہمیشہ آپ سب پر برسیں اور آنے والی عید الفطر آپ سب کے دامن میں خوشیوں کی ڈھیر ساری سوغاتیں لے آئے آمین۔ اس بندہ ناچیز کو دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ والسلام

محمد فہد...... مظفر گڑھ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خدائے بزرگ و برتر کی ہزار ہا رحمتیں ہوں آپ اور آپ کے اہل خانہ پر آمین۔ اللہ جل جلالہ کی بے شمار رحمتیں ہوں تمام اہل اسلام پر اور وہ ذات اقدس ہماری پاک سرزمین ہماری دھرتی کو سدا شاد و آباد اور امن کا گہوارہ بنائے رکھے۔ دعا ہے رب العزت مسلم دنیا کو دشمنان اسلام کے ناپاک عزائم سے محفوظ رکھے اور ہمیں ایسے عناصر کے خلاف سینہ سپر ہونے کا حوصلہ اور ان کے عزائم خاک میں ملانے کی ہمت و طاقت دے اور خدا کرے کہ مسلم ریاستوں کے مابین عالمی اتحاد پیدا ہو جائے۔ وہ بھائی چارہ پیدا ہو جائے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے 14 سو سال پہلے انصار اور مہاجرین کے درمیان پیدا کیا۔ کاش کہ اسلامی دنیا اسی بھائی چارے کو بنیاد بنا کر بھارت، امریکا اور اسرائیل جیسے بدمعاش اور اسلام دشمن عناصر کے خلاف متحد ہو کر ان کو سبق سکھائے آمین۔ عمران بھائی ہم آپ سے ناراض ہیں کیونکہ آپ نے پچھلے دونوں شماروں میں نہ تو میرے لیٹر

کو جگہ دی اور نہ ہی میرے کلام کو کیوں کیوں آخر کیوں کیا ہمارے لیٹر کا مواد پبلشنگ کے قابل نہیں تھا یا......؟ محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب سلام محمد قبول فرمایئے۔ کیسے مزاج ہیں جناب کے؟ دعا ہے کہ اللہ رب العزت آپ کو کامل صحت اور درازیٔ عمر عطا کریں تاکہ آپ کا شفقت بھرا سایہ سدا ہمارے سروں پر قائم رہے آمین۔ آپ نے ایدھی ہوم کے جھولے کے ٹائٹل کے تحت صنف نازک پر ہونے والے مظالم اور دور جدید ہونے کے باوجود زمانے کی جاہلیت کو خوب صورت انداز میں پیش کیا کہ کس طرح آج کے جدید تعلیمی دور میں بھی بیٹی کو رحمت کے بجائے زحمت قرار دیا جاتا ہے۔ بیٹی کی پیدائش پر اس کی ماں پر طرح طرح کے مظالم اور طعنے کسے جاتے ہیں کیوں آخر کیوں ہے ایسا؟ لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہر لڑکے کو جنم دینے والی بھی لڑکی ہی ہوتی ہے۔ وہ لڑکی بھی کسی کی بیٹی، کسی کی بہن، کسی کی بیوی، کسی کی بہو ہوتی ہے۔ ہم سب کو سوچنا چاہیے اور زمانے کی اس منفی سوچ کو تبدیل کرنا چاہیے آیئے ابتدا اپنے ہی گھروں سے کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا زور قلم اور کرے۔ عمران بھائی میں آپ کی باتوں سے 110 فیصد متفق ہوں کیونکہ اس عام آدمی کو واقعی کبھی بھی کسی نے بھی پبلک سیکٹر میں نہیں دیکھا شاید وہ آدمی ایوان صدر میں ہی بستا ہے بلکہ شاید نہیں یقیناً۔ راجا محمد وسیم (چکوال) محمد عابد (بھکر) شازیہ ارم (لاہور) عائشہ (لاہور) ماہی انجم (ڈی جی خان) طارق، راحیل، حنا خان (ہزارہ) اور جناب سلمان آصف (سعودیہ) آپ دوستوں کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے کالز اور میسجز کیے۔ میرے تبصرے اور کلام پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا خاص کر بزرگوار جناب مختیار احمد صاحب آف گوجرانوالہ۔ محترمہ شہناز بانو صاحبہ! کرسیٔ صدارت کے حصول پر خاکسار آپ کو تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہے۔ جہاں تک بات ہے آپ کے دل کے قریب ہونے کی صرف عصمت ہی کیوں؟ ہم سب بھی تو ہیں نا...... ہیں نا......؟ میں آپ کی باتوں سے متفق ہوں کہ یہاں صرف جواب طلب باتوں کا جواب ہی دیا جاتا ہے اور اسی انسان کو مقام دیا جاتا ہے تو مقام بنانا جانتا ہو جو تھوڑا سا بھی لوز ہوا یا جس نے خاموشی اختیار کی وہ تو گیا کام سے بھی اور نام سے بھی؟ ڈیئر سسٹر این شاہین، سلام محبت آپ دل چھوٹا مت کیا کرو اور اپنے اندر زمانے سے لڑنے کا حوصلہ پیدا کرو اور میری یہ بات یاد رکھنا کہ جو انسان ذرا سی بھی خاموشی اختیار کرے یا شرافت کا مظاہرہ کرے زمانہ اسے کچل کر چلا جاتا ہے اور فی زمانہ یہ اصول سخت سے سخت تر ہوتے جاتے ہیں۔ ان میں کہیں کمی نہیں آتی کلام کی پبلشنگ پر مبارک باد بہت اچھی نظم لکھی ہے مجھے بہت پسند آئی۔ ڈیئر ناز سلوش ذشے سلام محبت کیسے مزاج ہیں؟ ویسے کافی عرصے بعد پلیٹ فارم پر واپسی پر ویلکم اور سناؤ تمہارا اسکول وغیرہ والا پروجیکٹ کہاں تک پہنچا۔ ویسے اس کشمیری سیب کو ہم نہیں بھولے تھے لہٰذا آپ کا شکوہ بے جا ہے۔ بلکہ یہ کشمیری سیب ہمیں بھولا ہے۔ خیر ہمیں آپ کی یہ بے رخی کا انداز پسند آیا (اللہ آپ کو آپ کے نیک مقاصد میں کامیابی عطا کرے آمین۔) ویسے اگر ممکن ہو تو مجھے اپنے این جی او کے بارے میں تفصیل دینا اور ان کے پراجیکٹ وغیرہ کے بارے میں بھی اور ہاں اگر ممکن ہو سکے تو مجھے جوائننگ کا طریقہ کار ضرور بتانا میں بھی این جی او میں جاب کرنے کا خواہش مند ہوں۔ ڈیئر فاخرہ سلطانہ، سلام محبت کیسے مزاج ہیں آگاہ کیجیے گا۔ میں نے آپ کی کہانیاں ''بیٹی'' اور ''کردار'' پڑھیں۔ خوب انداز میں قلم کا استعمال کیا۔ خاکسار کی جانب سے مبارک باد قبول کیجیے بلکہ ڈبل مبارک باد آپ کی اور ایک اسٹوری بھی پبلش ہوئی ہے۔ ''ادھورا انسان'' اللہ آپ کا زور قلم مزید بڑھائے آمین۔ محترمہ شہنی ارشاد، محترمہ قمر جہاں، برادرم عبدالحکیم ساجد، جناب امیر حمزہ چاند، جناب بشیر احمد بھٹی، محترم ریاض بٹ، محترم ابن مقبول، جاوید صدیقی، انکل فقیر محمد بخش صابر لنگاہ مکمل لنگاہ فیملی، محترم مجاہد ناز عباسی، جناب ارشاد قریشی، راؤ چاند، محمد وقاص احمد وکی، مستری صابر حسین، برادر سید عبداللہ شاہد، محترم ریاض حسین قمر، محترمہ عالیہ انعام الٰہی، محترمہ ریحانہ سعیدہ، ڈیئر آکاش بخاری، جناب انجم فاروق ساحلی، ڈیئر احمد کیف، ڈیئر اسد علی، محترم عبدالمالک اور وہ تمام دوست جن کے نام میں نہیں لکھ سکا۔ سب کو خاکسار کی جانب سے ڈھیروں دعائیں اور محبتوں بھرا اسلام قبول ہو۔ خوشبو سخن میں تمام ساتھیوں نے انوکھے انداز سے خوش بو مہکائی خاص کر عصمت اقبال عین، این شاہین، ناز سلوش ذشے اور جناب اسلم جاوید صاحب ٹاپ پر رہے۔ ذوق آگہی میں کافی کچھ سیکھنے کو ملا ناز ڈیئر کشمیر نام کی وجہ بتانے کے لیے شکریہ۔ آخر میں ڈھیروں دعاؤں کے تحفہ کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

⌘

اسماءُ الحسنیٰ

حسام بٹ

یوں تو اللہ تبارک تعالیٰ کے اَن گنت صفاتی نام ہیں جن میں سے بیش تر کا علم صرف اسی عَـلِیْمُ الْـخَبِیْـرُ کو ہے۔ میں کوئی عالم فاضل یا مفتی نہیں ہوں لہٰذا کسی علمی بحث کو چھیڑنا یا تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینا میری علمی ہمت اور بساط سے باہر ہے اور یہاں پر یہ میرا مقصود اور موضوع بھی نہیں۔ میں دین کی واجبی سی سُوجھ بُوجھ رکھنے والا ایک عام سا دنیا دار انسان ہوں۔ البتہ اس بات پر مجھے فخر ہے کہ اس ذاتِ باری نے مجھے جتنا بھی علم و ہنر عطا کیا ہے اس کا درست استعمال جانتا ہوں اس کے باوجود بھی اگر اس کارِ خیر کے دوران مجھ سے کہیں کوئی بھول چوک یا بے ادبی ہوجائے تو وہ رؤف الرحیم میری چھوٹی بڑی ہر خطا کو معاف فرمائے جس کے اسماء الحسنٰی پر قلم اٹھانے کی میں نے جراُت کی ہے۔

قارئین کی آسانی اور سہولت کے پیشِ نظر میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک مستند روایت کو بنیاد بنا کر ماہ نامہ ”نئے افق“ کے لیے اس تعمیری و اصلاحی اور دنیا و آخرت کے معاملات کے لیے یکساں مفید سلسلے کا آغاز کرتا ہوں۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللـه تسعـه و تسعین اسماما ئتة الا واحدا من احصاھا دخل الجنة.

ترجمہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں۔ جس نے ان ناموں کو محفوظ کیا اور ان کی نگہداشت کی وہ جنت میں جائے گا۔

میں بھی ”نئے افق“ کے ان صفحات پر قادر مطلق کے انہی ننانوے یعنی ایک کم سو اسماء الحسنٰی کا تذکرہ کروں گا۔

اپنی جائز اور نیک حاجات کے لیے اللہ تعالیٰ کو اس کے صفاتی ناموں سے پکارنا اور اس ذات پاک کی رحمتوں، برکتوں اور نعمتوں سے فیض یاب ہونا عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور ہر عبادت کے بعد دعا کرنا ایک لازمی عمل ہے۔ حدیث کے مطابق ”دعا“ ہر نوعیت کی عبادت کا مغز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کی تفصیل اور تشریح سے قبل میں دعا کے معاملے پر روشنی ڈالنا نہایت ہی اہم اور ضروری خیال کرتا ہوں۔ ان لطیف روحانی تقاضوں کو پورا کیے بغیر دعا کی قبولیت کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی پودے کو پانی کی جگہ تیزاب پلائیں اور اس سے پھر بھی خوش ذائقہ پھل یا خوش نما پھول کی توقع رکھیں۔ اگر درج ذیل راہ نما اصولوں کی حرمت کا پاس کرتے ہوئے دعا کی جائے تو اسے روح الامین کے پَر لگ جاتے ہیں۔

ہر دعا کے ساتھ اول آخر حسبِ توفیق درود شریف پڑھنا نہایت ہی کارآمد اور ضروری ہے۔ اس عمل سے آپ کی دعا کے ساتھ اللہ کے محبوب کی تائید بھی شامل ہوجاتی ہے۔

کسی بھی دعا سے پہلے نیکی اور بھلائی کا کوئی کام کرنا چاہیے۔ اگر کسی بڑی نیکی کا موقع میسر نہ ہو تو انسانوں کی گزرگاہ سے کوئی پتھر یا کانٹا ہی ہٹا دیں یا مسکرا کر کسی کو سلام ہی کرڈالیں۔

ناممکن اور ناجائز کاموں کے لیے دعا کرنا جائز نہیں۔

وہ ذاتِ کریم مثبت صفات کا مالک ہے۔ اس سے ہمیشہ بھلائی، خیر اور تعمیری مقاصد کے لیے رجوع کرنا چاہیے۔

اگر حصول مقصد میں دیر ہو رہی ہو تو بددل یا مایوس ہرگز نہ ہوں بلکہ پوری دل جمعی سے دعا کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اس مالک الملک کی رحمت سے مایوس ہونا گناہِ عظیم ہے۔

اگر کسی دعا گو شخص کی نیت صاف، دل شفاف، کھانا پینا اور لباس رزقِ حلال کا رہینِ منت ہو تو رحمتِ خداوندی اس کی دعا مکمل ہونے سے پہلے ہی جوش میں آجاتی ہے۔

وَاحِد

معانی: اکیلا، یکتا، یگانہ، تنہا، لاثانی

تاثیر: مشترک

جمالی/جلالی	و	ا	ح	د
اعداد: **19**	**6**	**1**	**8**	**4**

مفرد عدد: **1**

وِرد: یَاوَاحِدُ

فیوض و برکات اور وظائف:۔

☆ اگر کوئی شخص چالیس دن تک روزانہ کسی مخصوص وقت پر، خصوصاً رات کے آخری حصے میں ”تین ہزار تین“ مرتبہ یہ اسم مبارک ”یـا واحـد“ پڑھے تو......

ا:۔ اسے معرفت الٰہی حاصل ہوجائے گی۔

۲:۔ دنیا کی مصنوعی چمک دمک اسے متاثر نہیں کرسکے گی۔

۳:۔ اس کی آنکھیں حقیقت دیکھنے کے قابل ہوجائیں گی۔

☆ اگر کوئی شخص ذکر خفی کے انداز میں ”یـا واحد“ کو اپنی عادت بنالے تو......

ا:۔ اس کے دل و دماغ میں یک سوئی پیدا ہوجائے گی۔

۲:۔ اللہ کے سوا اور کسی طرف اس کا دھیان نہیں جائے گا۔

۳:۔ وہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا مہربان دوست نہیں سمجھے گا۔

☆ اگر کوئی شخص کسی بھی قسم کے ڈر یا خوف میں مبتلا ہو تو وہ کسی بھی پرسکون مقام پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائے اور مسلسل ”یـا واحد“ کا ذکر شروع کردے تو برسوں یا مہینوں نہیں، ہفتوں یا دنوں میں بھی نہیں، گھنٹوں بھی نہیں بلکہ چند منٹ میں اس کا دل و دماغ ہر غم، فکر، پریشانی اور خوف و ہراس سے نکل آئے گا۔

☆ اگر کوئی شخص بے اولاد ہے، چاہے اپنی طبّی و طبعی خرابی کے باعث یا قدرت کی کسی مصلحتی تاخیر کی وجہ سے تو وہ بکثرت (میاں+بیوی) ”یـا واحد“ کا ورد کرے تو ان شاء اللہ ایک سال کے اندر وہ صاحبِ اولاد ہوجائے گا۔

☆ اگر کسی شخص کو اولادِ نرینہ کی تمنا ہو تو وہ عموماً کسی بھی اسلامی مہینے کے پہلے جمعہ اور خصوصاً رمضان المبارک کے پہلے جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد کسی پاک صاف مقام پر بیٹھ کر، ایک سادہ کاغذ پر سیاہ روشنائی سے ”ننانوے“ مرتبہ ”یاواحد“ لکھے اور پھر اس کاغذ کو تہ کر کے ایک تعویذ کی شکل دے کر اپنے بائیں بازو پر باندھ لے ان شاء اللہ فرزند صالح پیدا ہوگا۔ یہ عمل مجرب ہے۔

میرا پروردگار ربّ المسلمین ہی نہیں بلکہ وہ ربّ العالمین ہے لہٰذا غیر مسلم، حتیٰ کہ اس کے وجود سے انکاری افراد بھی اس اسم مبارک کی تاثیر اور برکات سے کماحقہ استفادہ کرسکتے ہیں۔

غیر مسلم افراد اپنے جائز اور نیک کاموں کے لیے اس اسم الٰہی کو بتائے ہوئے طریقے اور تعداد میں پڑھ کر یا اس کے مطابق، عمل کر کے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔

خدا کے وجود کا یقین نہ رکھنے والے افراد جب اور جتنی توفیق ہو اس اسم مبارک کو ورد زبان رکھ کر اپنی زندگی میں خوشی، خوش حالی اور آسانی لاسکتے ہیں۔ میرا ربّ بے شک ان کا بھی خالق، مالک اور رزّاق ہے۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

(۲۳۴)

(ترجمہ) حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مال طلب کیا' آپ نے مجھے عطا فرمادیا' میں نے پھر مانگا' آپ نے پھر عطا فرمادیا' پھر آپ نے مجھے نصیحت فرمائی اور ارشاد فرمایا' کہ:۔ اے حکیم! یہ منال سب کو بھلی لگنے والی اور لذیذ و شیریں چیز ہے۔ پس جو شخص اس کو بغیر حرص و طمع کے سیر چشمی اور نفس کی فیاضی کے ساتھ لے اس کے واسطے اس میں برکت دی جائے گی اور جو شخص دل کے لالچ کے ساتھ لے گا اس کے واسطے اس میں برکت نہیں ہوگی اور اس کا حال جوع البقر کے اس مریض کا سا ہوگا جو کھائے اور پیٹ نہ بھرے...... اور اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے (یعنی دینے والے کا مقام اونچا ہے اور ہاتھ پھیلا کر لینا ایک گھٹیا بات ہے لہٰذا جہاں تک ہو سکے اس سے بچنا چاہئے۔)

حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ (حضور کی یہ نصیحت سن کر) میں نے عرض کیا:۔ یارسول اللہ قسم ہے اس پاک ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے اب آپ کے بعد مرتے دم تک میں کسی سے کچھ نہ لوں گا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث کی صحیح بخاری ہی کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حکیم بن حزام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جو عہد کیا تھا اس کو پھر ایسا نباہا کہ حضور کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے اپنے اپنے دور خلافت میں (جب کہ سب ہی کو وظیفے اور عطیے دیئے جاتے تھے) ان کو بھی بلا کر بار بار کچھ وظیفہ یا عطیہ دینا چاہا لیکن یہ لینے پر آمادہ ہی نہیں ہوئے۔ اور فتح الباری میں حافظ بن حجر نے مسند اسحاق بن راہویہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ شیخین کے بعد حضرت عثمان اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت و امارت میں بھی انہوں نے کبھی کوئی وظیفہ یا عطیہ قبول نہیں کیا' یہاں تک کہ حضرت معاویہ کے دور امارت میں ایک سو بیس سال کی عمر میں ۵۴ھ میں وفات پائی۔

(۲۳۵)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا اور اس میں ارشاد فرمایا کہ حرص و طمع سے بچو کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں' اسی نے ان کو بخل کرنے کو کہا تھا انہوں نے بخل اختیار کیا اسی نے ان کو قطع رحمی یعنی حقوق قرابت کی پامالی کے لیے کہا تو انہوں نے قطع رحمی اختیار کی' اس نے ان کو بدکاری کے لیے کہا تو انہوں نے بدکاریاں کیں۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) یعنی حرص و طمع صرف ایک بری خصلت ہی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے انسانی معاشرہ میں دوسری بھی نہایت تباہ کن خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو بالآخر قوموں کو لے ڈوبتی ہیں' اس لیے مسلمانوں کو چاہئے کہ اس خطرناک اور تباہ کن جذبہ سے اپنے دلوں اور سینوں کی پوری پوری حفاظت کریں۔

(۲۳۶)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ ارشاد فرماتے تھے کہ:۔ انسان میں سب سے بری بات کڑھا دینے والی حرص اور گھبرا دینے والی بزدلی ہے۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) یہ حقیقت ہے کہ حریص اور لالچی آدمی ہر وقت اس غم میں گھلتا اور کڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہیں ملا' وہ نہیں ملا' فلاں کے پاس یہ ہے اور میرے پاس یہ نہیں ہے' اسی طرح زیادہ بزدل آدمی خواہ مخواہ موہوم خطرات سے بھی ہر وقت گھبراتا رہتا ہے اور اس کو اطمینان کے سانس لینے نصیب نہیں ہوتے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے دل کی ان دونوں کیفیتوں کو بدترین کیفیت بتلایا اور فی الحقیقت یہ بدترین اور ذلیل ترین خصلتیں ہیں۔

صبر و شکر:۔

اس دنیا میں دکھ اور رنج بھی ہے اور آرام اور خوشی بھی' شادی بھی ہے اور غمی بھی' شیرینی بھی ہے اور تلخی بھی' سردی بھی ہے اور گرمی بھی' خوشگواری بھی ہے اور ناخوش گواری بھی اور سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے اور اسی کے حکم اور فیصلہ سے ہوتا ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے بندوں کا حال یہ ہونا چاہئے کہ جب کوئی دکھ اور مصیبت پیش آجائے تو وہ مایوسی اور سراسیمگی کا شکار نہ ہوں بلکہ ایمانی صبر و ثبات کے ساتھ اس کا استقبال کریں اور دل میں اس یقین کو تازہ کریں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے' جو ہمارا حکیم اور کریم ربّ ہے اور وہی ہم کو اس دکھ اور مصیبت سے نجات دینے والا ہے۔ اسی طرح جب ان کے حالات سازگار ہوں اور ان کی چاہتیں ان کو مل رہی ہوں اور خوشی اور شادمانی کے سامان میسر ہوں تو بھی وہ اس کو اپنا کمال اور اپنی قوت بازو کا نتیجہ نہ سمجھیں بلکہ اس وقت اپنے دل میں اس یقین کو تازہ کریں کہ یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی بخشش ہے اور وہ جب چاہے اپنی بخشی ہوئی ہر نعمت چھین بھی سکتا ہے اس لیے ہر نعمت پر اس کا شکر ادا کریں۔

یہ اسلام کی خاص تعلیمات میں سے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طرح طرح سے اس کی ترغیب اور تعلیم دی ہے۔ اس تعلیم پر عمل کرنے کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ بندہ ہر حال میں خدا سے وابستہ رہتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی مصیبتوں اور ناکامیوں سے شکست نہیں کھاتا اور رنج و غم کے تسلسل سے بھی اس کی جان نہیں گھلتی اور مایوسی اور دل شکستگی اس کی عملی قوتوں کو ختم نہیں کر سکتی۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

حصار

عبداللہ شاہد

ہم سفر اگر ہم خیال اچھی سوجھ بوجھ کا مالک ہو تو کٹھن سے کٹھن سفر بھی خوش گوار اور یادگار بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر زندگی کا ساتھی آپ کے مزاج کو سمجھنے والا ہو تو راہ میں آنے والے خار بھی پھول بن جاتے ہیں اور آدمی زندگی کی تمام کٹھنائیوں کو ہنسی خوشی برداشت کرلیتا ہے۔
ایک شوہر کی روداد' اس کی نصفِ بہتر اچانک اس کے لیے آزاد بن گئی تھی اور اس کے لیے قدم قدم پر دکھ اور اذیت کے کانٹے بچھانے پر تل گئی تھی۔ ازدواجی مسائل کا احاطہ کرتا ایک ایسا ناولٹ جو شادی شدہ حضرات کے لیے نہ صرف رہنما ثابت ہوگا بلکہ بہت سوں کی سوچ کا رخ بھی موڑ دے گا۔

ازدواجی مسائل کا شکار قارئین کے لیے بطور خاص

کبیر احمد گزشتہ پانچ برس سے شہر کی ایک طبی لیبارٹری میں اسسٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت کرتا تھا۔ اسے اسپیشلسٹ کی سرکردگی میں کام کرنے کی وجہ سے ہر نوع اور مختلف عناصر کی حامل چیزوں کو پرکھنے' جانچنے اور ان سے حتمی نتائج اخذ کرنے کا کماحقہ تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ لیبارٹری سے متعلقہ ڈاکٹرز اور کنسلٹنٹس کی نگاہوں میں وہ ایک بہترین ایگزامنر تھا۔ اسٹاف میں شامل سبھی لوگ اس کی صلاحیتوں کے معترف تھے اور اس کے کسی بھی معاملے میں اخذ کیے گئے نتائج کو بلاتردد تسلیم کرتے تھے۔

دو سال پہلے کبیر احمد کی شادی اپنی چچا زاد تسکین سے ہوئی تھی۔ یہ ارینج میرج تھی۔ خاندانی پس منظر کے لحاظ سے وہ دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ ایک اس سے بڑی سلیمہ باجی جبکہ دوسری اس سے تین سال چھوٹی زینت تھی۔ اس کی والدہ کا اس وقت انتقال ہوا تھا جب وہ ایف اے میں تھا۔ سلیمہ باجی کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ہمراہ جہلم رخصت ہو گئی تھیں۔ پھر تعلیمی مدارج مکمل کرنے کے بعد کبیر احمد میڈیکل فیلڈ سے وابستہ ہو گیا۔ ادھر اس کے والد ظہیر احمد جو ساٹھ کے پیٹے میں تھے اس کی چھوٹی بہن زینت کے لیے رشتہ دیکھ رہے تھے۔ جلد ہی انہیں اپنی برادری میں ایک مناسب لڑکا نظر آ گیا اور زینت میٹرک کرتے ہی شادی کے بعد اپنے پیا دیس سدھار گئی۔ زینت کی سسرال ٹنڈو آدم میں تھی۔

اب کبیر احمد محسوس کر رہا تھا کہ اس کے والد بڑھاپے کی ناتوانی کے باعث بیمار رہنے لگے تھے۔ انہیں بلڈ شوگر کی بیماری عرصہ دراز سے لاحق تھی جو اب ضعیف العمری کے سبب کافی بڑھ گئی تھی۔ کبیر احمد میڈیکل ٹیکنیشن کا ڈپلومہ کرنے کے ساتھ ایک نجی لیبارٹری میں عملی تجربہ بھی حاصل کر رہا تھا۔ اس کی وجہ سے اسے اپنے والد کی دیکھ بھال میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس صورت حال میں اس کے چچا اور چچی دیکھ بھال کی غرض سے ان کے گھر پہنچ گئے۔ اس کی منگیتر تسکین بھی ان کے ہمراہ تھی۔ باپ کی تیمارداری کے بارے میں اب کبیر احمد کو قدرے اطمینان کا احساس ہوا' لیکن رضائے الٰہی کے سامنے ہر لحاظ و تدبیر اکارت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ظہیر احمد چند روز علالت کے بعد دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور کبیر احمد چچا' چچی اور تسکین کے درمیان آنسو بہاتا رہ گیا۔

والد کے انتقال کے بعد کبیر احمد کے لیے روشن مستقبل کا حصول ایک کھلا چیلنج تھا۔ معمول کے اخراجات کے لیے مرحوم باپ کی پینشن کا سہارا تھا' دوم وہ جس لیبارٹری میں پریکٹس کر رہا تھا وہاں سے بھی گزارے کے مطابق معقول خرچہ مل جاتا تھا۔ اس لیے وہ پوری توجہ اور محنت سے کام کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا اور ٹھیک دو برس بعد جب کہ وہ ڈپلومہ مکمل کر چکا تھا اور قابل قدر تجربہ بھی حاصل کر چکا تھا۔ لیبارٹری کے چیف ایگزیکٹو نے اس کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے اسے مستقل طور پر اسسٹنٹ پروفیسر کی نوکری کے لیے کنفرم کر دیا اور یوں وہ پرکشش تنخواہ کے ساتھ ایگزامنر کی حیثیت سے ایسوسی ایٹ آف لیب کا باقاعدہ رکن بن گیا۔

پھر تقریباً چھ سات برس زندگی کی خوشیوں سے بھرپور یوں گزرے کہ کبیر احمد کو وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ اس عرصے میں بعض قابل رشک تبدیلیاں بھی وقوع پذیر ہوئیں۔ وہ پیشہ ورانہ لحاظ سے کنسلٹنٹ پروفیسرز اور ڈاکٹرز کی نگاہوں میں ایک ماہر و مشاق اور ذہین و فطین ایگزامنر تھا۔ اس کی رپورٹس پر آنکھ بند کر کے ڈاکٹرز اپنے ریمارکس دیتے تھے اور کلائنٹ کی جانب سے شاذونادر ہی کسی سقم یا غلطی کی شکایت موصول ہوتی تھی۔ اس لحاظ سے وہ ممبرز آف ایسوسی ایٹ میں ایک معتبر اور نمایاں حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ ان گزشتہ برسوں میں کبیر احمد نے اپنے والد ظہیر احمد کی دلی خواہش کو بھی پورا کیا تھا اور ان کی طے کی گئی منگنی پر چچا اور چچی کے سامنے بخوشی سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔ تسکین جسے وہ دل سے پسند بھی کرتا تھا' دلہن کے زرق برق لباس میں اس کے ہمراہ اس کے گھر کو آباد کرنے چلی آئی تھی۔ باپ کی موت کے بعد سال بھی پورا نہ ہو پایا تھا کہ اللہ نے اسے اولاد کی نعمت سے سرفراز کر دیا۔ تسکین نے ایک صحت مند گول مٹول بچے کو جنم دیا۔ تسکین نے اپنی پسند سے بیٹے کا نام فرحان رکھا۔ اولادِ نرینہ کی پیدائش سے وہ پہلے سے قدرے مغرور نظر آنے لگی تھی اور حیل و حجت سے کبیر احمد سے اپنی ہر بات منوانے کی کوشش کرتی تھی۔ پھر اگلے سال ان کے یہاں رحمت خداوندی کا نزول ہوا تو دونوں نے باہمی مشورے سے اس کا نام مہرین رکھا۔ دو بچوں کی پیدائش کے بعد سے دونوں میاں بیوی اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ اب ان کا خاندان مکمل ہو چکا تھا۔ لہٰذا اب بچوں کی مزید خواہش تک وہ ننھے فرحان اور معصوم مہرین کی بہترین تعلیم و تربیت کی جانب توجہ دیں گے۔ یوں دونوں بچوں کی آمد سے زندگی ایک نئی اور مختلف ڈگر پر سفر کرنے لگی تھی۔

بچوں کی پیدائش کے باوجود کبیر احمد کا تسکین سے جذباتی لگاؤ کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا۔ ادھر تسکین خود بھی اس کی پرخلوص محبت کی دل سے احسان مند تھی۔ وہ اس کی پسند ناپسند کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ اور اسے ناراض ہونے کا موقع نہیں دیتی تھی۔ اس دوران کبھی جہلم سے سلیمہ باجی اپنے بچوں کے ہمراہ بھائی کے گھر آتی تو تسکین کے اصرار پر اس کی چھوٹی نند زینت بھی اپنے بچوں سمیت ٹنڈو آدم سے کراچی کے لیے روانہ ہو جاتی۔ پھر تسکین دونوں نندوں اور ان کے بچوں کی ناز برداری میں مصروف ہو جاتی۔ محض اس خیال سے کہ کبیر احمد ان کا اکلوتا بھائی تھا اور اس کے مان سمان کی روایتوں کو بھابی ہونے کے ناتے اسے ہی نبھانا تھا۔ محض اسی سے کبیر احمد کی خوشی اور عزت و وقار ہے' یہ تسکین کا مطمحِ نظر تھا۔

یوں ایک اچھی بیوی کی رفاقت میں کبیر احمد اپنے چھوٹے سے کنبے کے ساتھ پرسکون زندگی گزار رہا تھا'

لیکن مہرین ابھی سال بھر کی بھی نہ ہوئی تھی کہ خلافِ معمول تسکین کی بے جا ضد اور خودسری کی وجہ سے اس کا سکون غارت ہو گیا۔ کبیر احمد کا محنت وجدوجہد سے بنایا وہ چھوٹا سا گھر تسکین کے اختلافی رویہ سے کچے گھروندوں کی مانند لرزنے لگا اور لاکھ صبر وضبط کے وہ بیوی کی عاقبت نااندیشی سے ذہنی طور پر اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ کوئی دو ہفتے قبل گھر سے ڈیوٹی کے لیے روانہ ہونے سے پہلے وہ تسکین اور ننھے فرحان کے ساتھ ناشتے کی میز پر موجود تھا۔ مہرین اس وقت کمرے میں سو رہی تھی۔

"سنیے! ایک بات بتانی ہے آپ کو۔" تسکین نے ملائمت بھرے لہجے میں کبیر احمد سے کہا۔

"ہاں کہو، کیا بات ہے؟" کبیر احمد نے اخبار ایک جانب رکھتے ہوئے جواباً استفسار کیا۔ پھر اس نے مگ میں چائے ڈالی۔

"آج ڈیوٹی سے واپسی پر آپ فاسٹ فوڈ میں کچھ لے آیئے گا۔ میں گھر میں نہیں ہوں گی۔ مجھے دوپہر میں اپنی سہیلی کے گھر دعوت پر جانا ہے۔" تسکین نے پُرکار لہجے میں اسے جتاتے ہوئے کہا۔ ڈھائی تین برس کا فرحان قریب موجود معصومیت سے دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بیوی کی بات سے زچ ہو کر کبیر احمد قدرے ناراضی سے بولا۔

"بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔ دعوت کے شوق میں چھوٹے بچوں کو بھی بیمار کرو گی۔"

"آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں! یہ مسئلہ میرا ہے۔ میں بچوں کو سنبھال لوں گی۔" جواباً تسکین نے مدافعانہ لہجے میں محبت سے کہا۔

"فضول ضد نہ کیا کرو۔ میں نے کہا ہے نا کہ ابھی بچے چھوٹے ہیں اس لیے سہلیوں کی پارٹیوں کے بارے میں سوچنے کے بجائے ان پر توجہ دو۔ میرے جانے کے بعد تم بچوں کا خیال نہیں رکھو گی تو کون رکھے گا؟" کبیر احمد نے قدرے تیز لہجے میں تسکین کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ اس کے تیور دیکھ کر تسکین تلملاتے ہوئے جھنجھلاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔

"کبیر! آپ یوں دل مت جلایا کریں۔ آپ نے گورنس تو نہیں رکھ چھوڑی ہے بچوں کے لیے، صبح سے رات گئے تک میں ہی بچوں کی دیکھ بھال میں خوار ہوتی ہوں۔ اس کے باوجود آپ کے طعنے تشنے ختم نہیں ہوتے۔" یہ کہتے ہوئے تسکین نے غصیلے انداز میں تام چینی کی خوب صورت اور قیمتی کیتلی کو میز پر یوں دھڑ سے رکھا کہ باقی دوسرے چمکتے دمکتے برتن بھی لرز گئے۔ اس برہمی سے تین برس کا فرحان جو تسکین کے قدرے پہلو میں کرسی پر بیٹھا تھا بے اختیار رونے لگا۔ کبیر احمد کے انکار سے تسکین پہلے ہی تپ رہی تھی۔ ننھے فرحان کو روتا دیکھ کر وہ متوحش لہجے میں چیخ کر بچے سے بولی۔

"تمہیں کیا بیٹھے بیٹھے ہو گیا، کیوں چلا رہے ہو نالائق۔" قدرے بپھرتی اور اونچی آواز میں چلاتی تسکین یکسر شوہر کی موجودگی سے بے پروا ہو گئی تھی۔ لیکن کبیر احمد جو بہ ظاہر پرسکون انداز میں ناشتا کر رہا تھا، بیوی کو نامرادی سے دل کے پھپھولے پھوڑتے دیکھ رہا تھا۔ پھر تسکین ننھے فرحان کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے ناشتہ کروانے لگی۔ اس کا جذباتی اور غیر سنجیدہ ردعمل دیکھ کر کبیر احمد کو خاصی تکلیف ہوئی تھی۔ پھر وہ زیادہ دیر تک ضبط نہ کر سکا اور ناشتا ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بریف کیس اٹھاتے ہوئے خاصی ناراضی سے تسکین سے کہا۔ "تم انتہائی بے وقوف عورت ہو تسکین، معصوم بچے پر اپنی جھنجلاہٹ اتار کر تم مجھ سے اپنی ضد ہرگز نہیں منوا سکتیں۔ یہ بات کان کھول کر اچھی طرح سن لو۔"

اتنا کہہ کر وہ لیبارٹری جانے کی غرض سے باہر نکل گیا تھا۔

اس ناخوشگوار واقعے کو دو ہفتے گزر گئے تھے تاہم کبیر احمد اور تسکین کے درمیان پیدا ہونے والی چپقلش روز بروز بڑھتی چلی گئی اور وہ تسکین کے باغیانہ طرز عمل سے ایک ایسی گنجلک اور پرپیچ صورت حال میں مبتلا ہو گیا تھا، جس سے نکلنا اسے خاصا دشوار نظر آ رہا تھا۔ حسین وجمیل تسکین کے شاکی ونالاں تیوروں کو دیکھ کر وہ شدید بے زاری سے بغلیں جھانکنے لگتا تھا، محض دو ہفتے میں اس کے تندوتیز جملوں اور لن ترانیوں نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا ڈالی تھیں۔ بیوی کی اصلاح کا کوئی راستہ نہ پاتے دیکھ کر آخر ایک شام وہ یوں دل برداشتہ ہوا کہ اپنی حمایت میں ترکی بہ ترکی جواب دیتی اور بچوں کی آڑ لے کر اس کے جذباتی تلاطم کو بڑھاوا دیتی تسکین پر اس کا ہاتھ اٹھ گیا۔ شادی کے بعد سے اب تک دونوں میاں بیوی میں کبھی دست درازی کی نوبت نہ آئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کبیر احمد نے شدت جذبات سے بے اختیار ہو کر تسکین کے چہرے پر ایک زور کا تھپڑ رسید کیا تھا۔ اگلے لمحے تسکین اپنے تمتماتے چہرے کو ہتھیلیوں میں رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی تھی اور کبیر احمد پاؤں پٹختے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

اگلے روز کبیر احمد لیبارٹری میں اپنی کرسی پر کافی دیر تک تسکین کی بڑھتی ہوئی خودسری اور باغیانہ روش کے بارے میں سوچتا رہا۔ بیوی سے بڑھتے ہوئے اختلافات نے اس کی امن پسند طبیعت میں یوں ہلچل اور بے سکونی مچائی تھی کہ وہ کوئی بھی کام توجہ اور دلچسپی سے نہیں کر پا رہا تھا۔ لیب کے ایئر کنڈیشنڈ گلاس روم میں وہ تین چار گھنٹوں سے منتشر سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔ میز پر کچھ ٹیسٹ کی گئیں شیشے کی سلائیڈیں موجود تھیں جنہیں حتمی نتائج مرتب کرنے کی غرض سے ترتیب وار مکمل کر کے رپورٹس تیار کرنا تھیں۔ روم میں اس سے کچھ فاصلے پر سامنے کی جانب لیب کے کنسلٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر متین الرحمٰن بیٹھے مختلف فائلوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس وقت شیشے کی دیوار پر وال کلاک میں سوئیاں دن کے گیارہ بجا رہی تھیں۔ ادھر کبیر احمد کام کے دوران اپنی توجہ کو مجتمع کرنے کی تگ ودو میں بار بار منتشر خیالوں میں ڈوب جاتا تھا۔ تسکین کے زہر خند جملے اس کی سماعتوں میں یکبارگی گونجتے تو اس کے دل ودماغ میں نفرت کے تندوتیز بگولے اڑنے لگتے۔ پھر وہ جذباتی تلاطم سے بے قرار ہو جاتا تو میز چھوڑ کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش میں آہستہ آہستہ سانس کے ہلکورے لینے لگتا۔ ذہنی دباؤ سے اس کے بردبار چہرے کی تازگی اور حلاوت پھیکی پڑ جاتی اور پیشانی پر پسینہ چمکنے لگتا، پھر اپنے پروفیسر سے پردہ پوشی کی وجہ سے وہ رومال سے وقفے وقفے سے چہرہ پونچھنے لگتا۔ کبیر احمد گزشتہ شام کے واقعے کے بعد سے مزید بے سکون ہو گیا تھا۔ اور تسکین کے معاملے میں خود کو خاصا بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اس دوران کبیر احمد کی قدرے خوشامد کے باوجود بھی تسکین نے دوبارہ اس سے بات چیت نہیں کی تھی۔ کبیر احمد کے تمانچے سے اس کی انا مجروح ہوئی تھی۔ پھر دونوں جانب کے تناؤ اور کشیدہ ماحول میں رات گزر گئی۔ صبح میں تسکین غصے کی وجہ سے ناشتے کے لیے نہیں اٹھی۔ فرحان اور مہرین بھوک سے رونے اور منہ بسورنے لگے تو کبیر احمد کو بادل نخواستہ اپنے اور بچوں کے لیے ناشتا بنانا پڑا۔ وہ بیڈ میں دبکی، نخرے سے منہ پھلائے تسکین کے لیے شدید بدظنی محسوس کر رہا تھا۔ اسے سمجھ دار بیوی ہونے کا

ثبوت دیتے ہوئے رات کے ناخوش گوار واقعے سے درگزر کرنا چاہیے تھا مگر تسکین نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ اس کی خودغرضی سے چھوٹے بچے بھی تکلیف میں آگئے تھے لیکن اسے قطعی پروانہ تھی۔ کبیر احمد نے بمشکل بچوں کو بہلاتے ہوئے ناشتا کرایا تھا۔ اندرون خانہ وہ تسکین کو سخت برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس بے وقوف عورت کو اپنی زندگی سے بے دخل کرتے ہوئے اس کے گھر بھجوادے۔ بہرغرض وہ تسکین کی ہٹ دھرمی کو صبر وضبط سے برداشت کرتے ہوئے کچھ دیر تک اس کے سدباب کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے بعد وہ لیبارٹری روانہ ہوگیا۔

"خیریت تو ہے کبیر احمد بہت خاموش دکھائی دے رہے ہو۔" ڈاکٹر متین الرحمٰن کے مخاطب کرنے پر کبیر احمد بے اختیار اپنے پریشان کن خیالوں سے چونکا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی کرسی سے اٹھ کر کب اس کے قریب آئے تھے اسے پتا ہی نہ چلا۔

"لگتا ہے پچھلی رات کوئی رنگین و سنگین خواب دیکھا ہے جس کے سحر میں مبتلا نظر آرہے ہو۔" پروفیسر صاحب نے اپنے اسسٹنٹ پر ازراہِ تعفن دوبارہ چوٹ کی۔ جواباً کبیر احمد خجالت آمیزی سے مسکرایا اور خوش گفتاری سے بولا۔

"جی متین صاحب، آپ نے خوب کہا، خوب صورت بیویاں ہم مردوں کے لیے سنگین خواب ہی تو ہوتی ہیں۔ جو بھانت بھانت کی فرمائشوں سے ساری عمر دردسر بنی رہتی ہیں۔" اس کے جواب پر ڈاکٹر متین الرحمٰن بے اختیار مسکرادیئے۔

"یار محض دو بچوں کے باپ ہو ابھی تم اور دردسر میں مبتلا ہوگئے ہو۔ کیا اقبال نے نہیں کہا ہے کہ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں......!"

"سوری ڈاکٹر صاحب، ایسے عشق ناہنجار سے میں تو کان پکڑتا ہوں اور آپ کی جواں مردی اور حوصلے کی داد دیتا ہوں کہ چھ بچوں کے دشت زیست کو آپ نے کامیابی سے طے کیا۔ آپ واقعی قابل رشک انسان ہیں متین صاحب۔" کبیر احمد کی بذلہ سنجی پر ڈاکٹر متین پرلطف انداز میں ہنسنے لگے۔ پھر چند لمحے توقف سے بولے۔

"یہ اچھا کرتے ہو کہ خوش مزاجی سے دل وذہن کو ہلکا رکھتے ہو۔ پریشان کن سوچوں کا اس سے بہتر علاج کوئی نہیں ہے۔" اپنے پروفیسر کی دم سازی پر کبیر احمد پروقار انداز میں مسکرایا۔ پھر ڈاکٹر متین الرحمٰن میز پر موجود اخذ شدہ سلائیڈوں کو ایک نظر دیکھتے ہوئے مربیانہ لہجے میں بولے۔

"میں کچھ دیر کے لیے باہر جارہا ہوں۔ کوئی نصف گھنٹے بعد آؤں گا تب تک تم ان کی رپورٹس تیار کرلو گے کبیر۔"

"او کے پروفیسر صاحب، میں یہ کام جلد از جلد نمٹانے کی کوشش کروں گا۔" کبیر احمد نے تابعداری سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے بعد متین الرحمٰن گلاس روم سے باہر چلے گئے اور کبیر احمد پوری توجہ اور یکسوئی سے اپنے کام میں منہمک ہوگیا۔

شام کے چار بجنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا، کبیر احمد کا شفٹ ٹائم پورا ہورہا تھا۔ پروفیسر متین الرحمٰن بھی آف کرکے جاچکے تھے۔ کبیر احمد نے اپنے کام کو وائنڈ اپ کرتے ہوئے ضروری فائلوں اور کاغذات کو دراز میں رکھنے کے بعد لاک میں چابی گھمائی۔ قریبی سوئچ پر لگا چارجنگ ہوتا موبائل فون بٹن آف کرتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر گلاس روم سے باہر نکل آیا۔ موبائل فون کے بٹنوں سے کھیلتے ہوئے وہ تسکین کے بارے میں

سوچ رہا تھا۔ پہلے جب زندگی دونوں کے باہمی سمجھوتوں سے پرسکون گزر رہی تھی۔ دونوں کے درمیان لحاظ ومروت کا احساس توانا تھا۔ محبت وخلوص سے ایک دوسرے کی فکر رہتی تھی تو ڈیوٹی کے دوران تسکین کی مس کالیں اسے تواتر کے ساتھ اپنائیت کا احساس دلاتی رہتی تھیں۔ وہ دو تین مرتبہ اس سے بات چیت کرتا اور اس سے روزمرہ کے کاموں اور بچوں کی شرارتوں پر مبنی رپورٹیں سنتا اور اس کی خوشگوار پوچھ پاچھ کا جواب دیتا تھا۔ بیوی کے دلچسپ خاطر طبع اور پرلطف جملوں سے خود کبیر احمد کی طبیعت بھی ہلکی پھلکی ہوجاتی تھی اور کام کی زیادتی کا بھی پتا نہیں چلتا تھا لیکن گزشتہ چھ ہفتوں سے یہ چاہت واپنائیت کی باتیں غیر مانوس ہوگئی تھیں، تسکین نے اختلافی رویوں سے محبت کے ہر جذبے اور ازدواجی زندگی کے سکون سے متعلق ہر سمجھوتے کو یوں بالائے طاق رکھا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے شاکی ونالاں رہنے لگے تھے۔ کبیر احمد نے مایوس نگاہوں سے موبائل فون کی اسکرین کو دیکھا جہاں تسکین کی کوئی مس کال نہیں تھی۔ پھر وہ یوں لیبارٹری کے خودکار مین ڈور سے باہر نکل گیا۔ جیسے اسے بھی خودسر اور ضدی بیوی کی پروانہ ہو۔ کوئی پانچ منٹ بعد وہ موٹر سائیکل پر اپنی منزل کی جانب برق رفتاری سے رواں دواں تھا۔ آج اس کا مقصود نظر ہرگز اپنا گھر نہ تھا۔ تسکین کی خودغرضی کا سوچ کر وہ تنفر اور بے زاری محسوس کررہا تھا۔ اس لیے اس نے موٹر سائیکل کا رخ اپنے ایک دوست سرمد نیازی کے آفس کی جانب موڑ دیا تھا۔ سرمد ایک کاروباری شخص تھا۔ وہ ایک گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک تھا۔ اور کبیر احمد کا پرخلوص دوست اور کلاس فیلو رہ چکا تھا۔

کبیر احمد نے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے تسکین کے خیال کو سر سے جھٹکا اور اسپیڈ بڑھاتے ہوئے سرمد کے بارے میں سوچنے لگا۔ ابھی وہ اس کے آفس سے کچھ فاصلے پر تھا کہ اچانک اس کا موبائل فون کا بزر بجنے لگا۔ اس کی آواز سے کبیر احمد کو دوبارہ تسکین کا خیال آیا اور ناپسندیدگی سے اس کے چہرے کے تیور کھنچ گئے۔ اس نے سرمد کے آفس کے نزدیک موٹر سائیکل کھڑی کی۔ موبائل فون کی ٹون مسلسل شور مچا رہی تھی۔ اس نے دیکھا اسکرین پر تسکین کے موبائل فون نمبر کے بجائے ایک دوسرا نمبر جگمگا رہا تھا۔ یہ تسکین کے والد اور اس کے چچا کا نمبر تھا۔ اس نے صبر وضبط سے کام لیتے ہوئے خود کو ذہنی طور پر تیار کیا اور موبائل فون پر آنے والی کال ریسیو کرنے کی غرض سے بٹن آن کرتے ہوئے بولا۔

"ہیلو! کبیر اسپیکنگ!"

"میں ذکااللہ بول رہا ہوں۔ کیا تم ڈیوٹی سے فارغ ہوگئے ہو؟" تسکین کے والد کی آواز سن کر کبیر احمد نے چونکتے ہوئے چند لمحے سوچا، پھر اس نے صبر وضبط سے کام لیتے ہوئے معمول کے لب ولہجے میں جواباً کہا۔

"ہاں چچا کچھ دیر پہلے فارغ ہوا ہوں لیکن آپ نے کیسے اچانک فون کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے کبیر احمد تب ہی فون کیا ہے۔" اس بار سسر کی تیز آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ گزشتہ شام تسکن سے ہونے والی تلخ کلامی کا واقعہ اپنی تکلیف دہ جزئیات کے ساتھ اس کے دماغ میں سنسنانے لگا۔ تاہم اپنی پرامن طبیعت کو برقرار رکھتے ہوئے متانت آمیز لہجے میں بولا۔ "کیا بات ہوگئی ہے چچا جو آپ یوں جذباتی ہورہے ہیں۔"

"تم سے ایسی ناسمجھی کی امید نہیں تھی مجھے۔ نجانے

کب سے تم تسکین سے ظلم و جبر کا سلوک روا رکھے ہوئے ہو اور یوں بے شرمی سے انجان بن رہے ہو۔" ذکا اللہ برہم ہوتے ہوئے چراغ پا لہجے میں بولتے چلے گئے۔

"آپ صرف مجھے قصور وار ٹھہرا کر زیادتی کررہے ہیں چچا اور اگر تسکین نے یہ کہا ہے کہ میں اس پر ظلم و جبر کررہا ہوں تو یہ کھلا جھوٹ ہے۔" سسر کے الزامات کی بوچھاڑ سن کر کبیر احمد نے غصے کو قابو رکھتے ہوئے دفاعی لہجے میں جواباً کہا۔ دوسری جانب ذکا اللہ داماد کے مدافعانہ جواب کو شوہر کا روایتی حاکمانہ رویہ گردانتے ہوئے سخت لہجے میں سرزنش کرتے ہوئے بولے۔

"تمہارے حیلے بہانوں سے ہمارے دل ٹھنڈے نہیں ہوسکتے۔ تسکین سے مار پیٹ کرکے تم نے مجھے اور اپنی چچی کو خاصا دکھ پہنچایا ہے۔ لیکن آئندہ اس پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے اس کے نتائج کے بارے میں ضرور سوچ لینا کبیر۔ کیونکہ دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود تسکین کو ہم زندگی بھر کے لیے بھی اپنے پاس رکھ سکتے ہیں سمجھے میاں! اور ہاں اب اپنی چچی سے بات کرو۔" اتنا کہنے کے بعد انہوں نے کبیر احمد کا جوابی موقف سنے بغیر قریب موجود تسکین کی والدہ جن کا نام نویدہ بیگم تھا سے بات کرنے کا عندیہ سنایا۔ اگلے لمحے کبیر احمد کے کانوں سے چچی کی تند و تیز اور پاٹ دار آواز ٹکرائی۔

تسکین نے چچا، چچی سے اس کی جس انداز میں شکایت کی تھی اور محض ایک تھپڑ کے ساتھ جو اضافی تشدد اور ظالمانہ بدسلوکی کے الزامات اس پر تھوپے تھے وہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ چچی کی دھواں دھار ہرزہ سرائی اور غم و غصے سے گرجتی آواز سن کر کبیر احمد کو اپنے ناپسندیدہ جذبات کو ضبط کرنا خاصا دشوار ہورہا تھا۔ چچی کے دھمکی آمیز لب و لہجے سے کبیر احمد کے دل و دماغ بری طرح چیخ رہے تھے۔ شدت ضبط سے اس کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا۔ اس نے کمال بردباری سے جیب سے رومال نکالا اور پسینہ پونچھتے ہوئے احتجاجاً تیز لہجے میں بولا۔

"آپ میری بڑی ہیں۔ محض اس وجہ سے میں آپ کو بہتان لگانے سے نہیں روک سکتا۔"

یہ جملہ کہہ کر کبیر احمد نے لمحاتی توقف کیا پھر قدرے دل جلے لہجے میں واضح کرتے ہوئے چچی سے بولا۔

"اور رہ گئی منہ توڑنے والی بات، تو تسکین میری بیوی ہے، میں نے اس کی غلطی پر چانٹا مارا ہے تو اسی حق کو استعمال کیا ہے۔ اگر آپ اسے بدمعاشی کہہ کر ظفر اور مظفر کی دھمکی دے رہی ہیں تو ٹھیک ہے۔ آپ ان دونوں کو میرے تعاقب میں بھیجنے کی تکلیف نہ کریں بلکہ میں خود ہی تسکین کو آپ کے پاس چھوڑ جاتا ہوں۔" داماد کا دوٹوک جواب فون کی دوسری جانب ساس کے لیے نہلے پہ دہلا کے مصداق تھا۔ کبیر احمد کی وضاحت سے نویدہ بیگم مرچیں چبارہی تھیں۔ وہ بات سمجھنے اور مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے نفرت آمیز انا پرستی سے تند و تیز لہجے میں بولیں۔

"اتنی چرب زبانی کہاں سے آ گئی تم میں! ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔ میری بیٹی پر ظلم کے پہاڑ بھی توڑتے ہو اور اسے چھوڑنے کی دھمکی بھی دیتے ہو۔ کیا بھول گئے ہو تمہاری بھی دو بہنیں ہیں اگر سلیمہ اور زینت کے ساتھ ایسا ظلم و جبر ہو تب تمہیں پتا چلے۔" ساس کی لن ترانیوں کو سن کر کبیر احمد قدرے تحمل سے بولا۔

"بہنوں اور بیٹیوں کے گھروں کو شاد و آباد رکھنے کی غرض سے ماں باپ دخل اندازی نہیں کرتے۔

سلیمہ باجی اور زینت اپنے گھروں میں خوش اور آباد ہیں محض اس لیے کہ میں ان کے معاملات میں آپ کی طرح انٹرفیئر نہیں کرتا۔"

"لیکن میں اور تمہارے چچا تسکین پر ہونے والے ظلم پر خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ ہم اپنی بیٹی کو تمہارے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ میں جہلم میں سلیمہ سے تمہاری بدمعاشی کے بارے میں پوچھ گچھ کروں گی۔ تمہارے ابا اور سلیمہ کے اصرار اور پسند سے ہم نے تسکین کی شادی کی تھی۔ اب وہی تمہاری زبان درازی کا جواب دیں گی۔ سمجھے کبیر احمد۔" نویدہ بیگم نے فہمائشی لہجے میں داماد کو کھلے لفظوں میں جتایا۔ اس کے بعد دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہوگیا۔ کبیر احمد کے چہرے پر چچا چچی کے شکایت آمیز جملوں سے خاصی برہمی اور بے زاری کے تاثرات تھے۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے موبائل فون آف کیا پھر رومال سے چہرے کو نارمل کرتے ہوئے تسکین کی اپنے ماں باپ سے اس کی چغل خوری کے بارے میں چند لمحے تک سوچتا رہا۔ یہ میاں بیوی کے معاملے میں دخل در نامعقولات جیسی حرکت ضرور تسکین نے کی تھی جو کبیر احمد کے نزدیک بے ایمانی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے درمیان اور چچا چچی کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہوگئی تھی۔ اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے وقت کچھ فاصلے پر موجود اپنے دوست سرمد کی گڈز کمپنی کے آفس کو الجھن آمیز نظروں سے دیکھا۔ ساس و سسر کے تند و تیز جملوں نے اسے ذہنی دباؤ میں مبتلا کردیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی طبیعت میں انتشار و اضمحلال پیدا ہوگیا تھا۔ اور اب سرمد سے ملاقات کرنے اور گپ شپ کرنے کی سوچ میں تضاد پیدا ہوگیا تھا۔ بدمزگی کے احساس سے اس کا جوش و خروش مفقود ہوچکا تھا۔ اس نے دل جلے انداز میں ہونٹ کاٹتے ہوئے تسکین کے بارے میں سوچا اور موٹر سائیکل سرمد کے آفس سے موڑتے ہوئے تفکرات کے انجانے راستوں پر ڈال دی۔ اسے احساس ہوچلا تھا کہ ذکا اللہ اور نویدہ بیگم کی اکلوتی چہیتی بیٹی کے جی کا جنجال بنتے مسئلے کو دور کیے بغیر اسے سکون کا سانس لینا نصیب نہیں ہوگا۔

❀……❀……❀

کبیر احمد اندازاً پندرہ منٹ تک خالی الذہنی سے مختلف سڑکوں پر موٹر سائیکل دوڑاتا رہا جب اس کی طبیعت کا انتشار قدرے کم ہوا تو اس نے ایک کیفے کے سامنے گاڑی کو اسٹینڈ کیا۔ وہ تسکین کے بارے میں آئندہ زندگی کے لیے حتمی فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت پونے چھ بج رہے تھے۔ کبیر احمد نے رسٹ واچ پر ایک نگاہ ڈالی پھر وہ پرسوچ قدموں سے چلتا ہوا کیفے میں داخل ہوا۔ شام کے دھند لکے کی وجہ سے کیفے میں لوگوں کی گھما گھمی فزوں تر دکھائی دے رہی تھی۔ اندرونی ہال کی آرائشی روشنیوں سے کیفے کا ماحول جگمگا رہا تھا۔ کبیر احمد نے گوشہ عافیت کی تلاش میں آخری بنچوں پر نظریں دوڑائیں۔ ابھی وہ ایک خالی کرسی کو دیکھ کر آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ کسی کھنکتے لہجے نے اسے مخاطب کرتے ہوئے چونکا دیا۔

"ہائے کبیر……" وہ نوخیز دوشیزہ نزدیکی کرسی سے اٹھ کر اس کے سامنے آ گئی تھی۔ ادھر کبیر احمد نے بھی اسے پہچان لیا تھا وہ نازش تھی۔ اس کی کالج کے زمانے کی شوخ و چنچل اور الہڑ دوشیزہ جو اپنی پرمذاق باتوں سے اسے ہنسنے مسکرانے پر مجبور کر دیا کرتی تھی۔ اپنی بذلہ سنجی کے باوجود نازش ایک قابل اور تیز فہم لڑکی تھی۔ وہ میڈیکل کالج کے فائنل ایئر کی اسٹوڈینٹ تھی۔ اس سے قبل بھی کبیر احمد کی نازش سے چند مرتبہ ملاقات ہو چکی تھی۔ آخری دفعہ نازش اپنی کولیگ کے ہمراہ کسی کام سے لیبارٹری آئی تھی تب کبیر احمد اس سے ملا تھا۔ لیکن اس وقت کیفے میں نازش اکیلی نظر آ رہی تھی۔ وہ ہلکے آسمانی رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس تھی اور اس سے میچنگ کرتا رنگین گلابی دوپٹہ اس کے شانے پر جھلملا رہا تھا۔ کبیر نے اندازہ کیا کہ نازش کیفے میں غالباً کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے اچانک سامنے دیکھ کر کبیر احمد نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔

"اسپیڈی تم یہاں کیسے؟" کبیر احمد نٹ کھٹ مزاج اور باتونی ہونے کی وجہ سے نازش کو اسپیڈی کے نام سے پکارتا تھا۔

"یار اپنے فرینڈ کا انتظار کر رہی ہوں۔ سالا خاصا lazy بندہ ہے۔ کوئی گھنٹے بھر سے بھانت بھانت کے لوگوں کی شکلیں دیکھ دیکھ کر سخت بورنگ ہو رہی تھی۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔" نازش نے عادتاً نان اسٹاپ بولتے ہوئے جواباً کہا۔

"بائی دا وے یہ lazy بندہ وہ شریف النفس تو نہیں ہے جس کے آئندہ چند برسوں میں تم گلے کا طوق بننے والی ہو؟" کبیر احمد نے ذو معنی لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا تو نازش کے سیبوں جیسے گال شرم و حیا سے تمتما اٹھے۔ اگلے لمحے وہ خوشگوار لہجے میں متانت سے بولی۔

"ہاں یار! ارمغان کے ساتھ ایک میوزیکل کنسرٹ میں جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس lazy نے پانچ بجے کی ٹائمنگ دی تھی لیکن اب سوا چھ ہو رہے ہیں۔ نجانے موصوف کہاں اٹک کر رہ گئے ہیں۔" نازش نے مصنوعی خفگی سے برہم ہو کر کبیر احمد کی جانب دیکھا۔ اس لمحے وہ بے حد حسین و دلکش لگ رہی تھی۔ کبیر جانتا تھا کہ ارمغان جس کے ساتھ پچھلے برس نازش کی منگنی ہوئی تھی اس کا پھوپھی زاد تھا۔ دونوں گھر والوں کی مصلحت آمیز روک ٹوک کی وجہ سے چھپ چھپا کر باہر ملتے تھے اور سیر و تفریح کے پروگرامز سے انجوائے کرتے تھے۔ کبیر نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بردباری سے کہا۔

"ڈونٹ وری یار! ارمغان کے آنے تک میں تمہیں اپنی کمپنی میں بور نہیں ہونے دوں گا۔ اوکے اسپیڈی!"

"دیٹس گڈ" نازش نے شوخ لہجے میں چہک کر کہا۔ پھر کبیر احمد اسے ساتھ لیتے ہوئے ایک پرسکون گوشے میں موجود خالی میز کی جانب بڑھ گیا۔

سرد و گرم چشیدہ لوگوں سے سنتے آ رہے ہیں کہ آدمی باہر کی دنیا میں خوشی و اطمینان کی تلاش و جستجو محض اسی وقت کرتا ہے کہ جب وہ اپنی اندر کی دنیا میں برپا قیامت خیزی سے مضطرب اور بے سکون ہو جاتا ہے۔ کبیر احمد بیوی کی وجہ سے مسلسل ذہنی دباؤ میں مبتلا تھا۔ اسے طبیعت میں یکسوئی اور ٹھہراؤ کی غرض سے ایک سچے دوست کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ جس سے گفت و شنید کر کے وہ ذہنی دباؤ سے فی الوقت خلاصی پا سکتا تھا۔ اس لیے اسے کیفے میں نازش کا ملنا غنیمت لگا۔ دلکش شخصیت کی مالک نازش اس کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا تھا۔ جس کی دل موہ لیتی باتوں نے اسے یوں ہشاش بشاش کر دیا تھا کہ وہ تسکین کے مسئلے ہی کو بھول گیا۔

کبیر احمد اور نازش کولڈ ڈرنک سے شغل کرتے ہوئے کالج لائف سے وابستہ پرمذاق یادوں کو تازہ کرتے ہوئے شگوفے چھوڑتے رہے۔ نازش کا قہقہوں سے برا حال ہونے کو تھا لیکن کبیر ماضی کی پرلطف حماقتوں کو بیان کرتے ہوئے رکنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ تقریباً نصف گھنٹے میں اس کا منگیتر ارمغان کیفے میں داخل ہوا اور کھوجتا ہوا ان کے قریب آن پہنچا۔

"ہیلو ارمغان اچھا ہوا کہ تم بروقت آ پہنچے ورنہ تمہارے سولیٹ ہونے کی وجہ سے اسپیڈی اپنی بوریت کا بدلہ لینے کا سوچ چکی تھی۔ تھینکس گاڈ۔" کبیر احمد نے اداکاری کرتے ہوں دوستانہ لہجے میں ارمغان کو باور کرایا گویا منگیتر کے ناراض ہونے سے ارمغان کے ساتھ انہونی ہو جاتی۔ اس کے انداز پر نازش اور ارمغان دونوں خوشگواری سے ہنس پڑے۔ پھر ارمغان نے احسان مندی سے کبیر سے جواباً کہا۔

"دیٹس امیزنگ کبیر! تم نے اس کی ریز رو چیئر کو اتنی دیر کیسے برداشت کیا؟ میرے کزنز تو محض چند منٹوں میں اس کی طرح داری سے کان پکڑتے ہوئے رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ کیوں نازش میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے جناب! کیونکہ تم نے اچھے، مہذب اور معقول لوگوں سے مجھے ٹاکنگ کرتے نہیں دیکھا۔ میں کبیر جیسے اسمارٹ مردوں کو امپورٹنس بھی دیتی ہوں۔" نازش نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو ارمغان بے اختیار قہقہہ لگاتے ہوئے ہنس دیا۔

"سنبھالو کبیر! اسے پری شش بے ٹر!" ارمغان نے توجہ دلاتے ہوئے کبیر سے کہا۔

میز کی دوسری جانب کبیر احمد کے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ زندگی کی خوشیوں سے لبریز ہو گئی تھی۔ اس نے رشک آمیز نگاہوں سے نازش سے کہا۔

"تھینک یو اسپیڈی! تمہاری چہکتی مہکتی شخصیت ارمغان کی نوک جھونک کے ساتھ بہت سوٹ کرتی ہے۔" اس کے تحسین آمیز جملے سے دونوں کے چہرے پر پسندیدگی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ کبیر احمد اس وقت خود کو بھی ہلکا پھلکا اور طمانیت خیز محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ نازش اور ارمغان جیسی اسمارٹ جوڑی دیکھ کر وہ دل ہی دل میں تسکین کے لیے دکھ و تاسف میں مبتلا ہو گیا تھا۔ پھر کوئی پانچ دس منٹ بعد نازش اور ارمغان کو رخصت کرتے ہوئے جذبہ خیر سگالی سے مسکرا رہا تھا۔ جیسے دل جلے لوگ اپنی پریشانیوں سے قطع نظر ہو کر دوسروں کو نیک تمناؤں کے ساتھ الوداع کہتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد

کبیر احمد ساس، سسر کی تندوتیز ہرزہ سرائی پر ٹھنڈے دل ودماغ سے غوروخوض کرنے لگا۔ محض تسکین کی شکایت پر چچا چچی نے اسے سو باتیں سنا ڈالی تھیں۔ موصوفہ نے گھر کا بھیدی ہوتے ہوئے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اب اس بے اعتباری کے ماحول میں کبیر احمد کو تسکین کا علاج سوچنا تھا۔ اسے فرحان اور مہرین دونوں بچے فکرمندی سے دوچار کررہے تھے۔ جس کے باعث وہ کوئی نتیجہ خیز تدبیر سوچنے سے معذوری محسوس کررہا تھا۔ کم وبیش گھنٹے بھر وہ سر کھپاتا رہا اور سگریٹ پھونکتے ہوئے دل وذہن کو خود سے زیروزبر کرتا رہا۔ اس دوران اس نے دردسری سے زچ ہوتے ہوئے دو دفعہ چائے بھی پی۔ آخر میں جب وہ کرسی سے اٹھ رہا تھا تو کیفے کے وال کلاک میں ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اس نے چھوٹے بچوں کی موجودگی کے سبب تسکین کے سامنے مزید ایک بار پھر سرنڈر ہونے اور سمجھوتہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے معصوم بچوں کا بھی تسکین کو احساس دلانا تھا کہ ان کے لڑائی جھگڑوں سے کہیں فرحان اور مہرین احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوجائیں، بیمار نہ ہوجائیں اتنا سوچ کر کبیر احمد کیفے سے باہر نکل آیا اور قدرے اطمینان سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔

❁……❁……❁

کبیر احمد گھر پہنچا تو دروازے پر لاک دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑگئے۔ گزشتہ شام تلخ کلامی کے دوران اس نے تسکین کو جو تھپڑ لگایا تھا اس سے تسکین کی انا بری طرح زچ ہوئی تھی۔ اس نے رات بھر کبیر احمد سے کوئی بات نہیں کی تھی اور صبح اس کے لیبارٹری روانہ ہونے کے بعد وہ سخت برہم ہوکر دونوں بچوں کو لے کر اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی تھی۔ چچا چچی نے موبائل فون پر جس ناراضی اور غصے کا اظہار کیا تھا وہ اس بات کا بین ثبوت تھا۔ بیٹی کا رونا دھونا سن کر ذکا اللہ اور نویدہ بیگم نے اسے بچوں کے ساتھ گھر بلا لیا تھا۔ کبیر احمد نے تلملاتے ہوئے بیوی کی جذباتی حماقت کے بارے میں سوچا۔ تسکین نے اسے اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس نے موبائل فون پر نہ تو کال کی تھی اور نہ ہی کوئی میسج بھیجا تھا۔ اس کی خودسری کو محسوس کرتے ہوئے کبیر احمد نے دل جلے انداز میں ہونٹ کاٹے پھر اس نے ڈپلی کیٹ چابی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔

ابھی چھ سات منٹ ہی گزرے تھے کہ موبائل فون کی ٹون بجنے لگی۔ کبیر احمد نے اسکرین پر نمبر دیکھا تو اس کا منہ کڑوا ہوگیا۔ تسکین کی کال تھی۔ اسے آخرکار کبیر سے بات کرنے کا خیال آ گیا تھا۔ اس نے کال کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور بے پروائی سے کھانا کھاتا رہا، فون ٹون کچھ دیر تک متواتر بجتی رہی پھر بند ہوگئی۔ ڈنر کرنے تک تسکین نے چار پانچ دفعہ مس کال کی تھیں لیکن کبیر نے ریسیو کرنے کے بجائے اسے نظرانداز کردیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہوکر وہ صوفے سے اٹھا اور پرسوچ قدموں سے گھر میں ٹہلنے لگا، اس نے اگرچہ تسکین سے بات نہیں کی تھی لیکن وہ اس کی بیوی ہونے کی وجہ سے گھر کے طول وعرض پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ اس سے کیونکر بے پروا ہوسکتا تھا۔ اس لیے تسکین لاشعوری طور پر دوبارہ اس پر سوار ہوگئی تھی۔ کبیر احمد ٹہلتے ہوئے ذہنی دباؤ محسوس کررہا تھا۔ اندازاً پندرہ منٹ ٹہلنے کے بعد وہ کچن میں داخل ہوا۔ دو کپ چائے بنائی اور مگ لیتے ہوئے واپس لاؤنج میں آ گیا۔ اس نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے موبائل فون کی اسکرین کو دیکھا۔ تسکین کا تھرکتا جھلملاتا نمبر ماند پڑا تھا۔ یقیناً اس نادان عورت نے شوہر کی ناراضی کو جان لیا تھا، اس لیے اس نے دوبارہ مس کالز کی تکرار نہیں کی تھی لیکن کبیر احمد نے چائے ختم کرکے ابھی مگ ٹیبل پر رکھا ہی تھا کہ خلاف توقع موبائل فون کی ٹون بجنے لگی۔ اسکرین پر اس کی بیوی کے بجائے کوئی دوسرا نمبر جھلملا رہا تھا۔ کبیر احمد نے قدرے تجسس سے سوچا اور موبائل فون کی میوزک ٹون بند کرتے ہوئے کان سے لگایا اور باوقار لہجے میں بولا۔

''ہیلو……کبیر اسپیکنگ۔ آپ کون؟''

''بھیا، میں زینت بول رہی ہوں ٹنڈوآدم سے۔'' دوسری جانب سے چھوٹی بہن کی آواز سن کر کبیر احمد قدرے چونکا۔

''خیریت تو ہے زینو! اس وقت کیسے فون کیا؟'' اس نے مشفقانہ سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں خیریت سے ہوں بھیا لیکن نویدہ چچی نے وسیم سے تمہارے بارے میں بہت گھٹیا اور غلط سلط باتیں کی ہیں اس لیے فون کیا ہے۔'' زینت کے استفسار میں بھائی کی حمایت کا پرجوش احساس چھلک رہا تھا۔ وہ کافی دیر سے کبیر احمد کا نمبر ٹرائی کررہی تھی لیکن اسے جوابی سگنل نہیں مل رہا تھا۔ چھوٹی بہن کی بات سن کر کبیر احمد جواباً قدرے نخوت سے بولا۔

''نویدہ چچی اور ان کی چہیتی بیٹی کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ انہوں نے وسیم سے اپنے گلے شکوے کرکے اچھا نہیں کیا! ایسی بددماغی میں برداشت نہیں کروں گا۔'' ساس کی بہتان طرازی پر وہ ناپسندیدگی کے جذبات سے تلملا گیا تھا۔ وسیم اس کا چھوٹا بہنوئی تھا۔ نویدہ چچی نے اس سے کبیر احمد پر جو جھوٹے الزامات لگائے تھے اس سے ظاہر ہے کبیر احمد کا شخصی وقار مجروح ہوا تھا۔ دوسری جانب سے زینت کی پرتجسس آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''کبیر بھیا، آپ نے تسکین کے ساتھ مار پیٹ نہیں کی ہے تو وہ بچوں کو لے کر چچی چچا کے گھر کیوں چلی گئی ہے؟''

''زینو، کیا تم اپنے بھائی کی طبیعت سے واقف نہیں ہو۔'' کبیر احمد نے قدرے تحمل اور بردباری سے کہا پھر لمحاتی وقفے کے بعد سرزنش آمیز لہجے میں بولا۔

''محض ایک تھپڑ کو وجہ بنا کر تسکین مجھے ظالم اور جانور کہہ کر بدنام نہیں کرسکتی۔ اور کیا یہ اچھی بیویوں کے طور طریقے ہیں زینو؟''

''واقعی بھابی نے یہ اچھی حرکت نہیں کی بھیا! میاں بیوی کو بات چیت کرکے خود سے مسائل کو حل کرنا چاہیے۔'' زینت نے چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق متانت آمیز لہجے میں کہا۔

''یہی تو بات ہے زینو جو تسکین نہیں سمجھنا چاہتی۔ تین چار ہفتوں سے اس کے دماغ میں نجانے کیا خناس سمایا ہے کہ بات بے بات اختلاف کرنے لگتی ہے اور کسی بھی معاملے میں میرے مشوروں کے بغیر اپنی مرضی چلاتی ہے۔ محض اسی ضدی پن کی وجہ سے میں نے مجبوراً اسے تھپڑ رسید کیا تھا کہ شاید اسے عقل آجائے۔'' کبیر احمد نے تسکین کے ساتھ کئی روز سے جاری چپقلش کو مختصر طور پر بیان کرتے ہوئے کہا۔

''بھیا آپ کو اس بارے میں چچی چچا کو پہلے سے آگاہ کرنا تھا۔ دیکھیے نا تسکین نے جو جھوٹی سچی باتیں چچا چچی کو بتائیں انہوں نے اس پر یقین کرلیا اور گھریلو اختلاف کا سارا الزام آپ کے سر ڈال دیا۔''

''ابھی تم نے کہا تھا نا کہ گھر کا مسئلہ گھر کے اندر ہی رفع دفع ہوجائے تو بہتر ہے، میں نے بھی اس خیال سے چچی چچا کو قبل از وقت نہیں بتایا تھا کہ خود ٹھنڈے

دل وذہن سے تسکین کو سمجھا دیتا ہوں لیکن وہ عقل کی دشمن اپنے ماں باپ کے ساتھ مل کر میرے لیے ذلت ورسوائی کا سبب بن گئی۔'' جواباً کبیر احمد نے قدرے غصے اور افسوس سے کہا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے پریشان کن لہجے میں دوبارہ بولا۔

''ایسی کم عقل عورتیں خود اپنے ماں باپ اور گھر والوں کے لیے وبال جان ثابت ہوتی ہیں۔ اس لیے مجھے تو فرحان اور مہرین کی فکر لاحق ہے۔ کہیں تسکین کی نادانیوں کے باعث ان معصوموں کو کچھ نہ ہوجائے۔''

''بہر حال بھیا' بات جو بھی ہے تسکین کو چچا چچی نے اپنے پاس روک لیا ہے' وسیم بتا رہے تھے کہ نویدہ چچی آپ دونوں کے لڑائی جھگڑے کے بارے میں جہلم سلیمہ باجی سے شکایت کرنے کا پیغام دے رہی تھیں۔ وہ کافی غصے میں بات کررہی تھیں۔ اس لیے سلیمہ باجی کا فون آئے تو احتیاط اور صبر وضبط سے بات کیجیے گا۔ میں نے یہ اطلاع دینے کی غرض سے آپ کو فون کیا تھا۔'' اتنا کہہ کر زینت نے چند لمحے توقف کرکے کبیر احمد سے کہا۔

''اور ہاں بھیا' وسیم واش روم سے آرہے ہیں۔ وہ بھی آپ سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ آپ دو منٹ رکیے گا۔''

کچھ دیر بعد کبیر احمد نے تسکین کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے اپنے چھوٹے بہنوئی وسیم کے ناصحانہ مشوروں کو خندہ پیشانی سے سنا اور اس کے مطابق اس معاملے میں ٹھنڈے دل ودماغ سے کام لینے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔ موبائل فون آف کرتے ہوئے کبیر احمد کے چہرے پر قدرے غصے اور بے زاری کے تاثرات تھے۔ چچی نویدہ نے اس کے خلاف چھوٹی بہن اور بہنوئی سے جو جھوٹی سچی باتیں مرچ مسالا لگا کر بیان کی تھیں اس سے کبیر احمد کا وقار مجروح ہوا تھا اور اسے توہین محسوس ہورہی تھی۔ وہ طبعاً راست باز اور سکون پسند مزاج کا حامل شخص تھا۔ اس کی شخصیت کو خراب کرتی' یہ اختلافی باتیں اور مسلسل اضطراب وانتشار میں مبتلا کرتی دروغ گوئی اب اس کے لیے ناقابل برداشت ہورہی تھی۔ کچھ دیر کوشش کے باوجود بھی جب وہ ذہنی دباؤ سے جان نہ چھڑا پایا تو اس نے سینٹر ٹیبل پر رکھے گلدان کو غصے میں اٹھا کر دیوار پر کھینچ مارا۔ پکی مٹی سے بنے خوب صورت گلدان کے ٹوٹنے سے ماحول ہلکے سے دھماکے سے گونج اٹھا اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر فرش پر بکھر گیا۔ برہم جذبوں کے کتھارس سے کبیر احمد کی طبیعت کا سکون قدرے بحال ہوا اور وہ سنجیدگی سے چچا چچی اور ان کی چہیتی بیٹی کی اختلافی روش کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگا۔

❀......❀......❀

تسکین بچوں سمیت تین دن تک اپنے ماں باپ کے گھر رکی رہی' اس دوران کبیر احمد کی دو مرتبہ جہلم میں سلیمہ باجی سے بات چیت ہوئی۔ بڑی بہن ہونے کی حیثیت سے انہوں نے کبیر سے بیوی کے ساتھ نااتفاقی کے بارے میں باز پرس کی۔ جواباً کبیر احمد نے گزشتہ چند ہفتوں سے تسکین کی خودسری اور من مانیوں کا سارا ماجرا سلیمہ باجی کے گوش گزار کردیا۔ سلیمہ باجی چچی چچا سے تسکین کی ساری شکایتوں کا احوال لے چکی تھیں۔ نرم لہجے میں اسے سمجھانے لگیں۔ ان کے بقول خانگی زندگی میں عورت مرد کی سربراہی میں اس کی ماتحت اور خدمت گار ہوتی ہے۔ اس لیے معاملات میں اونچ نیچ اور کسی طرح کی کوتاہی کر بیٹھتی ہے۔ لیکن مرد کو مرتبت اور تمام ذمہ داریوں کا حامل ہونے کی وجہ سے صورت حال کو سنبھالنا پڑتا ہے اور قدرے سختی کے ساتھ ساتھ

درگزر اور مصلحت آمیزی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ٹیڑھی پسلی کی جذباتی غلطیوں کو وہ فہم وفراست سے صحیح خطوط پر استوار کرتا ہے۔ اگر مرد بھی معاملات میں عورت کی مانند جذباتی اور غیر سنجیدہ رویہ اختیار کرلے تو گھر کی خوشیاں اور امن وسکون تباہ ہوجاتا ہے۔ لہٰذا کبیر احمد کو جذباتی انداز میں کوئی قدم اٹھانے کے بجائے پیار اور نرمی سے کام لینا ہوگا۔ سلیمہ باجی کی باتوں کے جواب میں کبیر احمد نے اپنے دفاع کے طور پر قدرے مزاحمت کا مظاہرہ کیا تاہم بڑی بہن کے مقام کی پاسداری کے خیال سے اسے چچا چچی کے تحفظات کو تسلیم کرنا پڑا اور سلیمہ باجی کی عزت کی خاطر یہ وعدہ کرنا پڑا کہ وہ آئندہ تسکین پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا اور اس کے ساتھ محبت' نرمی اور رواداری کا برتاؤ کرے گا۔ وہ سلیمہ باجی سے کھل کر یہ نہ کہہ سکا تھا کہ مرد بھی گوشت پوست کا انسان ہوتا ہے۔ اس کی قوت برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ ایک جھگڑالو عورت کو محض اپنی حدوں تک ہی چھوٹ دے سکتا ہے اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ کبیر احمد کی خاموشی سے سلیمہ باجی خوش اور مطمئن ہوگئیں۔ یوں اگلے روز تسکین اور بچے اس کے چھوٹے سالے مظفر کے ہمراہ کبیر احمد کے گھر میں داخل ہورہے تھے۔ مظفر انہیں چھوڑنے آیا تھا۔ اس طرح سلیمہ باجی کی ثالثی کی وجہ سے کبیر احمد اور تسکین کی خانگی زندگی کی گاڑی دوبارہ اپنی ڈگر پر رواں دواں ہوگئی۔

اگرچہ دونوں میاں بیوی پھر سے خاطر طبع اور باہمی معاونت کے احساس سے بندھ گئے تھے۔ تاہم اب کبیر احمد کے رویے میں ایک خاص تبدیلی عود کر آئی تھی۔ وہ تسکین کو کسی کام میں مشورے دینے سے گریز کرنے لگا تھا اور اس کی حیل وحجت آمیز باتوں کے سامنے چپ سادھ لیتا تھا۔ اکثر تسکین شیر خوار مہرین اور فرحان کے کاموں میں وہ کبیر احمد کے کھانے پینے اور دیگر ضروری کاموں کو نظر انداز کردیتی تو کبیر اس کی بے پروائی کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے خود سے اپنے کاموں کو نمٹا لیتا۔ اس لحاظ سے تسکین کو قدرے آزادی اور سہولت میسر آ گئی تھی کہ سلیمہ باجی کے بیچ میں پڑنے سے کبیر احمد نے بحث وتکرار اور اپنے تحکمانہ رویوں کو کسی قدر قابو میں کیا تھا جس سے تسکین کی انا بہت مطمئن نظر آنے لگی تھی۔ حالانکہ کبیر احمد کی سوچ وفکر کے مطابق تسکین کی یہ آزادی محض بچوں کی مرہون منت تھی۔ وہ محض مہرین اور فرحان کی دیکھ بھال اور ان کے آرام کے خیال سے تسکین کی کوتاہیوں کو درگزر کرتا تھا لیکن ایک روز تسکین نے اپنی حماقت اور کم عقلی سے کبیر احمد کے اس احساس ولحاظ کو بھی غارت کردیا۔

ایک شام کبیر احمد لیبارٹری سے ڈیوٹی آف کرکے لوٹا' لاؤنج میں داخل ہوتے وقت اس نے ننھے فرحان کو منہ بسورتے ابتر حالت میں دیکھا یوں جیسے تسکین اسے میلے وگندے کپڑوں میں کھیلتا چھوڑ کر بے پروا ہوگئی ہو۔ کبیر احمد نے محبت اور مشفقانہ لہجے میں فرحان کو چمکارا تو وہ تتلاہٹ اور معصومیت سے بولا۔

''ابوابو...... منی تو بتار ہورہا ہے۔'' کبیر نے غور کیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ بچہ کہہ رہا تھا کہ منی (مہرین) کو بخار ہوگیا ہے۔ اگلے لمحے تسکین کی غفلت اور عدم توجہی کا سوچ کر اسے غصہ آ گیا۔ تسکین نے مہرین کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں اسے موبائل فون پر بھی کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ یہ سوچتا ہوا وہ اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ تسکین کمرے میں پنگھوڑے میں روتی مہرین کو بہلا رہی تھی لیکن بچی متواتر روئے جارہی تھی۔ کبیر احمد کے استفسار پر

تسکین نے جھلاتے ہوئے بتایا کہ دست واسہال سے مہرین کی طبیعت سنبھلنے میں نہیں آرہی ہے اور وہ مسلسل روئے چلی جارہی ہے۔ کبیر احمد نے شیر خوار بچی کی پیشانی کو چھوا تو وہ تیز بخار سے تپ رہی تھی۔ موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اس نے مہرین کو جھولے سے گود میں لیا اور غصے سے برہم ہو کر تسکین سے بولا۔

تم کتنی سست عورت ہو تسکین اس کا آج مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ نجانے کب سے بچی کی حالت خراب ہے مگر تم نے مجھے اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا۔ سہل پسندی نے تمہیں نکما بنا دیا ہے۔ حتیٰ کہ تمہیں اس ننھی جان کا بھی احساس نہیں رہا۔ تف ہے تسکین تم پر۔'' اتنا کہہ کر کبیر احمد مہرین کو آغوش میں اٹھائے کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بچی کو سنبھالے تیز تیز قدموں سے قریبی پرائیویٹ کلینک کی جانب بڑھ رہا تھا۔ بیوی کی کم عقلی نے آج اس کے دل پر مزید ایک اور چرکا لگایا تھا۔

❀......❀......❀

''تم نے کیسے مجھے آرام پسند کہہ دیا' میں سارا سارا دن تمہارے بچوں کو سنبھالتی ہوں اور حال سے بے حال ہو جاتی ہوں لیکن تم مجھے ہی مورد الزام ٹھہراتے ہو۔ کیوں بھئی؟'' تسکین نے زچ ہو کر نخوت سے کہا۔ اس وقت کبیر احمد لاؤنج میں اس کی لن ترانیوں کو سنتے ہوئے بمشکل جذبات پر ضبط کیے ہوئے تھا۔ اس کے پہلو کے قریب تین برس کا فرحان ہچکیاں بھرتے ہوئے رو رہا تھا۔ کبیر احمد کا ہاتھ اس کے سر پر تھا۔ اور وہ بیوی کی منہ زوری کو برداشت کرتے ہوئے بچے کے سر کو محبت وشفقت سے سہلا رہا تھا۔ دراصل کچھ دیر پہلے فرحان گھر کی دہلیز کے باہر کھیلتے کھیلتے کچھ آگے سڑک کی جانب نکل گیا تھا۔ اس دوران کبیر احمد ڈیوٹی کر کے گھر پہنچا ہی تھا کہ وہ فرحان کو سڑک کی ایک جانب کھیل میں مگن دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پھر اس نے پر تشویش نظروں سے دیکھا تھا کہ ناگہانی حادثے سے بچاتے ہوئے ایک راہ گیر نے اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔ کبیر احمد نے تسکین کو اسی غفلت پر سرزنش کی تھی جس پر احتجاجاً اس نے دن بھر کی بچوں کے لیے اپنی ساری روداد سنا ڈالی تھی۔

''میں الزام نہیں دے رہا بلکہ تمہیں اس بات کا احساس دلا رہا ہوں کہ اگر بچے کو کوئی حادثہ پیش آجاتا تو تمہارا سارا آرام غارت ہو جاتا سمجھیں۔''

''بچے صرف میرے نہیں تمہارے بھی ہیں۔ میرے سکون کو برباد کر کے تم بھی چین سے نہیں رہ سکتے۔'' تسکین نے ترش روی سے جواباً کہا۔ اس کے زہر خند تیور پر کبیر احمد برہمی سے بولا۔

''اپنے لب ولہجے کو ٹھیک کرو تسکین' ورنہ میں بھی ایک حد تک ہی تمہارے نخروں کو برداشت کروں گا۔''

''جانتی ہوں تمہاری حدوں کو اس لیے تو یاد دلا رہی ہوں۔'' تسکین کے تنفر آمیز لفظوں میں سلیمہ باجی کے لیے اشارہ تھا۔ کبیر احمد بخوبی سمجھ رہا تھا کہ تسکین اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے مسلسل بحث وتکرار کر رہی تھی جس کا سبب محض سلیمہ باجی کی جانب سے حاصل ہونے والی وکالت اور حمایت تھی۔ اس وقت کبیر احمد نے خود کو بے بسی میں مبتلا محسوس کیا تاہم وہ مردانہ وقار سے تسکین کو باور کراتے ہوئے بولا۔

''سلیمہ باجی نے گھر کے سکون کے خیال سے تمہاری طرف داری کی تھی لیکن تم نے اسے اب تک نہیں سمجھا ہے۔ یاد رکھنا اگر تم نے مسلسل اسی ناسمجھی کا رویہ رکھا تو میں کوئی بھی فیصلہ کرنے میں کسی طرح کا فروگزاشت نہیں رکھوں گا۔ یہ بات خوب سمجھ لو تسکین۔''

''میں کیوں سمجھوں کبیر! بلکہ تمہیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر تمہیں بچوں کی اچھی دیکھ بھال اور ان کے آرام وصحت کی فکر ہے تو ان کے لیے گھر میں ملازمہ رکھ لیں۔ اب مجھ سے تمہارے روز روز کے گلے شکوے سننے کی تاب نہیں ہے۔ اس طرح ملازمہ کے آنے سے تمہاری خواہش کے مطابق دونوں بچوں کو گڈ گورننس مل جائے گی۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں کبیر۔'' تسکین نے طمطراق انداز میں کہتے ہوئے یوں کبیر احمد کی جانب دیکھا گویا اس نے شوہر کو لاجواب کر دیا ہو۔ اور یہ کہ اب کسی بحث وتکرار کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ کبیر احمد نے اس کی تند وتیکھی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے چند لمحے سوچا اور پھر سرد مہری سے کہا۔

''تم یہ نہیں مانو گی کہ گھر اور بچوں کے سکون کے لیے خود تمہارا سنجیدہ اور بردبار ہونا ضروری ہے۔ لیکن میں اس کے باوجود ملازمہ رکھ کر دیکھ لیتا ہوں' کہ شاید تمہاری موجودگی میں گھر اور بچوں کا سکون مجھے میسر آجائے۔'' اتنا کہہ کر کبیر احمد نے فرحان کو پچکارتے ہوئے مشفقانہ نگاہوں سے دیکھا اور صوفے سے اٹھ کر اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے عقب میں کھڑی تسکین کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ وہ سلیمہ باجی کے کندھے پر بندوق رکھ کر کبیر احمد کو ڈرانے یا دھمکانے سے خوب آشنا ہو چکی تھی اور اس کے رعب ودبدبے میں آئے بغیر اپنی باتوں سے اسے تگنی کا ناچ نچانے پر مجبور کر سکتی تھی' وہ کوئی بیوی نہیں' ماں نہیں بلکہ محض عورت تھی' جسے اپنی انا اور رعب ودبدبہ عزیز تھا۔

❀......❀......❀

کبیر احمد نے ناعاقبت اندیش بیوی کی خواہش پر بچوں کی دیکھ بھال کی غرض سے ایک ملازمہ رکھ لی تھی۔ یہ ایک غریب جوان عورت تھی۔ جو تین چار گھروں میں جز وقتی کام کر کے روزانہ کی اجرت سے گزر بسر کرتی تھی۔ کبیر احمد نے اسے آٹھ سے دس گھنٹوں کے لیے ملازمہ رکھ لیا تھا۔ اور دو وقت کے کھانے اور کپڑے لتے کی سہولت کے ساتھ اچھی تنخواہ مقرر کی تھی۔ ملازمہ جس کا نام نصیبو تھا کبیر احمد کے بچوں کی رکھوالی پر فوراً راضی ہو گئی تھی اور اگلے دن سے وہ اپنے کام پر لگ گئی تھی۔ ادھر تسکین کو بھی حکمرانی کا شوق پورا کرنے کے لیے ایک نوکرانی مل گئی تھی۔ چند دنوں تک نصیبو گھر میں بچوں کی دیکھ بھال کا کام کرتی رہی تاہم کبیر احمد کی توقع کے مطابق وہ تسکین کے نخروں اور چرب زبانی سے تنگ آکر نوکری چھوڑ کر چلی گئی۔ اس نے کوئی ہفتے بھر کام کیا تھا لیکن محض تسکین کے طعنوں تشنوں سے دل برداشتہ ہو کر اس کام کے پیسے بھی نہیں لے کر گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد کبیر احمد نے دوسری ملازمہ بھی رکھی تھی لیکن وہ بھی تسکین کی بدزبانی سے کان پکڑتی کام چھوڑ گئی۔ اب گھر کے حالات اور بچے تسکین کے رحم وکرم پر آگئے تھے۔ جس کی وجہ سے کبیر احمد دوبارہ بے سکون ہو گیا تھا۔ تسکین کی اختلافی روش کے بارے میں وہ دن بھر پریشان رہتا اور اس کا کوئی مناسب حل نہ پا کر بے بسی سے سر پکڑے بیٹھا رہ جاتا۔ دوسری جانب تسکین شوہر کی عاجزی اور کم مائیگی سے لطف اندوز ہوتی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے فتح مندی کے غرور سے کبیر احمد کی مردانہ فہم وفراست اور دانش مندانہ چالوں کو ناکام بنا دیا تھا اور اس کی مدبرانہ سوچوں کو بری طرح زچ کر دیا تھا۔

ایک دن کبیر احمد لیبارٹری کے ٹرانسپیر نٹ چیمبر میں اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ تسکین کا قضیہ اس کے لیے یوں جنجال بن گیا تھا کہ وہ کام کرتے ہوئے ذہنی طور

پرڈسٹرب ہوجاتا تھا اور پریشان کن کیفیت میں سوچ بچار کرنے لگتا تھا۔ اس وقت بھی کبیر احمد بیوی کی موشگافیوں کو سلجھانے کی دردسری میں مبتلا نظر آتا تھا۔ اضطراب سے اس کے چہرے پر قنوطیت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس وقت شعبے کے کنسلٹ پروفیسر ڈاکٹر متین الرحمٰن اپنی ریوالونگ چیئر پر موجود نہیں تھے۔ ورنہ ان کے استفسار پر کبیر احمد کو خجالت آمیز شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کی میز پر کچھ نشان زدہ سلائیڈیں اپنے حتمی نتائج کی وجہ سے ادھوری پڑی تھیں لیکن کبیر احمد ان کی جانب بھی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اس نے بوجھل ذہن سے ایک گہری سانس کا ہلکورہ لیا۔ پھر میز کی دراز سے ایک چھوٹا سا باکس نکالا۔ اس میں کنفیکشنری کی متفرق چیزیں جن میں ٹافیاں، کینڈیز، سونف سپاری، وغیرہ شغل کے لیے موجود تھیں۔ کبیر احمد نے باکس میں سے تین چار چیونگم نکالے، ڈبا واپس دراز میں رکھا، پھر چیونگم چباتے ہوئے نامکمل سلائیڈوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس وقت گلاس روم میں آویزاں وال کلاک میں تین بج رہے تھے۔ ایئر کنڈیشنڈ ہونے کی وجہ سے گلاس روم کا ٹھنڈا ماحول یکسوئی اور ذہن کو جلا بخشتا محسوس ہورہا تھا۔

کبیر احمد کو اپنے کام میں منہمک ہوئے کوئی دس ایک منٹ گزرے تھے کہ اسی اثناء میں گلاس روم کا دروازہ کھلا اور پختہ عمر اور سوٹڈ بوٹڈ شخص اندر داخل ہوا۔ یہ محکمہ ریلوے کے لوگیج ڈپارٹمنٹ کے انچارج ابوریحان صاحب تھے۔ دو دن پہلے انہوں نے اپنی بیگم کا شوگر ٹیسٹ کروایا تھا اور اس کی رپورٹ لینے کی غرض سے آئے تھے۔ کبیر احمد نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ ابوریحان کو خوش آمدید کہا۔ ابوریحان نے عینک درست کرتے ہوئے اس کی گرم جوشی کا جواب دیا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے حسب ذوق منہ میں پان دبایا ہوا تھا۔ پھر وہ نہایت خوش گلوئی سے پان چباتے ہوئے اپنی بیگم کی رپورٹس کے بارے میں استفسار کرنے لگے۔ میز کی دوسری جانب کبیر احمد نے توجہ سے ابوریحان صاحب کا مدعا سنا، اسے ابوریحان کے انداز تکلم سے پان کی مخصوص تیز خوشبو کا بھپکا سانسوں میں اترتا محسوس ہورہا تھا۔ اس کے دل و ذہن ناگواری سے کلبلا رہے تھے اور وہ اپنے فرائض منصبی کی وجہ سے ابوریحان کی خوشبودار پوچھ پاچھ کو برداشت کرتے ہوئے موصوف کی جانب دیکھ رہا تھا۔

ریلوے ڈپارٹمنٹ کے افسر مجاز کی بات مکمل ہوئی تو جواباً کبیر احمد نے خوش اخلاقی سے رپورٹس کی بابت مطلع کیا کہ مطلوبہ رپورٹس ابھی تیار نہیں ہیں، تاہم اگلے روز لنچ ٹائم سے پہلے انہیں یہ رپورٹس دستیاب ہوجائیں گی۔ اس کی وضاحت سن کر ابوریحان نے ہونکاری بھرتے ہوئے سر ہلایا اور کہا کہ وہ بیگم کی رپورٹس کے لیے کل دوبارہ لیبارٹری آجائیں گے پھر انہوں نے رخصت ہوتے ہوئے کبیر احمد سے مصافحہ کیا۔ اور گلاس روم سے باہر نکل گئے۔

کچھ دیر تک ابوریحان کے پان کی مہک کبیر احمد کے حواس پر چھانے لگی تو اس نے ایئر فریش سے میز کے آس پاس اسپرے کرکے سانسوں کو بحال کیا۔ اور دوبارہ سے اپنے کام کی جانب متوجہ ہوگیا، لیکن ابھی دو منٹ گزرے تھے کہ اس کے موبائل فون کی ٹون بجنے لگی۔ اس نے ذرا توقف سے اسکرین کو دیکھا۔ تسکین نے اسے گھر سے میسج بھیجا تھا۔ اس نے ناپسندیدگی کے جذبات سے بیگم صاحبہ کا میسج پڑھا، لکھا تھا۔ 'کبیر، صبح روانہ ہوتے وقت آپ سے نئی ملازمہ رکھنے کی بات یاد دلائی تھی، اس کا کیا بنا؟''

بلائے جان بیوی کا یہ تحکمانہ جملہ پڑھ کر کبیر احمد نے غصہ ضبط کرتے ہوئے بے زاری سے سر تھام لیا۔ پھر چند لمحوں تک دل جلے جذبوں سے سوچتا رہا تسکین کی خودسری اس کے لیے عذاب بنتی جارہی تھی۔ پھر کبیر احمد نے جوابی میسج لکھ کر بھیج دیا۔ اس نے بیوی کو سرزنش کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''بھاڑ میں گئی نئی ملازمہ، پہلے اپنا دماغ درست کرو۔ کیونکہ تمہاری بدزبانی کی وجہ سے وہ بھی کام چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔'' بیوی کی بے وقت کی راگنی سے کبیر احمد کا موڈ آف ہوگیا تھا۔ اس نے ذہن کو ہلکا پھلکا کرنے کے خیال سے دوسرا نیا چیونگم منہ میں رکھ لیا اور چباتے ہوئے سوچنے لگا۔ بیوی کو میسج ڈاؤن لوڈ کرتے وقت ایک پرخیال سوچ اس کے دماغ میں جھماکے سے آئی تھی۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا کہ تسکین کی اختلافی روش کے پیچھے شاید کوئی دوسرا شخص کارفرما تھا۔ جو محض کبیر احمد کے گھر کے سکون کو برباد کرنے کی غرض سے تسکین کو ورغلا رہا تھا اور اس کے خلاف بھر رہا تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ سے تسکین نے اپنے اختلافی طرز عمل سے اور خودسرانہ من مانیوں سے کبیر احمد کی طبیعت کو برانگیختہ کرکے رکھ دیا تھا اور اس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ذہنی تناؤ اور اضطراب میں رہنے لگا تھا۔ چیونگم چباتے ہوئے وہ پرسکوت ماحول میں غور و خوض کرنے لگا کہ وہ مہیب اور رذیل دشمن کون ہوسکتا تھا؟ اس کی چچی اور ساس نویدہ بیگم کا رویہ بیٹی پر ہاتھ اٹھانے کے واقعے کے بعد سے کبیر احمد کے ساتھ قدرے تلخ اور شاکی ہوگیا تھا ممکن تھا کہ تسکین ان کی سکھائی باتوں اور طور طریقوں پر عمل کررہی ہو اور ماں بیٹی کا مقصد اسے اپنے سحر میں مبتلا کرکے اس پر غلبہ پانا ہو اور اپنی مرضی سے کسی جانور کی مانند ہانکنا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ دوسرا شخص کوئی اور ہو جسے محض تسکین جانتی ہو اور جو اس کی عدم موجودگی میں گھر میں آتا جاتا رہا ہو یا پھر وہ سوچنے لگا کہ کسی طریقے سے اسے یہ ادراک ہوجائے کہ اس کی غیر موجودگی میں تسکین کی کیا سرگرمیاں رہتی ہیں اور گھر میں کون کون آتا جاتا ہے؟ تاہم وہ کچھ دیر سوچ کر حسرت و مایوسی سے گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اندازاً پندرہ بیس منٹ بعد کبیر احمد کے باقی ماندہ کام نمٹانے کے دوران پروفیسر متین الرحمٰن گلاس روم میں داخل ہوئے۔ وال کلاک میں ساڑھے تین بج رہے تھے۔ کبیر احمد نے مرتب کردہ آج کی رپورٹس پر متین الرحمٰن سے دستخط کروائے۔ پروفیسر اور اس کے درمیان کچھ پرلطف جملوں کا تبادلہ ہوا۔ حسب عادت کبیر احمد نے خوش طبعی سے پروفیسر صاحب کو لاجواب کردیا تھا۔ پھر ڈاکٹر متین الرحمان ڈیوٹی آف کرکے چلے گئے، ابھی چار بجنے میں کچھ وقت تھا۔ کبیر احمد دستخط شدہ رپورٹس کو سرسری انداز میں دیکھ رہا تھا۔ ان میں ابوریحان کی بیگم کی رپورٹ بھی شامل تھی۔ جنہیں اس نے کل لنچ سے پہلے آنے کا کہا تھا۔ وہ شخصیت کے لحاظ سے ایک دلچسپ آدمی تھے۔ کبیر احمد رپورٹ ہاتھ میں لیے چند لمحے سوچتا رہا پھر وہ اپنے سانسوں پر گراں بار ہوتی پان کی تیکھی خوشبو محسوس کرنے لگا۔ وہ چونک کر وال کلاک کی جانب دیکھنے لگا۔ چار بجنے میں محض پانچ منٹ باقی تھے۔ اس نے رپورٹس کو اپ ڈیٹ کرتے ہوئے فائل کیا۔ میز کے اضافی سامان کو سمیٹنے کے دوران اسے نجانے کیوں ابوریحان کا خیال خواہ مخواہ ستا رہا تھا۔ ان سے معمول کی بات چیت ہوئی تھی لیکن پھر بھی کبیر احمد چیونگم چباتے ہوئے ذہنی انتشار محسوس کررہا تھا۔ اسے لگا کہ جیسے دماغ کی سوئی ایک نقطے پر اٹک گئی ہو۔ کبیر احمد کھلی آنکھوں سے اپنے قرب و جوار کو دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کے دماغ کے پردہ اسکرین پر ایک منظر آشکار ہورہا تھا۔ محکمہ ریلوے کے

افسر ابوریحان اپنی آلٹو اسٹینڈرڈ کار میں گامزن دکھائی دے رہے تھے۔ جسے چشم تصور حیرت و تعجب سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ یہ صاحب یہاں کیوں نظر آرہے ہیں؟ کبیر احمد نے سر جھٹکتے ہوئے خود کو سرزنش کی۔ کہ یہ کیا پاگل پن ہے! دفعتاً اسے یہ خیال گزرا کہ ابوریحان لیبارٹری میں دوبارہ پہنچے ہیں اور کچھ دیر میں گلاس روم میں داخل ہوں گے۔ یہ خاصا احمقانہ احساس تھا' لیکن اگلے لمحے کبیر احمد اپنی جگہ انگشت بدنداں رہ گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے گلاس روم کا دروازہ کھلا اور ابوریحان پان چباتے ہوئے اندر داخل ہورہے تھے۔ پھر وہ باوقار قدموں سے چلتے ہوئے میز کے قریب آئے اور خوش گفتاری سے بولے۔ ''کبیر میاں ایک بھول ہوگئی تھی اس لیے دوبارہ آیا ہوں۔''

ادھر کبیر احمد پھٹی پھٹی آنکھوں سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ ابوریحان کے بھوت کو دیکھ رہا ہو۔ وہ خلاف توقع ابوریحان کو اپنے سامنے موجود پاکر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ یہ بالکل مافوق الفطرت بات محسوس ہوتی تھی کہ اس کی سوچ کے دھارے کے ساتھ وہ کمرے میں وارد ہوئے تھے۔ ابوریحان کے توجیہہ جملے پر کبیر ہڑبڑا کر چونکتے ہوئے بولا۔ ''کیا بات ہوگئی ہے جناب؟ فرمایئے' میں حاضر ہوں۔''

''بات یہ ہے کہ کل میں رپورٹ لینے کے لیے لنچ ٹائم سے پہلے تو نہیں آسکوں گا۔ دوم کل ہاف ڈے بھی ہے۔'' یہ کہہ کر ابوریحان نے ذرا توقف کیا پھر بولے۔ ''اس لیے میرا ٹھیک دو دن بعد لیبارٹری آنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے جناب جیسے آپ کی مرضی۔ میں نے محض آپ کی سہولت کے لیے لنچ ٹائم سے پہلے کا وقت بتایا تھا۔'' جواباً کبیر احمد نے چیونگم چباتے ہوئے خوش اخلاقی سے کہا۔ وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ ابوریحان صاحب کی بیگم کی رپورٹ تیار ہوچکی ہے اور کیبنٹ کی دراز میں موجود ہے تاہم یہ ایک غیر اصولی بات تھی کہ وہ وقت سے پہلے ابوریحان صاحب کو رپورٹ دیتا۔ دوسری جانب اس کا جواب سن کر عینک ٹھیک کرتے ہوئے ابوریحان نے تھینک یو کہتے ہوئے ہاتھ ملایا اور باہر کی جانب پلٹ گئے۔

ان کے عقب میں کبیر احمد چیونگم چباتے ہوئے حیرت و تعجب سے اس ناقابل فہم قضیے میں مبتلا نظر آرہا تھا کہ ابوریحان اس کی چشم تصور کے عین مطابق اس کے سامنے کیونکر آموجود ہوئے تھے۔ وہ لیبارٹری کا ایک قابل اور تجربے کار ایگزامنر تھا' کسی مادے میں کیمیائی عناصر کے اتصال' ردعمل اور اثرات سے بخوبی آگاہی رکھتا تھا۔ اور اسے ادراک حاصل تھا کہ انسانی ظن و تخمین کو متاثر کرنے والی Attractin جسے وہ عناصر اور مرکبات کی کیمیائی زبان میں ''قوت جاذبہ'' کا نام دیتا تھا' آدمی کی حسیات میں کس کس نوع کے ذہنی و قلبی سوچ کے غیر منطقی اور پرفریب زاویے بناتی ہے۔ اس کے خیال کے مطابق ایسی قوت جاذبہ کے عناصر انسانی ذہن کے لیے بظاہر سکون آمیز اور لطف انگیز ہوتے ہیں تاہم نفسیات کے لحاظ سے اسے حقیقت سے دور کسی دلفریب اور ماورائی دنیا میں کھینچ کر لے جاتے ہیں اور اسے اپنے گردوپیش کا ہوش باقی نہیں رہتا۔

اب کبیر احمد اول سے آخر تک ابوریحان کی پراسرار نشست و برخاست کا تجزیہ کرنے لگا۔ پہلی بار آمد کے موقع پر ان سے جو گفتگو ہوئی تھی اس میں ایسی کوئی غیر معمولی بات نہ تھی محض اس کے علاوہ ان کے جانے کے بعد ان کے پان کی تیز خوشبو کچھ دیر تک ناگواریت کا احساس دلاتی رہی تھی۔ ایئرفریش سے اسپرے کرنے کے بعد کبیر احمد نے تسکین کے ایس ایم ایس کا جواب سینٹ کیا تھا۔ پھر اس نے رپورٹس تیار کی تھیں۔ ڈاکٹر متین الرحمان سے دستخط کروائے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد وہ اپنی میز پر چند منٹ فائلنگ میں مشغول رہا تھا۔ ان تمام کاموں کے دوران اس کے دل و ذہن نے اس کی قوت تخیل سے گٹھ جوڑ کرکے ابوریحان کے خاکے کھینچنا شروع کردیئے تھے۔ اچانک کسی خیال سے کبیر احمد یوں ہڑبڑایا گویا اس خیال نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کوئی بات یاد دلائی ہو۔ اگلے لمحے اس نے منہ سے چیونگم کی بال نکال کر ہتھیلی پر رکھ لی اور حیرت و تعجب سے اسے ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔ ابوریحان کی آمد کے وقت اس کے منہ میں چیونگم تھی پھر تسکین کو میسج بھجوانے کے بعد ذہن کو ہلکا پھلکا کرنے کی غرض سے دوسرا چیونگم بھی منہ میں رکھا تھا۔ ہتھیلی پر موجود چیونگم کی بال دونوں کی مخلوط اکائی تھی۔ جسے وہ محض شغل کے طور پر چوستا رہا تھا۔ پہلے چیونگم میں ابوریحان کی بات چیت کی قوت جاذبہ شامل تھی' جس میں پان کی مہک موجود تھی۔ جبکہ دوسرے چیونگم میں اس کی اپنی قوتِ ذائقہ نے سوچ و فکر کو چشم تصور سے یوں مخلوط اور مشغول کیا تھا کہ وہ غیر موجودگی کے باوجود ابوریحان کو ذہن کے پردے پر آشکار کررہا تھا۔ یہ چیونگم کے چوسنے کی خاصیت تھی کہ ابوریحان لیبارٹری سے دور کہیں موجود تھے لیکن کبیر احمد کا دماغ اپنی کرسی پر ان کی موجودگی سے باخبر تھا۔ چیونگم میں پان کی مہک اس کے لاشعور کو پرخفیف سگنل پہنچارہی تھی اور سوچ کے زاویوں نے منظر کشی کرکے یہ بات اسے قبل از وقت بتادی تھی کہ ابوریحان دوبارہ گلاس روم میں داخل ہونے والے ہیں۔ کبیر احمد نے چیونگم کی گیند کو پرمعنی نظروں سے چند لمحے دیکھا۔ یہ گیند فروٹ ایپل موبائل سے کم نہیں تھی اور جذب کرنے کی قوت کی وجہ سے جاسوسی کا بہترین ذریعہ ثابت ہوسکتی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے یکبارگی کبیر احمد کے ذہن میں کسی خیال سے کوندا سا لپک گیا اور جوش و جذبات سے چہرہ تمتما اٹھا۔ آج تسکین کا ایس ایم ایس پڑھتے ہوئے اسے پہلی بار بیوی کی مخبری کی ضرورت کا احساس ہوا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں وہ سارا سارا دن کون سی سرگرمیوں میں مصروف رہتی تھی اور گھر میں اس سے ملنے جلنے کون آتا جاتا تھا۔ اس قسم کے الجھن آمیز سوالات کے جواب کے لیے یہ چیونگم کی گیند عمدگی سے اپنا کام انجام دے سکتی تھی اور تسکین کی اخلاقی روش کے حوالے سے اس کی مشکلات کو ختم کرسکتی تھی۔ اس خوش گوار خیال سے کہ اب وہ ناخلف اور خود پسند بیوی کا دماغ درست کرنے کا طریقہ سوچ چکا تھا۔ وفور مسرت سے اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی اور اس نے خوشی سے مسکراتے ہوئے چیونگم کی گیند کو بے اختیار چوم لیا۔

❀......❀......❀

اگلے دن ہاف ڈے تھا۔ کبیر احمد نے معمول کے کاموں کو جلد از جلد نمٹایا اور کرسی سے اٹھ گیا۔ پھر اس نے طے شدہ پروگرام کے تحت مارکیٹ سے بچوں کے لیے کچھ خریداری کی اور گھر کی جانب موٹر سائیکل بڑھادی۔ تقریباً دس پندرہ منٹ بعد وہ گاڑی پرسبک خرامی سے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا وہ گلی میں داخل ہوا تھا اور چند گز کے فاصلے پر تھا کہ دفعتاً وہ چونک پڑا۔ اس نے بریک لگایا اور موٹر سائیکل جھٹکا کھاتی اپنی جگہ رک گئی۔ اس کی نگاہوں کے مقابل اس کے مکان کا بیرونی دروازہ کھلا تھا اور کوئی خاتون سینے پر دوپٹہ درست کرتی' ایک نو دس سالہ بچے کو ساتھ لیے باہر آرہی تھی۔ پھر وہ جوان عورت چلتی ہوئی کچھ آگے آئی تو کبیر احمد نے اسے پہچان کر فوراً اپنا رخ دوسری جانب

پھیرلیا۔ عورت بچے کے ہمراہ چلتی ہوئی اس کے قریب سے گزری اور چند لمحوں بعد گلی سے نکل گئی۔ ادھر کبیر احمد حیرت وتذبذب سے سوچوں میں مبتلا ہوگیا تھا۔ وہ عورت اس کے چھوٹے بہنوئی وسیم کی تایازاد بہن تہمینہ تھی۔ تہمینہ اپنے بھائی بہن کے لحاظ سے سب سے بڑی تھی۔ کبیر احمد کو یہ بات یاد آ گئی تھی کہ اس کے والد ظہیر احمد کی زندگی میں تہمینہ کا رشتہ چچا ذکاء اللہ کے سب سے بڑے بیٹے ظفر اللہ کے لیے ان کے والد اورنگ زیب خان نے بھجوایا تھا۔ چچا نے اس کے والد سے تہمینہ کے رشتے پر باہمی مشاورت کی تھی۔ اس وقت اورنگ زیب خان کے غیر موزوں خاندانی حالات کے پیش نظر چچا ذکاء اللہ نے اس رشتے کے لیے منع کروادیا تھا۔ ان کے انکار کا اورنگ زیب نے بہت برا منایا تھا اور کبیر احمد کے خاندان سے ہر قسم کے تعلقات ختم کر لیے تھے۔ بعد میں نویدہ چچی کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ اورنگ زیب نے اپنی بڑی بیٹی تہمینہ کا رشتہ اپنے سسرالی رشتہ داروں میں طے کردیا ہے۔ تہمینہ کا شوہر سفیان علی پیشے کے لحاظ سے بس ڈرائیور تھا۔ شادی کے بعد سفیان علی سے تہمینہ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئے تھے۔ بعد ازاں حالت مدہوشی میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے سفیان علی کی بس کا ٹرالر سے تصادم ہوا تھا اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا تھا۔ یوں تہمینہ جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی۔ اس کے والد اورنگ زیب کا مکان وسیم اور زینت کے گھر کے قرب وجوار میں ہی تھا۔ تہمینہ باپ کے اصرار کے باوجود ٹنڈ وآدم جانے کے بجائے اپنے مرحوم شوہر کے مکان میں رہی اور دوسری شادی کرنے کے بجائے خود اپنی مدد آپ کی تحت تینوں بچوں کی کفالت کرنے لگی۔ اس بات کو تقریباً دو برس گزر گئے تھے۔ اس لیے کبیر احمد اتنے عرصے بعد تہمینہ کو دیکھ کر حیرت میں مبتلا ہوگیا تھا۔ دوم وہ سوچ رہا تھا کہ یہ قرین قیاس بات تھی کہ دیرینہ خاندانی مخالفت کی وجہ سے تسکین کو کبیر احمد کے خلاف اکسانے والی تہمینہ ہی ہو اور وہ تسکین کا گھر برباد کرنے کی کوشش کررہی ہو محض اس وجہ سے کہ چچا ذکاء اللہ نے اس کے والد ظہیر احمد سے باہمی مشورے کے بعد بیٹے کے لیے اس کا رشتہ قبول کرنے کی بجائے واپس بھجوایا تھا۔ چند منٹوں کے تجزیے نے تہمینہ کی آمد کو کبیر احمد کی نظروں میں مشکوک بنادیا تھا۔ اگلے لمحے اس نے نہایت سرعت اور تیزی سے موٹر سائیکل کو ٹرن دیا اور تہمینہ کا پیچھا کرنے کے ارادے سے برق رفتاری سے گلی سے باہر نکل آیا۔ پھر مین روڈ پر اس کی کھوجتی نگاہوں نے کچھ فاصلے پر ایک رکشے کے قریب کھڑی تہمینہ کو جالیا۔ اس نے دیکھا کہ تہمینہ اپنے بیٹے کے ہمراہ رکشے میں بیٹھی تھی۔ قدرے فاصلے سے تہمینہ کے تعاقب میں چل پڑا تھا۔ اندازاً پندرہ بیس منٹ تک کبیر احمد رکشے کے پیچھے پیچھے موٹر سائیکل سبک روی سے چلاتا رہا۔ آخر میں رکشہ ایک ذیلی سڑک میں داخل ہوا اور ایک رہائشی پلازہ کے قریب رک گیا۔ کبیر احمد نے پلازہ کے کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل روک لی اور اسے یوں سرسری نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ تہمینہ کے بجائے اس رہائشی کالونی کا جائزہ لے رہا ہو۔ تہمینہ اس کی موجودگی سے بے پروا تھی۔ اس نے کرایہ دینے کے بعد دوپٹے کو درست کیا اور کم سن لڑکے سے کچھ کہتی ہوئی پلازہ کے صدر دروازے میں داخل ہوئی اور نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ادھر کبیر احمد نے موٹر سائیکل کو آگے بڑھایا اور پلازہ کے قریب پہنچ گیا۔ اب وہ الجھن سے یہ سوچ رہا تھا کہ تہمینہ کا فلیٹ دیکھنے کی غرض سے اوپر جائے اور اس سے کیونکر ملاقات کرے؟ یوں اچانک کبیر احمد کو دیکھ کر وہ عین ممکن ہے کہ اس سے بات چیت پر

آمادہ نہ ہو۔ وہ چند منٹ تک سوچتا رہا، دفعتاً اس کی نگاہ سڑک پر پڑی۔ اگلے لمحے اس نے قدرے جھک کر اس جھلملاتی شے کو اٹھالیا۔ وہ ایک وزیٹنگ کارڈ تھا۔ کبیر احمد نے اس کارڈ پر تحریر نام پڑھا، زیب لب "تہمینہ بیوٹی ایکسپرٹ" دہراتے ہوئے اس کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا تھا۔ وہ کارڈ تہمینہ کے بیوٹی پارلر کا تھا جو رکشے والے کو کرایہ دیتے وقت جلد بازی میں اس کے بٹوے سے گر گیا تھا۔ کبیر احمد نے کارڈ پر درج شاپ اور فلیٹ نمبر کو دیکھا اور اسے جیب میں رکھ لیا پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے موٹر سائیکل کو موڑا اور ذیلی سڑک سے واپس گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔

❀......❀......❀

کبیر احمد سٹنگ روم میں دونوں بچوں کو لیے بیٹھا تھا۔ چھٹی کے دن اس کا یہ معمول تھا کہ وہ سارا دن گھر میں بچوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ ایک بج چکا تھا، تسکین نے فرحان اور شیر خوار مہرین کو اس کے پاس چھوڑا تھا اور دوپہر کے کھانے کی تیاری کے ارادے سے کچن کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اس کے بار بار اصرار کے باوجود کبیر احمد نے ملازمہ کا قضیہ حل نہیں کیا تھا۔ کھانے پکانے اور بچوں کے کام کو کرتے ہوئے اس پر جھلاہٹ سوار ہوجاتی تھی اور وہ خودسری اور نخروں سے چیزوں کو پٹخ پٹخ کر غصے کا اظہار کرنے لگتی تھی۔ اس کی منہ زور بے بسی دیکھ کر کبیر احمد خفیف انداز میں دل جلے جذبوں سے زیرلب مسکرا دیتا۔ حالانکہ وہ طبعاً گھر گرہستی میں ساتھ نبھانے والا ایک معاون ومددگار شوہر تھا۔ لیکن تسکن نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے اس کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ بہرغرض اس کے کچن جانے کے بعد کبیر احمد نہایت خوش دلی سے دونوں بچوں کو بہلا رہا تھا اور دل جوئی کرتے ہوئے خود بھی پسرانہ جذبوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ مہرین اس کی گود میں قلقاریاں مار رہی تھی اور فرحان چابی کے گھوڑے کے ہنہنانے سے چہکتے ہوئے بار بار اسے متوجہ کررہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد کبیر احمد نے مہرین کو صوفے پر لٹادیا۔ فرحان بھی کھلونے کے ساتھ مشغول ہوتا کارپٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اسے کچھ فراغت میسر آئی تو اس نے والٹ سے تہمینہ کا وزیٹنگ کارڈ نکالا اور اس پر درج موبائل فون نمبر کو دیکھتے ہوئے اپنے طے شدہ منصوبے کے بارے میں غور وخوض کرنے لگا۔ قریب کچن سے تسکین برتنوں سے کھٹ پٹ کرتی اس کی سماعتوں کو برانگیختہ کررہی تھی اور اس کے دل کو جلا رہی تھی۔ کبیر احمد نے تہمینہ کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب چند لمحے کالنگ ٹون بجتی رہی پھر اسے تہمینہ کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو، ہیلو......کون بول رہا ہے؟"

"میں ظفر بات کررہا ہوں" جواباً کبیر احمد نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے تسکین کے بھائی کے طور پر اپنا تعارف کروایا۔ لمحاتی توقف کرتے ہوئے تہمینہ کی چونکتی آواز دوسری جانب سے گونجی۔

"ظف......ظفر کون؟ میں آپ کو نہیں جانتی۔"

"آپ ذکاء اللہ کے بیٹے کو بھول رہی ہیں تہمینہ جی!" کبیر احمد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔......

"اوہ......یعنی آپ تسکین کے بھائی ظفر بول رہے ہیں۔" تہمینہ کی حیرت دوچند تھی پھر وہ ماضی کی تعلق داری کو یاد کرکے قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔

"مجھے حیرانی ہو رہی ہے ظفر بھائی! خیریت تو ہے آپ نے کیسے فون کیا؟"

"تہمینہ جی! آپ مجھے ظفر اللہ کہہ کر مخاطب کرسکتی ہیں۔" کبیر احمد نے زچ ہوکر اسے ٹوکا اور دل آویز لہجے میں بولا۔

"آپ نے کیا تسکین پر سحر کردیا ہے کہ وہ آپ کی

تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے نہیں تھکتی ہے۔ یقین نہیں کریں گی لیکن یہ دل کی بات ہے کہ اس کی باتیں سن کر آپ سے ملاقات کا اشتیاق بڑھ گیا ہے۔'' کبیر احمد کی اداکاری لاجواب تھی۔

''اس تعریف کا شکریہ جی۔ تسکین خود بھی تو اچھے اخلاق والی ہیں۔ بہت سلجھی ہوئی اور رکھ رکھاؤ کا لحاظ رکھتی ہیں۔'' تہمینہ کی آواز میں حیا آمیز خوشگواری کا تاثر تھا۔ کبیر احمد دل ہی دل میں اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پھر وہ منکسر المزاجی سے درخواست کرتے ہوئے بولا۔

''تہمینہ جی! میں اس لیے آپ سے ملنے کا خواہش مند ہوں۔ اور آپ کے دولت کدے پر حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ پلیز انکار مت کیجیے گا۔'' کبیر احمد کی لگاوٹ بھری انکساری سے متاثر ہو کر تہمینہ خوشگواری سے مسکراتے لہجے میں بولی۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ پانچ بجے کے بعد میرے گھر آجائیں۔ پتا میں بتائے دیتی ہوں۔'' اتنا کہہ کر تہمینہ نے چند لمحے توقف کیا اور پھر گھر کے ایڈریس سے کبیر احمد کو آگاہ کیا۔ آخر میں رابطہ منقطع کرتے وقت کبیر احمد نے لجاجت آمیز عاجزی سے اللہ حافظ کہا تھا۔ دوسری جانب تہمینہ کے تنفر بھرے چہرے پر کسی ناآسودہ جذبے کے احساس سے تمازت ہویدا تھی۔ موبائل فون آف کر کے کبیر احمد نے جہاندیدہ نظروں سے کچن کی جانب دیکھا جہاں تسکین دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ کچن کے برتنوں کو بھی کھٹ پٹ کرتے قدرے قرار آ گیا تھا۔ اس نے چند لمحے سوچا یہ ممکن تھا کہ تہمینہ کچھ دیر بعد تسکین کے موبائل فون پر کال کرے اور اسے ظفر کی خواہش سے مطلع کرے۔ اس بات سے تسکین کے ساتھ تہمینہ کی انوالمنٹ کا اسے ثبوت مل جاتا۔

اس خیال سے کبیر احمد کچھ دیر انتظار کرتے ہوئے بچوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اندازاً دس منٹ بعد اسے کچن سے تسکین کی مدھم آواز سنائی دینے لگی۔ کبیر احمد کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ اس نے کچن کے قریب جا کر سنا تھا' اس کی ناخلف بیوی تہمینہ کو مخاطب کرتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں باتیں کر رہی تھی اور ظفر کی خواہش پر حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔ پھر کبیر احمد چند منٹ تک سٹنگ روم میں پرسوچ قدموں سے ٹہلتا رہا' تسکین کے ساتھ تہمینہ کے گٹھ جوڑ نے اس کے شب و روز کا سکون غارت کر دیا تھا۔ نفرت و رقابت سے اس کے دل و ذہن میں تلاطم برپا تھا۔ تسکین کچن سے نکل کر بچوں کے پاس آئی تو وہ اسے کچھ کہنے کے بجائے غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔

❀ ❀ ❀

پانچ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے کہ جب کبیر احمد نے پلازہ کے مرکزی دروازے کے قریب موٹر سائیکل کو اسٹینڈ کیا۔ وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ آنکھوں پر کالا چشمہ لگائے وہ چند لمحے اوپر جاتی سیڑھی کو سوچتی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے جیب سے چیونگم نکال کر منہ میں رکھ لی اور اسے چباتے ہوئے زینے کے قدمچے پھلانگتے ہوئے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ چند منٹوں بعد وہ تہمینہ کے فلیٹ کے سامنے کھڑا تھا پھر اس نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ کچھ دیر میں دروازہ کھلا تو تہمینہ اس کے روبرو کھوجتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں الجھن اور تذبذب تھا پھر وہ اپنی جگہ حیرت کے مارے بھونچکی رہ گئی اور کسی اندیشے سے چونکتے ہوئے بولی۔

''تت...... تم کبیر احمد ہو' میرے فلیٹ کا پتا تمہیں کس نے دیا؟''

''ظفر اللہ نے......'' کبیر احمد نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ لمحاتی توقف کے بعد وہ چیونگم چباتے ہوئے خوش اخلاقی سے بولا۔

''ظفر نے آپ کے لیے ایک پیغام بھجوایا ہے تہمینہ جی!'' اس کا جواب سن کر جھینپتی ہوئی تہمینہ قدرے جھجک کر بولی۔

''آپ اندر آجائیے'' اتنا کہہ کر وہ دروازے سے قدرے ہٹ گئی۔ کبیر احمد فلیٹ میں داخل ہوا۔ پھر وہ تہمینہ کے ساتھ چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ فلیٹ کے کمروں کے آگے بنی راہداری میں اس نے تہمینہ کے دونوں بیٹوں کو کھیل کود میں مشغول دیکھا تھا۔ پانچ چھ برس کی بیٹی جسے وہ صبوحی کہہ کر پکار رہی تھی اس کے ہمراہ تھی۔ کبیر احمد سنگل صوفے پر براجمان ہو گیا۔ ادھر تہمینہ نے کچھ سوچتے ہوئے بچی کو باہر بھیج دیا اور سپاٹ لہجے میں کبیر احمد سے مستفسر ہوئی۔

''جی فرمائیے ظفر اللہ خود کیوں نہیں آئے؟'' اس کا سوال سن کر کبیر احمد نے کالا چشمہ اتارا اور تہمینہ کے بے تاثر چہرے کو گھورتے ہوئے بولا۔

''ظفر بھائی اس لیے نہیں آئے کہ آپ جیسی کمینی عورت سے وہ ملنا ہی نہیں چاہتے۔ انہوں نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ میں آپ کو سمجھاؤں اور مزید فتنہ گری سے خبردار کروں۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' اپنے لیے کمینی کے لفظ کو سن کر تہمینہ کے تیور بگڑ گئے۔

''ہوش میں رہ کر بات کریں۔ میں نے آپ کو اس لیے ڈرائنگ روم میں نہیں بٹھایا کہ آپ مجھے گالی دیں۔'' تہمینہ غصے سے بھرتی تند و تیز لہجے میں بولی۔

کبیر احمد دل جلے انداز میں چیونگم چباتے ہوئے مسکرایا اور زہرخند لہجے میں ناگواری سے بولا۔

''ہوش کے ناخن آپ کو لینا چاہیے محترمہ' آپ چار پانچ مہینوں سے تسکین کو میرے خلاف بھڑکاتی رہی ہیں اور میرے ہنستے بستے گھر کو جہنم بنا رکھا ہے۔ جسے میں نے کیونکر برداشت کیا ہے یہ میں جانتا ہوں۔ ذلیل عورت' میرے دن رات کا سکون غارت ہو گیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے کبیر احمد نے شدت جذبات سے سینٹر ٹیبل پر گھونسے برساتے ہوئے تہمینہ کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ دوسری جانب تہمینہ اپنے کرتوتوں کو قبول کرنے کے بجائے غصے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنی سازشی سرگرمیوں پر شرمندہ ہوئے بغیر ڈھیٹ بن کر چلاتے ہوئے بولی۔

''مجھے الزام دینے کے بجائے اپنی بیوی سے باز پرس کرو سمجھے! میں کیوں اسے بھڑکاؤں گی؟ کیا میرے علاوہ تمہارے گھر میں اڑوس پڑوس کی عورتیں آتی جاتی نہیں ہیں؟ اور کیا تسکین کوئی چھوٹی بچی ہے کہ اسے اچھے برے کی تمیز نہیں ہے وہ شوہر اور جلاد کے فرق کو خوب سمجھتی ہے۔ مجھ پر دہاڑنے کے بجائے اس کی بدگمانی ختم کرو۔ آنٹی نویدہ بھی یہ کہتی ہیں کہ وہ تم سے خوش نہیں ہے۔'' تہمینہ منہ بگاڑ کر بول رہی تھی اور چوری اوپر سے سینہ زوری کے مصداق ہرزہ سرائی کرتے ہوئے چپ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''اپنی بکواس بند کرو خبیث عورت میرے گھر کے معاملات میں دخل اندازی کرنے والی تم کون ہوتی ہو؟'' کبیر احمد کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو گیا تھا پھر وہ چیختے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

''تمہیں ظفر سے نسبت ٹوٹ جانے کا قلق ہے تو جا کر سیدھے منہ کالک تھوپو۔ میرے گھر کے سکون کو برباد مت کرو۔ سنا تم نے' میں اب یہ ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ تم اپنے منحوس قدموں سے میرے گھر میں داخل ہو۔ سمجھیں!''

''مجھے دھمکانے سے پہلے تم بھی اچھی طرح سن لو

کبیر احمد!'' تہمینہ نے بے عزتی کے احساس سے گرجتے ہوئے کہا۔

''میری بے عزتی کر کے تم بھی چین کی بانسری نہیں بجا سکتے۔ تمہارا بہنوئی وسیم ٹنڈوآدم سے یہاں مجھے ملنے آتا جاتا ہے۔ میں جب چاہوں پورے خاندان میں تمہیں بدنام کر سکتی ہوں۔'' تہمینہ کے اس انکشاف پر کبیر احمد اپنی جگہ چونک کر رہ گیا۔ یہ دروغ گوئی تھی یا سچ تھا کہ وسیم اپنی تایازاد بہن کے کرتوتوں سے باخبر تھا لیکن زینت نے اس بارے میں کبیر احمد کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ وسیم نے تہمینہ کی سرگرمیوں کو اس سے بے خبر رکھا ہو۔ یہ نہایت تکلیف دہ بات تھی۔ تاہم اس وقت کبیر احمد کو اپنی ناعاقبت اندیش بیوی کی اختلافی روش کو سدھارنا اور اس کی سرکشی کو لگام دینا مقصود تھا۔ وہ دوٹوک لہجے میں تہمینہ کو خبردار کرتے ہوئے بولا۔

''تم چاہے کچھ کرلو تہمینہ، لیکن یہ کان کھول کر سن لو کہ تمہاری کسی سازش سے میرے گھر کی خوشیاں برباد ہوئیں تو میں تمہیں اس شہر میں چین و آرام سے ہرگز رہنے نہیں دوں گا۔'' یہ کہہ کر کبیر احمد نے کالی عینک آنکھوں پر لگائی اور راہداری سے شور سن کر ڈرائنگ روم میں آنے والے تہمینہ کے بچوں کو لمحاتی توقف سے دیکھا اور اگلے لمحے وہ چیونگم چباتے ہوئے تیز تیز قدموں سے فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

کبیر احمد پلازہ کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور تہمینہ کی لن ترانیوں کے بارے میں سوچتا موٹر سائیکل کے قریب آیا۔ تہمینہ نے وسیم کے ساتھ اپنے میل جول کا انکشاف کر کے اس کے ذہن کو دھچکا پہنچایا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس کا سگا بہنوئی اس کے گھر کو دوزخ بنانے کی سازش میں شامل تھا۔ زینت یقیناً اس بات سے بے خبر تھی کبیر احمد نے سوچتے ہوئے تہمینہ کے تند و تیز لفظوں پر غور کیا، اس لمحے اسے سانس سے الجھتی خوشبو کا ادراک ہوا، یہ الائچی کی مہک تھی۔ کبیر احمد نے ایک دوسرا چیونگم نکالا اور چند منٹ تک چیونگم چباتے ہوئے ٹہلتا رہا۔ پھر دفعتاً اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا، اگلے لمحے اس کے ذہن میں جھماکے سے اس سوئٹ ڈش کا نام جھلملانے لگا۔ وہ جس وقت تہمینہ سے ملنے آرہا تھا وہ ظفر کی خاطر مدارات کی غرض سے کچن میں سوئٹ ڈش کے طور پر کھیر تیار کر رہی تھی۔ اور غالباً چکھنے کے ارادے سے اس نے ایک آدھ پلیٹ کھائی تھی۔ اس کی قوت جاذبہ نے الائچی کی مہک سے تہمینہ کی یہ ساری باتیں جان لی تھیں۔ اس نے ذہن کے پردے پر تہمینہ کے خیال کو کھوجنا شروع کیا۔ چند لمحوں کے توقف سے اس کی چشم تصور نے تہمینہ کے فلیٹ کا اندرونی منظر آشکار کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ تہمینہ راہداری میں کھڑی موبائل فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر غصے اور جھلاہٹ کے تاثرات تھے جیسے وہ کبیر احمد کے ہاتھوں ذلیل ہونے پر پیچ و تاب کھا رہی ہو۔ پھر کبیر احمد نے دل جلے انداز میں مسکراتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے فلیٹ سے نکلنے کے بعد تہمینہ نے اس کی بیوی کو فون کیا تھا اور اس کی آمد کے بارے میں تسکین کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ کبیر احمد نے تہمینہ کے اس کمینے پن کا بھی بندوبست بھی سوچ رکھا تھا۔ موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے اس نے موبائل فون پر ایک نمبر ملایا اور کان سے لگاتے ہوئے بولا۔

''ہیلو...... میں کبیر احمد بات کر رہا ہوں۔'' جواباً اسے دوسری جانب سے حسب توقع متانت آمیز اور باوقار آواز سنائی دی۔

''ہاں کبیر احمد...... خیریت تو ہے نا، کیسے فون کیا

بھئی؟'' اس کے سسر اور تسکین کے والد ذکا اللہ کی آواز میں حیرت و استعجاب تھا۔

''سب خیریت ہے چچا، بس آپ سے ایک ضروری کام تھا۔'' کبیر احمد نے گزارشانہ لب و لہجے میں جواب دیا پھر وہ سسر سے چھ سات منٹ تک بات چیت کرتا رہا۔ بعد میں اس نے موبائل فون آف کر کے جیب میں رکھا چیونگم چباتے ہوئے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور گنگناتے ہوئے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

کبیر احمد ساڑھے چھ بجے گھر میں داخل ہوا۔ اس کی توقع کے مطابق تسکین نے گھر میں انتشار اور بچوں پر شور مچا رکھا تھا۔ لاؤنج میں روتا ہوا فرحان چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا اس کی جانب بڑھا۔ کبیر احمد نے چیونگم چباتے ہوئے پیار و شفقت سے اسے چمکارا۔ وہ توتلی زبان میں بولا۔

''امی بوت گندی ہے، انہوں نے مودے مارا ابو۔'' (امی بہت گندی ہیں، انہوں نے مجھے مارا ابو!)

کبیر احمد نے معصوم بیٹے کی بات سن کر اس کے بالوں کو سہلایا اور کہا۔ ''یار تمہاری امی تو پاگل ہو جاتی ہیں لیکن تم تو اچھے بچے ہو ناں!'' پھر وہ لمحاتی وقفے سے فرحان کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

''اچھا یہ لو بیٹا، یہ چیونگم کھاؤ۔'' کبیر احمد نے جیب سے ایک چیونگم نکال کر فرحان کو دی۔ اسی لمحے تسکین بیڈ روم سے نکل کر لاؤنج میں آئی۔ اس نے مہرین کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی کبیر احمد کے قریب آئی اور ننھی مہرین کو اسے تھماتے ہوئے بولی۔

''آپ شیطان بچوں کو خود سنبھالو...... اور ہاں سن لو اب مجھ سے اکیلے تمہارے بچے اور گھر کے کام نہیں ہوتے، تم ملازمہ نہیں رکھو گے تو میں اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ پھر تم جانو اور تمہارا یہ گھر سمجھے۔'' تسکین

درِ نایاب

☆ انسان اپنے احساسات کسی نہ کسی کے نام کرنا چاہتا ہے تو کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنے ہر احساس کو اللہ کے نام کر دیں۔ آپ کو درجہ بندی بھی نہیں کرنا پڑے گی۔

☆ کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں جو ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیرے میں راستہ دکھاتے ہیں۔

☆ بڑا قد سے نہیں، کیے گئے کام اور اس کے معیار سے ہوتا ہے۔ سمجھ کا تعلق عمر سے نہیں احساس سے ہے۔

☆ جب دعا سے بات نہ بنے تو فیصلہ خدا پر چھوڑ دو۔ خدا اپنے بندوں کے بارے میں سب سے بہتر فیصلہ کرتا ہے۔

☆ جو لوگ اپنی ذات کے باہر رہتے ہیں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ان کا دماغ مضبوط ہوتا ہے لیکن جو لوگ اپنی ذات کے اندر رہتے ہیں۔ وہ ہر ہر جملے اور ہر ہر لفظ پر زخمی ہوتے ہیں۔

(مہوش شاہین...... حجرہ شاہ مقیم)

نے غصے سے منہ بگاڑ کر دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کبیر احمد سے کہا تھا جبکہ کبیر احمد ننھی مہرین کو ہاتھوں میں لیے زخمی نظروں سے ناخلف بیوی کی فنکارانہ اداؤں کو دیکھ رہا تھا اور تہمینہ کے فون کے اثرات کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔

''تمہارا جواب نہیں ہے تسکین! حیلے بہانوں سے مجھے پریشان کرنا تمہارا پسندیدہ مشغلہ بن گیا ہے۔ آخر تم چاہتی کیا ہو یار؟'' کبیر احمد نے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے بیوی سے مستفسرانہ لہجے میں کہا۔ تہمینہ کے معاملے کو اس نے ابھی طشت از بام نہیں کیا تھا۔ شوہر کو زچ ہوتا دیکھ کر تسکین کی گردن اکڑ گئی تھی۔ وہ نخرے سے منہ چڑھا کر بولی۔ ''میں نے کہا ہے ناکہ تم اپنے بچوں کے لیے ملازمہ رکھ لو

بس۔‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ انگلیاں چٹخانے لگی۔ پھر چند لمحے توقف سے سر پکڑ کر بولی۔

’’میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں چائے بنانے کچن جا رہی ہوں۔‘‘ پھر وہ بے زاری سے منہ بگاڑتی ہوئی کچن کی جانب بڑھ گئی اور کبیر احمد دل جلے جذبوں سے تسکین کے نازنخروں کو پرکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی بیوی اس پر حاوی ہونے کی خواہش میں تہمینہ کے سکھائے طریقوں پر عمل کر رہی تھی۔ اس جنون میں گھر برباد ہونے کا اسے مطلق ہوش نہیں تھا۔ کبیر احمد چیونگم چباتے ہوئے ننھی مہرین کو لیے صوفے پر بیٹھ گیا وہ آج تسکین کو ہوش دلانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

اندازاً چھ سات منٹ تک کبیر احمد اپنے گھر میں تہمینہ کی دخل درنا معقولات آمد و رفت کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس دوران چیونگم سے اٹھتی الائچی کی مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرا کر تہمینہ کے جملوں کی بازگشت کا احساس دلاتی رہی۔ دفعتاً تسکین چائے کا مگ لیے کچن سے باہر آئی اور پھر سامنے بیٹھے کبیر احمد کو بے پروائی سے نظر انداز کرتی اور بچوں کی جانب دیکھے بغیر بیڈ روم میں گھس گئی۔ کبیر احمد متاسف نظروں سے اس کے خودسرانہ ناز و انداز کو دیکھ رہا تھا۔ ننھی مہرین روتے روتے کبیر احمد کے بہلانے پر چپ ہوگئی تھی۔ فرحان بھی کھلونوں میں مشغول ہوگیا تھا۔ اپنے مظلوم بچوں کو دیکھتے کبیر احمد کو ابھی چند منٹ گزرے تھے کہ اس کی ناک سے الائچی کی مہک الجھنے لگی۔ اس نے چونک کر سوچا' چیونگم کی بال مائیکروفون کی مانند اس کی سماعتوں میں سرگوشی کر رہی تھی۔ ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا تھا اور اسے اس بات سے آگاہ کر رہا تھا کہ تسکین بیڈ روم میں تہمینہ سے موبائل فون پر باتیں کر رہی ہے اور چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے تہمینہ کو شوہر کے ساتھ ہونے والے اپنے ہنگامے کی ساری روداد سنا رہی ہے۔ کبیر احمد چیونگم کے ذریعے انسانی قوت جاذبہ کی حیرت انگیز کارکردگی کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکا تھا۔ چیونگم کی بال اسے غلط اطلاع نہیں دے سکتی تھی۔ یہ سوچتا ہوا وہ صوفے سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا بیڈ روم کے دروازے کے نزدیک آیا۔ چیونگم کا سگنل سو فیصد سچا تھا۔ کھلے دروازے سے تسکین کی پر تفخر اور چہکتی آواز اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ فون پر دوسری جانب موجود تہمینہ سے کہہ رہی تھی۔

’’یار بچوں کو مار پیٹ نہیں کرتی تو کبیر مجھ پر چڑھ دوڑتا' اس کے آتے ہی میں نے وہ شور مچایا کہ موصوف کی سٹی گم ہوگئی۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس کے لب و لہجے میں زہر خندی عود کر آئی۔ پھر وہ نخوت سے منہ پھلا کر بولی۔

’’میری جاسوسی کے شوق میں وہ تمہارے فلیٹ تک پہنچ گیا اور مجھ سے چھپائے رکھا' ایسا شکی مزاج شخص میں نے کہیں نہیں دیکھا۔‘‘ یہ کہتے ہوئے تسکین نے چند لمحے توقف کیا اور دوسری جانب سے تہمینہ کے کبیر احمد کے بارے میں جھوٹے سچے الزامات سننے لگی۔

’’اکیلی عورت کو محض شک کی بنیاد پر ذلیل کرنا اور گالی دینا کتنے ظلم کی بات ہے۔‘‘ پھر وہ لمحاتی وقفے سے ترش روی سے بولی۔

’’کبیر نے میرے بارے میں تم سے جو پوچھ پاچھ کی ہے' اس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑے گا۔ تم بے فکر رہو تہمینہ' میں ایک دو دن میں امی سے کبیر کی اس بیہودہ حرکت کی شکایت کروں گی۔ اس کا دماغ درست نہ کرایا تو تم میرا نام بدل دینا۔‘‘ اتنا کہہ کر تسکین نے ذرا ٹھہر کر اپنی ناراض سہیلی کی بات سنی اور تند و تیز لہجے میں جتاتے ہوئے کہا۔

’’میں کہہ رہی ہوں نا کہ تمہارا نام نہیں لوں گی۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ اب یہ میرا کام ہے کہ تمہاری بے عزتی کا بدلہ میں کس طرح لیتی ہوں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے تسکین نے خالی مگ ٹیبل پر رکھا تھا۔ دروازے کے قریب موجود کبیر احمد اپنی بیوی کے رذلیل اور باغیانہ خیالات سن کر غصے اور نفرت سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ تہمینہ کی گھر میں آمد جامد سے تسکین جن گمراہ سوچوں میں رہنے لگی تھی' آج اسے پورے طور پر اندازہ ہوا تھا۔ تہمینہ کے مسلسل ورغلانے پر گزشتہ پانچ چھ ماہ سے اس عقل کی دشمن عورت نے اس کی پرامن اور سکون پسند طبیعت کو یوں ذہنی و جذباتی لحاظ سے منتشر اور مضطرب کیا تھا کہ وہ گھر اور لیبارٹری کے کاموں میں خود کو بے سکون اور جذباتی طور پر برانگیختہ محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ تہمینہ کی وجہ سے تسکین نے اسے ساس و سسر اور دونوں بہنوں اور بہنوئیوں کی نظروں میں بھی ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب جبکہ تہمینہ کی فتنہ گری کھل کر سامنے آ گئی تھی اس لیے اب کبیر احمد کے لیے بیوی کی ریشہ دوانیوں پر چپ سادھ لینا بہت مشکل تھا۔ شدتِ جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اگلے لمحے وہ بجلی کی سرعت سے کمرے میں گھس گیا اور خدا حافظ کہتی تسکین سے موبائل فون چھین لیا۔ دوسری جانب ابھی تہمینہ نے موبائل فون آف نہیں کیا تھا' کبیر احمد غصے سے دہاڑتے ہوئے ماؤتھ پیس میں چیخا۔

’’حرام زادی' میں نے منع کیا تھا تجھے کہ میرے گھر میں آگ نہیں لگائے گی۔ میری بیوی کو میرے خلاف نہیں بھڑکائے گی۔ لیکن تو نہیں مانی۔‘‘ وہ ذرا ٹھہر کر دوبارہ گرجا۔ خبیث عورت' اچھی طرح سن لے میں ظفر کے باپ کو تیرے گھر بھیج رہا ہوں' وہی تیرا منہ کالا کر کے تجھے اس شہر سے دربدر کریں گے۔ سن لیا تو نے گندی عورت۔‘‘ اس کی غم و غصے سے بھرتی آواز کے جواب میں دوسری جانب خاموشی طاری تھی۔ کبیر احمد کے اس اچانک چھاپے پر شاید تہمینہ حیرت و خوف سے سناٹے میں کھڑی رہ گئی تھی اور جواباً کچھ نہیں کہا تھا' پھر کبیر احمد نے موبائل فون کا بٹن آف کر دیا۔ اسی لمحے قریب موجود تسکین جو کبیر احمد کی افتاد ٹوٹ پڑنے سے برافروختہ ہوگئی تھی' اور اسے تیز نظروں سے گھور رہی تھی' پھرتی سے لپکی اور کبیر احمد سے موبائل فون لینے کی کوشش میں چھینا جھپٹی کرنے لگی' لیکن کبیر احمد آج ناخلف بیوی کی آنکھیں کھول دینا چاہتا تھا۔ اس نے تسکین کو جھڑکتے ہوئے ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا اور اسے برہمی سے دوٹوک لہجے میں بولا۔

’’تمہاری خود پسندی اور حماقتوں نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے تسکین لیکن اب میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا سمجھی۔‘‘ یہ کہہ کر کبیر احمد ذرا ٹھہرا پھر روتی اور دھڑ دھڑ آنسو بہاتی تسکین کو مطلع کرتے ہوئے بولا۔ ’’تمہیں اپنے میکے جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چچا اور چچی کچھ ہی دیر میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔ میں نے ذلیل تہمینہ کی حرکتوں کے بارے میں انہیں آگاہ کر دیا ہے۔‘‘ یہ کہتا ہوا کبیر احمد لاؤنج میں موجود بچوں کی جانب بڑھ گیا۔ تقریباً دس منٹ بعد چچا ذکاء اللہ اور چچی نویدہ گھر میں داخل ہو رہے تھے تو کبیر احمد فتح مندی کے احساس سے صوفے پر بیٹھا اس وزیٹنگ کارڈ کو دیکھ رہا تھا جس پر ’’تہمینہ بیوٹی ایکسپرٹ‘‘ کے جلی حرفوں کے نیچے اس کے بیوٹی پارلر اور فلیٹ کا پتا درج تھا۔

❖

شکار

واجد نگینوی

خود آپ اپنے دام میں صیاد آگیا
ریل کے سفر کے دوران ایک ریٹائر جنرل اور اک نوخیز حسینہ کے درمیان کھیلے جانے والے ڈرامے کی روداد' معروف ادیب او نہری کے انداز میں لکھی جانے والی کہانی آپ اس کی آخری سطر پڑھ کر چونک جائیں گے۔

ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور ٹرین رینگنے لگی۔ میجر جنرل سید گوہر علی ترمذی نے سامنے کی برتھ کے اوپر اور نیچے رکھے ہوئے سامان کا ایک سرسری سا جائزہ لیا اور کوٹ کے اندر کندھوں کو کسمساتے ہوئے ایک لمبی سانس لی۔ سردی شباب پر تھی۔ کمپارٹمنٹ کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ باہر ہوا میں خنکی تھی۔ ایک باریک سی کہر کی چادر فضا پر مسلط تھی۔

میجر جنرل گوہر نے کھڑکی کے باہر جھانکنے کی ناکام کوشش کی۔ شیشہ دھندلایا ہوا تھا اور چند موٹے موٹے قطرے کسی بیوہ کے آنسوؤں کی طرح اٹڈ رہے تھے۔ ریل گاڑی کی رفتار کے ساتھ ساتھ میجر جنرل گوہر کے خیالات نے بھی پرواز شروع کردی۔

انسان کی جان کتنی عزیز شے ہے۔ آج اسے اس کا صحیح احساس ہوا تھا۔ سب سے زیادہ یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ وہ زندہ واپس جارہا تھا۔ اپنے گھر جہاں اس کے بچے عدنان، ریحان، فریال کے علاوہ بیوی ثمینہ بے چینی سے اس کا انتظار کررہے تھے۔

کچھ گھنٹے پیشتر وہ آرمی میڈیکل اسپتال مظفر آباد آزاد کشمیر سے ڈسچارج ہوا تھا۔ تھوڑی سے ندامت بھی تھی، اسے اپنی خود غرضی پر کہ جلدی میں وہ ان نرسوں اور ڈاکٹروں کا شکریہ بھی ادا نہ کرسکا تھا جن کی وقتاً فوقتاً اس کے وارڈ میں ڈیوٹیاں لگتی رہیں۔ خاص طور سے ڈاکٹر غلام عباس کا دلی طور پر مشکور تھا جس نے اسے بچانے کے لیے اپنی بے لوث اور انتھک کوششیں کی تھیں۔ اور ان کی نوازشوں اور محبت کے طفیل آج وہ اس قابل ہوسکا کہ زندگی کی سچی اور حقیقی لطافتوں سے ہم کنار ہوسکے۔ اور پھر اس کے ذہن کے کسی گوشے سے ابھر کر بچپن کی یادیں کسی فلم کی مانند نگاہوں میں رقص کرنے لگیں۔

اس کے دوست، اس کے ساتھی، سب ایک ایک کرکے اجاگر ہونے لگے۔ سبطین، حسنین، شہناز، شہوار، رعنا، شمع، شانِ زہرہ، سمیتا، ثناء رضوان۔

آہ کتنے حسین تھے وہ لمحات، وہ اپنے گردوپیش سے بے نیاز ہوکر ملکہ شیریں کی شرارتوں کو یاد کرکے عالم بے خودی میں مسکرانے لگا۔ لیکن اس نے سوچا کہ وہ خود بھی کتنا زندہ دل تھا۔ بات بات پر قہقہے اور لطیفہ گوئی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ کتنی پرکیف اور بے فکر زندگی تھی۔ مصطفیٰ ہائر سیکنڈری اسکول سے آنے کے بعد دن بھر بے مقصد شہر کے بازاروں میں گھومنا اور شام کو باغات کی سیر، کتنا دلکش منظر ہوتا تھا جب یاروں کی ٹولی امرودوں کے باغ پر ہلہ بول دیتی تھی۔

ملازمت بھی کیا عجیب شے ہے اور وہ بھی ملٹری کی جس کی پابندی میں اس کی زندگی یکسر بدل گئی تھی۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ کے آغاز سے میجر جنرل بننے تک کتنے مراحل سے گزرنا پڑا۔ یہ اس کا دل ہی جانتا تھا اور تیس برسوں کی جان توڑ کوششوں کا صلہ۔

گاڑی راولپنڈی اسٹیشن پر رک جانے سے اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ سورج کی شعاعوں کی تاب نہ لاکر کُہر کب کی غائب ہوچکی تھی۔ میجر جنرل گوہر نے پلیٹ فارم کا جائزہ لیا۔ بھیڑ اچھی خاصی تھی لیکن فرسٹ کلاس کا کمپارٹمنٹ ہونے کی وجہ سے مسافر میجر جنرل گوہر کو شہی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر گزر جاتے۔ ریلوے گارڈ کی وسل سنائی دی لیکن اس سے قبل کہ گاڑی اسٹارٹ ہو۔ میجر جنرل گوہر نے دروازے کی چٹخنی کی حرکت کو محسوس کیا اور ساتھ ہی ایوننگ ان پیرس کے جھونکے کو بھی۔

چند ساعت کے بعد کمپارٹمنٹ میں داخل ہونے والی ایک دلکش خدوخال کی دوشیزہ جس کا سن مشکل سے سترہ اٹھارہ سال کا ہی ہوگا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ میں پرس لٹکائے بڑی بے باکی کے ساتھ میجر جنرل کے ساتھ والی برتھ پر بیٹھ گئی۔ اس کی شوخ وچنچل اداؤں اور نگاہوں سے میجر جنرل گوہر نے بہت جلد یہ اخذ کرلیا کہ وہ محفلوں اور کلبوں کی منظورِ نظر رہنے کا شرف ضرور حاصل کرچکی ہے۔ اپنی غزالی آنکھوں کی گھنی پلکوں کو جھپکا کر اور لبوں پر ایک قاتلانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے وہ گویا ہوئی۔

''ایکسکیوزمی...... آپ کے پاس کوئی میگزین یا ناول تو ہوگا؟''

''آئی ایم سوری! میں فوجی ہونے کے ناتے میدانِ عمل کا کھلاڑی ہوں۔ تحریر کی تخیل پروازی پر یقین نہیں رکھتا۔'' میجر جنرل گوہر نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''آدمی آپ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔''

''قیافہ شناسی کی آپ ایکسپرٹ معلوم ہوتی ہیں۔''

''جی ہاں! ایسا ہی سمجھئے۔ لوگوں کے لہجے کا اتار چڑھاؤ اور ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک جملہ میرے لیے کافی ہوتا ہے۔ مجھے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مجھے غلط نہ سمجھئے یہ میری ایک ہابی ہے۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ اچھا کیا آپ نے مجھے بتادیا اب میں ہابی ہی سمجھوں گا...... شغل نہیں۔'' اور کچھ دیر کے لیے کمپارٹمنٹ مردانہ اور نسوانی قہقہوں سے گونجنے لگا۔

ذرا دیر کی خاموشی کے بعد نووارد دوشیزہ نے گفتگو کا موضوع بدلا۔ ''شاید آپ ہمسایہ ملک بھارت کے حملے کا بہادری سے جواب دینے کے بعد کشمیر کے محاذ سے واپس آرہے ہیں۔''

''ظاہر ہے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے۔ بھارت کبھی ہمارے ملک پاکستان پر دوبارہ حملہ آور ہوگا؟''

''معاف کیجیے گا! میں قیافہ شناس نہیں ہوں۔'' میجر جنرل گوہر نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ البتہ اپنے ملک کی حفاظت کے پیش نظر ہمیں خود کو ہروقت تیار رکھنا ہوگا۔ دشمن ہماری غفلت کا ناجائز فائدہ اٹھاسکتا ہے۔''

''آپ کا پرسکون چہرہ جنگ کے بہتر ہونے کی غمازی کرتا ہے یا گھر واپسی کی خوشی؟ اس سلسلے میں میں ابھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پائی۔'' دوشیزہ نے ایک عجیب سا سوال کیا۔

''دراصل حقیقت یہ ہے کہ میں ریٹائر ہوکر ایک طویل عرصے کے بعد اپنی گھریلو زندگی کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ جہاں جنگ وجدل اور زندگی کے غموں سے بے فکر، بے نیاز چند معصوم ہستیوں کے ساتھ ایک بے چین دھڑکتا ہوا دل مجھ کو خود میں سمو لینے کے لیے بے تاب ہوگا۔ تیس سال کے صبر آزما، کٹھن انتظار کے بعد ملک اور قوم کی خدمت کا صلہ عزت،

احترام، دولت کی شکل میں مجھے ملا ہے جو اوپر سامان والی سیٹ پر رکھی ہوئی اٹیچی میں محفوظ ہے۔" میجر جنرل گوہر پر سنجیدگی غالب آچکی تھی۔

"بس بس! اب میں آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ آپ نے میرا کام آسان کر دیا۔" دوشیزہ کا لہجہ اچانک تبدیل ہو گیا۔ چہرے پر کرختگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ "میں ایک ڈاکو ہوں۔ میرا کام اور پیشہ مال دار مسافروں کو لوٹنا ہے...... جلدی سے اٹھیے اور اٹیچی کا تالا کھول کر تمام کی تمام رقم میرے حوالے کر دیجیے۔ اگلا ریلوے اسٹیشن قریب آرہا ہے۔ ورنہ میں زور زور سے چیخوں گی کہ آپ میری عزت سے کھیلنا چاہتے تھے۔ نتیجہ آپ جانتے ہیں کیا ہوگا؟ جلد فیصلہ کیجیے۔ ایک طرف آپ کا عہدہ اور سب ہی کچھ ہے۔ دوسری طرف تھوڑی سی رقم...... اگرچہ ایک کثیر رقم ہے لیکن ایک اعلیٰ فوجی آفیسر کے لیے جیل جا کر عزت گنوانے کے مقابلے میں میرے خیال میں اتنی اہم نہیں۔"

ریل گاڑی کسی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ دوشیزہ کی بڑھتی ہوئی جھنجلاہٹ کا جواب میجر جنرل کے لبوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ تھی۔ شکاری کو خود شکار ہونے کا احساس ہونے لگا۔ آج اسے پتا چلا کہ فوجی کتنے ڈھیٹ اور نڈر ہوتے ہیں۔ چہرے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ دل ناتواں نے سختی کی لذت محسوس کی اور لاشعوری طور پر نحیف ہاتھ زنجیر سے ٹکرائے۔ چند ساعت کے بعد گاڑی رک چکی تھی۔ آج پہلی بار دوشیزہ کو اپنے ہاتھوں میں نقاہت محسوس ہوئی۔ شاید یہ ردعمل تھا۔ میجر جنرل گوہر کے لبوں پر ابھرنے والی ایک ابدی مسکراہٹ کا جس نے دوشیزہ کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ لیکن موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ زنجیر کھینچ کر اپنی پوزیشن محفوظ کر لی جائے۔

مدمقابل ایک فوجی اور وہ بھی اعلیٰ افسر تھا۔ گاڑی نے رکنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ گارڈ کے استفسار پر روہانسی، گھبرائی ہوئی پسینے میں شرابور حسینہ نے رو دینے والے انداز میں ایک دکھ بھری فرضی داستان سنائی کہ کس طرح میجر جنرل گوہر اس کی عزت پر ڈاکا ڈالنا چاہتا تھا۔

اس بہتان تراشی کے جواب میں میجر جنرل گوہر کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر گارڈ کو قدرے حیرت ہوئی۔ اس نے کھڑکی کے باہر کھڑے ایک ریلوے پولیس انسپکٹر کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور میجر جنرل سے رجوع ہوا۔ "اس سے قبل کہ آپ کے ساتھ سختی کا رویہ اختیار کرنا پڑے۔ آپ خود اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیجیے۔ ہو سکتا ہے آپ بے قصور ہوں لیکن اس کا فیصلہ عدالت میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن معاملہ آپ کے خلاف ہونے پر یہ بڑے شرم کی بات ہوگی۔"

گارڈ نے ایک ہی سانس میں دھیمے لہجے میں کہا۔

"ریلوے مجسٹریٹ کے سامنے چلو۔" ریلوے پولیس انسپکٹر نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

میجر جنرل گوہر کے کھڑے ہونے پر سب کے منہ سے ایک چیخ بلند ہوئی۔ میجر جنرل گوہر کے جسم سے شال سرک کر برتھ پر گر گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ شانوں سے غائب تھے۔

جرم لاشعور

محمد سعید اختر

قانون اور قاتل کے درمیان انوکھی' رسہ کشی کا احوال وہ قاتل ہوتے ہوئے بھی خود کو بے گناہ تصور کر رہا تھا۔

ایک خوب صورت کہانی' روشنیوں کے شہر میں کھیلے جانے والے ڈرامے کی روداد

شاید کوئی بھی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوگا کہ کوئی قتل یا کوئی سنگین جرم غیرارادی اور لاشعوری طور پر بھی آدمی سے سرزد ہو جایا کرتا ہے۔ اس جرم میں اس کے ارادے یا اس کی سوچ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

شام ہو چکی تھی اور مجھ پر تھکن بھی غالب آنے لگی تھی۔ میں نے اپنی سیکریٹری مس روزا سے کہا کہ وہ آفس بند کر دے۔ میں جا رہا ہوں۔ بریف کیس اٹھایا' ہیٹ سر پر رکھا' آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک جمائی اور آفس سے باہر نکل آیا۔

میں ایک مشہور وکیل ہوں۔ آج صبح بھی میں نے دو مقدمات کی پیروی کی یہی وجہ تھی کہ تھکن مجھ پر غالب آنے لگی تھی اور اب میں جلد سے جلد اپنے گھر جا کر آرام کرنے کا خواہش مند تھا۔ دراصل بڑھاپا آدمی کو بہت جلد تھکا دیتا ہے۔ میں اب ساٹھ برس سے زیادہ کا ہو چکا ہوں۔ اس شہر میں گزشتہ ۳۰ سال سے میں وکالت کر رہا تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ جس دن کسی نہ کسی عدالت میں میرا کیس نہ چل رہا ہو۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری مصروفیات میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا مگر دوسری طرف میرے قویٰ میرا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ میری بینائی کمزور ہو گئی۔ دل بھی مجھ سے بے رخی برتنے لگا تھا اور کسی نوخیز محبوبہ کی طرح بعض اوقات شوخیاں کرنے لگتا اور یہ شوخیاں اس صورت میں ہوتی تھیں کہ درد کی ایک تیز لہر میرے پورے وجود میں سرایت کرتی چلی جاتی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا تھا اور جسم سے جیسے جان نکلنے لگتی تھی۔

میں آفس سے نکل کر اپنی کار میں آبیٹھا۔ سورج ڈوب چکا تھا اور شہر کی سڑکوں پر روشنیوں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ کار اسٹارٹ کی اور ان روشنیوں کے ہجوم میں آگے بڑھنے لگا۔

ٹریفک کا اژدہام تھا اور میری پرانے ماڈل کی کار اس ہجوم بے کشاں میں ہچکولے کھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ میری طرح وہ بھی بہت سی ظاہری اور اندرونی بیماریوں کا شکار ہو گئی تھی مگر ہم دونوں کو ابھی ایک دوسرے کی رفاقت گوارا تھی۔

تھوڑی دیر کی ڈرائیو کے بعد میں اپنے مکان کی گلی میں داخل ہو گیا تھا۔ گاڑی اپنے مکان کے سامنے روکی۔ انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔ دروازہ لاک کرتے ہوئے دفعتاً میری نگاہ مسز سیمسن کے مکان پر پڑی۔ یہ ایک خوب صورت مکان تھا اور اس وقت اس کے سامنے والی دیوار سے ایک سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ جیسی اکثر رنگ و روغن کرنے والوں کے استعمال میں ہوتی ہے۔

میں نے غور سے سیڑھی کو دیکھا اور سوچا کہ کیا مسز سیمسن اپنے مکان پر رنگ کروا رہی ہے؟

مسز سیمسن ایک بوڑھی عورت تھی اور اس مکان میں گزشتہ ۲۰ سال سے تنہا رہ رہی تھی۔ اس کا شوہر مسٹر رائل سیمسن خاصا امیر آدمی تھا لیکن ایک حادثے میں وہ اچانک مسز سیمسن کو اس دنیا میں تنہا چھوڑ گیا اور جب سے وہ تجرد کی زندگی بسر کر رہی تھی۔

اسے اپنے شوہر سے بہت محبت تھی اور اس محبت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا کہ شوہر کی موت کے بعد اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ حالانکہ اسے بے شمار پیغامات آئے لیکن اس نے تمام پیغامات کے جواب میں معذوری ظاہر کر دی اور تنہا زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا اور اب اسے ۲۰ سال کا طویل عرصہ بیت چکا تھا۔

مسز سیمسن چونکہ میری پڑوسن تھی اس وجہ سے وہ میری گہری دوست تھی اور شاید ایک طرح سے ہمارا غم مشترکہ تھا کیونکہ میری بیوی لارا کو مرے ہوئے بھی پندرہ برس سے زیادہ ہو چکے تھے اور ہم دونوں کا یہ مشترکہ غم ہمیں ایک دوسرے سے کچھ اور قریب لے آیا تھا اور ہم گھنٹوں ایک دوسرے کی رفاقت میں بہت اچھا وقت گزارا کرتے تھے۔

ہماری دوستی میں کوئی غرض یا لالچ شامل نہیں تھا۔ جب بھی ہمیں وقت ملتا ہم ایک دوسرے کے پاس پہنچ جاتے۔ چونکہ مسٹر سیمسن نے ایک خاصی بڑی جائیداد اور کاروبار چھوڑا تھا اس لیے میں اس کے اس کاروبار اور جائیداد کا نگراں تھا اور یہ چیز بھی ہماری قرابت کا باعث تھی۔

مسز سیمسن اب خاصی بوڑھی ہو چکی تھی۔ ایک پرانی خادمہ اب ہر وقت اس کی دیکھ بھال کے لیے گھر پر رہا کرتی لیکن اس کے باوجود مجھے مسز سیمسن کی طرف سے فکر لاحق رہتی تھی۔

میری پریشانی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ مسز سیمسن کو زیورات سے ایک خاص قسم کا لگاؤ اور دلچسپی تھی اور اس عمر میں بھی وہ بہت سے قیمتی زیورات زیب تن کیے رکھتی تھی۔ اس کے کمرے کے لاکر میں بہت سے نایاب اور خوب صورت زیورات رکھے ہوئے تھے اور مجھے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کسی دن کوئی چور موقع پا کر یہ زیورات نہ لے اڑے یا اگر کسی کو خبر ہو گئی تو دن دہاڑے ہی وہ ڈاکا مار دے۔ بھلا دو بوڑھی عورتیں کیا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

میں نے کئی بار مسز سیمسن کو اپنے اس خدشے سے آگاہ بھی کیا اور اسے احساس دلانے کی کوشش کی کہ یہ ایک خطرناک اقدام ہے اور وہ اپنے زیورات بینک لاکرز میں رکھوا دے مگر مسز سیمسن نے میری باتوں پر کبھی بھی توجہ نہیں کی۔ وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ کہتی۔

''اوہ ڈیئر جانسن یہ سب تمہارا وہم ہے۔ آج تک تو کوئی آیا نہیں ہے تم فکر نہ کرو۔''

میں جواب میں اپنے ہونٹ چبا کر رہ جاتا۔ بھلا میں کس طرح سمجھاتا مسز سیمسن میری ناراضگی بھانپ کر ایک دم کہتی۔ ''اوہ ڈیئر، بس اب ناراض مت ہو جانا۔ بھلا یہ بھی کوئی ناراض ہونے کی بات ہے۔ آؤ چہل قدمی کریں۔''

پھر وہ اٹھ کر میرا بازو پکڑتی اور مجھے کھینچتی ہوئی باہر لان میں آ جاتی اور اپنی گفتگو کا موضوع کھلے ہوئے پھولوں اور خوشبو سے مہکی ہوئی ہواؤں کو بنا لیتی۔ کبھی کبھی وہ اپنے شوہر کو یاد کر کے اداس ہو جاتی لیکن پھر یوں اچانک چونک جاتی جیسے بے خیالی میں کوئی غلط چیز اٹھا لی ہو۔

میں نے اس سیڑھی کو جب مسز سیمسن کے مکان سے لگا دیکھا تو میرے ذہن کے کسی گوشے میں پھر اس اندیشے نے سر ابھارا کہ کہیں کوئی چور تو اس سیڑھی سے اوپر نہیں پہنچ گیا۔

سیڑھی ٹھیک مسز سیمسن کے بیڈروم کی کھڑکی کے سامنے لگی ہوئی تھی۔

میں نے سوچا کہ اس سیڑھی کی مدد سے کوئی بھی باآسانی مسز سیمسن کی خواب گاہ میں داخل ہو سکتا ہے۔

پھر شام کے ملگجے اجالے میں مجھے احساس ہوا کہ مسز سیمسن واقعی نیا رنگ کروا رہی ہیں کیونکہ جہاں سیڑھی لگی تھی، اس طرف کا رنگ دوسرا تھا۔

میں نے قدم اپنے مکان کی طرف اٹھائے مگر کوئی چیز مجھے بے چین کر رہی تھی جیسے میری چھٹی حس مجھے کسی ممکنہ خطرے سے خبردار کر رہی ہو۔

میرا خیال ہے کہ مجھے یہ سیڑھی وہاں لگی ہوئی کھل رہی تھی اور یہ اندیشہ میرے ذہن میں بیدار ہو رہا تھا کہ سیڑھی کا وجود کسی خطرے یا حادثے کی علامت ہے۔ اسے یہاں سے ہٹا دینا چاہیے۔

میں اپنے مکان کے دروازے پر پہنچ کر پھر رک گیا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ مسز سیمسن سے کہوں کہ وہ اس سیڑھی کو یہاں سے ہٹوا کر کسی اور جگہ رکھوا دے تاکہ کوئی خطرہ باقی نہ رہے مگر میں فوری طور پر اپنے اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ کیونکہ مسز سیمسن میری یہ بات سن کر میرا مذاق اڑانے لگتی۔ وہ اس معاملے میں زندہ دل واقع ہوئی تھی اور ایسا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی جس سے مجھے مذاق کا نشانہ بنایا جائے۔ ویسے بھی وہ مجھے ایک کمزور اور بزدل آدمی سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں مرد ہونے کے بجائے عورت ہوتا تو ٹھیک رہتا۔

میری آنکھوں میں اس وقت مسز سیمسن کا وہ قیمتی سرخ ہیرے والا ہار گھوم رہا تھا جس کی نمائش وہ بڑے فخر سے کرتی تھی اور ہر وقت اپنے گلے میں پہنے رہتی تھی۔

وہ خاصا قیمتی ہار تھا اور مسز سیمسن کا کہنا تھا کہ یہ ان کا خاندانی ہار ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہا ہے اور اب یہ اس کے پاس ہے اور شاید اس ہار کی آخری وارث مسز سیمسن ہی تھی۔ اس کے بعد خدا جانے اس ہار کا کیا ہوتا کیونکہ مسز سیمسن کے کوئی اولاد نہیں تھی۔

ایک بار پھر مجھے خیال آیا کہ میں مسز سیمسن کو ہوشیار کر دوں مگر پھر کچھ سوچ کر میں نے اپنے مکان کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ کچن میں جا کر پہلے کافی بنائی اور اس کے بعد بیڈروم میں آ گیا۔ سخت تھکن سوار تھی۔ کافی پیتے ہوئے میں نے بریف کیس میں سے ایک فائل نکالی اور اس کا مطالعہ کرنے لگا۔

یہ کسی قتل کے کیس کی فائل تھی۔ میں اس سلسلے میں ملزم کی پیروی کر رہا تھا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے جبکہ ملزم کا بیان تھا کہ وہ اس رات شہر میں موجود نہیں تھا اور یہ قتل اس نے نہیں کیا بلکہ کسی چور نے یہ واردات کی ہے کیونکہ جب وہ اپنے گھر واپس آیا تو سامان بے ترتیب اور بکھرا ہوا تھا اور اس کی بیوی ڈرائنگ روم میں مردہ حالت میں پڑی تھی۔ کسی نے تیز دھار آلے سے اس کی گردن کاٹ دی تھی۔

جب کہ پولیس کا کہنا تھا کہ قتل اسی نے کیا ہے اور پولیس کو دھوکا دینے کے لیے یہ سب ڈراما رچایا گیا ہے۔ البتہ میرا اپنا خیال یہ تھا کہ ملزم کا بیان درست ہے حالانکہ وہ قتل والی رات شہر سے غیر موجودگی کا کوئی ثبوت تو پیش نہیں کر سکا تھا مگر میرے

خیال میں اس کی بے گناہی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس اپنی بیوی کو قتل کرنے کی کوئی خاص وجوہات نہیں تھیں اور یہی بات اس کے حق میں جاتی تھی۔

کافی ختم کرنے کے بعد میں آرام کے لیے لیٹ گیا اور جب بھوک لگنے لگی تو میں دوبارہ کچن میں آ گیا۔ فریج میں سے کھانا نکالا' گرم کیا اور کھانے لگا۔ ڈائننگ ٹیبل کی جس کرسی پر میں بیٹھا تھا اتفاق سے اس کے سامنے والی کھڑکی میں سے مسز سیمسن کے بیڈروم کا منظر نظر آ رہا تھا۔ مجھے وہ سیڑھی بھی صاف نظر آ رہی تھی جو باہر دیوار کے ساتھ لگی تھی۔

مسز سیمسن ایک کرسی پر بیٹھی کوئی میگزین پڑھ رہی تھی اور تیز روشنی میں مجھے اس کے گلے میں ہار کا وہ سرخ ہیرا صاف نظر آ رہا تھا جو تیز روشنی کی وجہ سے خوب چمک رہا تھا۔ وہ درحقیقت ایک قیمتی اور نادر ہیرے والا ہار تھا اور صرف اسی ایک ہار کی خاطر کوئی بھی کسی کو قتل کر سکتا تھا۔

میں نے اپنی توجہ اس کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کی اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کھانا کھا کر میں حسب معمول باہر چہل قدمی کے لیے نکل گیا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد جب میں واپس ہوا تو مسز سیمسن کے مکان کے قریب رک گیا۔ میں نے سوچا کہ مسز سیمسن سے ذرا دعا سلام کر لی جائے اور اسے اس بات کی طرف توجہ دلائی جائے کہ اس نے سیڑھی غلط اور خطرناک جگہ پر کھڑی کی ہوئی ہے۔ کوئی بھی شخص بآسانی اس سیڑھی کے ذریعے اس کے بیڈروم میں آ سکتا تھا۔

میں نے اس کے مکان کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ مکان کے اندر کہیں بھی روشنی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسز سیمسن آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی ہے۔

چنانچہ میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے مکان پر پلٹ آیا۔ گھر آ کر میں نے وہ فائل دوبارہ نکالی اور مطالعہ کرنے لگا۔ اس دوران میرے ذہن میں مسز سیمسن کا وہ ہار بھی گردش کر رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں وہ ہار اس وقت میرے ذہن سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ جیسے لاشعور میں کوئی گرہ پڑ گئی ہو۔

آخر گیارہ بجے کے قریب میں نے لائٹس آف کیں اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

❀......❀......❀

صبح حسب معمول سو کر اٹھا۔ ہلکی ورزش کی۔ شیو بنائی ناشتا کیا اور پھر آفس جانے کے لیے باہر نکلا۔ میں اپنی گاڑی کے قریب پہنچا تو میں چونک پڑا۔ مسز سیمسن کے مکان کے سامنے دو تین پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں اور کچھ اڑوس پڑوس کے لوگ بھی نظر آ رہے تھے۔

بے اختیار میرے ذہن میں خدشات نے سر ابھارا۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے سوچا کہ خدانہ کرے مسز سیمسن کے ساتھ تو کوئی حادثہ پیش نہیں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی کل رات کے تمام خیالات میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔

بے اختیار میری نظریں اس طرف اٹھ گئیں جہاں سیڑھی کھڑی تھی۔ وہ سیڑھی وہاں اب بھی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

میں بے چینی اور پریشانی کے ساتھ آگے

بڑھا اور ایک پڑوسی سے پوچھا۔ ''رابرٹ کیا مسئلہ ہے۔ یہ بھیڑ کیوں لگی ہوئی ہے؟''

رابرٹ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مسز سیمسن کو رات کسی نے قتل کر دیا۔''

''کیا...... قتل؟'' ایک لمحے کو میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ کل رات جو خدشات میرے ذہن میں جاگے تھے۔ وہ ایک دم صحیح ثابت ہوئے تھے مسز سیمسن قتل کر دی گئی تھی۔

میں بے اختیار مسز سیمسن کے مکان کی طرف دوڑا اور دروازے پر پہنچ کر گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد پولیس کے ایک سپاہی نے دروازہ کھولا۔ اس کے پیچھے مسز سیمسن کی بوڑھی ملازمہ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف اور دہشت ٹپک رہی تھی اور پورا بدن کانپ رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ بے اختیار رو پڑی۔ میں نے کہا۔ ''حوصلہ رکھو۔ گھبراؤ نہیں۔''

پولیس کے سپاہی نے کہا۔ ''آپ کون ہیں اور کس سے ملنا ہے۔''

میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا میں مسز سیمسن کا دوست اور اس کا کاروباری وکیل ہوں۔ پھر میں نے پوچھا ''باہر جو کچھ میں نے سنا ہے کیا وہ سچ ہے کہ مسز سیمسن قتل کر دی گئی ہیں؟''

''جی ہاں...... کسی نے انہیں قتل کر دیا ہے۔''

''کیا...... میں آپ کے آفیسر سے مل سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''جی ہاں...... کیوں نہیں...... آیئے۔''

وہ مجھے لے کر مسز سیمسن کے بیڈروم میں آیا۔ جہاں سادہ لباس میں دو افراد موجود تھے۔ وہ صورت سے ہی سراغ رساں لگ رہے تھے۔

میں نے ان سے اپنا تعارف کروایا اور پھر ان کی اجازت سے اس مسہری کی طرف بڑھ گیا جہاں مسز سیمسن کی لاش پڑی تھی۔ میں نے اس لاش پر سے چادر ہٹائی۔

مسز سیمسن کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا اور گولی پیشانی توڑتی ہوئی دماغ میں کہیں پیوست ہو گئی تھی۔ سارے چہرے پر خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔

مجھے شدید دھچکا پہنچا اور میں نے جلدی سے چادر دوبارہ مسز سیمسن کے چہرے پر ڈال دی۔ مسز سیمسن کا یہ المناک انجام میرے لیے غیر متوقع تو نہیں تھا مگر موت اچانک اور اس طرح آئے گی یہ بھی نہیں سوچا تھا۔

میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ایک سراغ رساں جیف ہنٹر کی طرف مڑ کر بولا۔ ''مسٹر جیف کیا قاتل کے بارے میں کچھ سراغ ملا۔ میرا مطلب ہے کوئی نشان...... یا......''

جیف نے میری بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں مسٹر جیمسن قاتل کے بارے میں ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم قاتل کو جلد ہی گرفتار کر لیں گے۔ آپ کے خیال میں کوئی مسز سیمسن سے ذاتی رنجش یا کسی اور وجہ سے انہیں قتل کرنے کی یہ انتہائی کارروائی کر سکتا تھا؟''

''نہیں......'' میں نے اپنے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو ان سے ذاتی رنجش یا عناد و بغض رکھتا ہو...... ان سے کسی کو کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ یہ قتل کسی دشمنی یا رنجش کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔

''ہوں...... شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' جیف نے کہا۔

اس دوران دوسرا سراغ رساں بڑی باریک بینی سے پورے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا اور جھک

جھک کر ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا اور کسی عدسے سے ایک ایک جگہ کا معائنہ کر رہا تھا۔

میں نے اپنے ذہن میں اٹھتے ہوئے سوال کو جیف کے سامنے دہرایا۔ "کیا یہاں سے کوئی چیز چوری بھی ہوئی ہے؟"

سراغ رساں جیف نے ہنکارا بھرا اور کہا۔ "کمرے کی حالت سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چور کوئی چیز چرانے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ کہیں بھی کوئی افراتفری یا تلاشی وغیرہ کے آثار نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ چور جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا ہوگا مسز سیمسن کی آنکھ کھل گئی ہوگی اور اس نے مسز سیمسن کو گھبرا کر گولی مار دی اور عجلت میں فرار ہوگیا۔"

"مگر آپ لوگوں کو کس وقت اس حادثے کا علم ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی کوئی آدھ گھنٹے پہلے ہمیں ملازمہ نینسی نے اطلاع دی تھی۔ وہ مسز سیمسن کو جگانے بیڈروم میں داخل ہوئی تو اس نے انہیں مردہ حالت میں پایا۔"

"کیا ملازمہ نینسی نے فائر کی آواز سنی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے کسی قسم کے فائر کی آواز نہیں سنی۔"

"اس کا مطلب ہوا کہ فائر کسی سائلنسر لگے ہوئے ریوالور سے کیا گیا۔" میں نے پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ نے ملازمہ نینسی سے یہ پوچھا کہ اس کے خیال میں کوئی چیز چوری تو نہیں ہوئی۔"

"نہیں۔ ابھی تک نہیں پوچھا اور ابھی اس کی درازیں بھی ہم نے نہیں دیکھی ہیں...... یہ مقفل ہیں۔" جیف نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں ملازمہ سے پوچھ لینا چاہیے۔ اس کے بعد کارروائی کرنے میں آسانی رہے گی۔" پہلی بار دوسرے سراغ رساں آرتھر میکائیل نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہوں، ٹھیک ہے۔" جیف نے کہا اور سپاہی فوراً ملازمہ کو بلانے چلا گیا۔

جلد ہی نینسی کمرے میں داخل ہوئی وہ ابھی تک خوفزدہ تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ ہم نے اس سے کہا کہ وہ ذرا یہاں کی چیزوں کو دیکھ کر بتائے کہ کوئی چیز غائب تو نہیں ہے۔

چنانچہ وہ اپنے کانپتے وجود کے ساتھ تمام چیزوں کا جائزہ لینے لگی پھر دفعتاً اس کا وجود زور سے کانپا اور اس نے سنگار میز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"وہ...... وہ سرخ ہیرے کا ہار غائب ہے۔ وہ رات میں نے یہاں سنگار میز پر رکھا تھا۔"

"اوہ ...... میرے خدا۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "سرخ ہیروں کا ہار غائب ہے۔" میرے ذہن میں کل رات کا وہ منظر گھوم گیا جب کچن کی کھڑکی سے میں نے مسز سیمسن کے گلے میں وہ ہار دیکھا تھا اور سوچا تھا کہ اس کی خاطر تو کوئی بھی مسز سیمسن کو قتل کرسکتا ہے۔ اس کے بعد بھی میری چھٹی حس دیر تک مجھے اس ہار سے متعلق خطرے کا احساس دلاتی رہی تھی۔

جیف نے میری بڑبڑاہٹ سن کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"مسٹر جیمسن آپ کے خیال میں کیا اس سے ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے؟"

میں نے اپنے خیالات اور ہیجان پر قابو پایا اور کہا۔ "پتہ نہیں، مسٹر جیف یہ بڑی عجیب سی بات ہے کل رات ہی میں نے اس ہار کے متعلق سوچا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ مسز سیمسن اپنی حماقت سے کوئی

مصیبت کھڑی نہ کرلیں۔ وہ ہر وقت اس قیمتی ہار کی نمائش کرتی تھیں۔ میں نے انہیں کئی بار ٹوکا تھا مگر وہ سنتی ہی نہیں تھیں۔"

"ہوں۔" میکائیل نے معنی خیز نظروں سے مجھے گھورا۔ میں نے اس کی نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ قاتل اس سیڑھی کے ذریعے سے ہی اندر خواب گاہ میں آیا ہوگا۔"

"سیڑھی ...... کون سی سیڑھی ......" جیف نے سوال کیا۔

اور میں نے تفصیل کے ساتھ انہیں بتایا کہ کل شام میں نے ایک سیڑھی خواب گاہ کی کھڑکی کے ساتھ لگی دیکھی تھی۔ شاید مسز سیمسن اپنے مکان پر نیا رنگ کروا رہی تھیں۔ وہ سیڑھی وہاں لگی دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا اور سچ پوچھیں تو اسی وقت میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی تھی۔ میں نے سوچا بھی تھا کہ مسز سیمسن سے کہہ کر یہ سیڑھی وہاں سے ہٹوا دوں مگر پھر میں یہ سوچ کر رہ گیا کہ مسز سیمسن مجھے بزدل سمجھے گی اور میرا مذاق اڑائے گی۔ کاش میں اس وقت انہیں آگاہ کر دیتا تو شاید یہ قتل نہ ہوتا۔"

"ہوں، یقیناً قاتل اسی راستے سے آیا ہوگا۔ چیف نے کہا۔

"آیے ذرا اس کا معائنہ کریں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

مسز سیمسن کی موت میرے لیے بہت اعصاب شکن تھی اور میں سخت تھکن محسوس کر رہا تھا اور جی چاہ رہا تھا کہ بس گھر جا کر بستر پر گر جاؤں اور آرام کروں مگر آج ایک ضروری کیس کے سلسلے میں پیشی تھی اور میرا وہاں پہنچنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ میں جیف اور میکائیل سے اجازت لے کر اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔

مکان کے سامنے سے اب بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ شاید لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے تھے۔ میں پولیس پارٹی کو وہاں چھوڑ کر اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ البتہ ان سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ شام کو آفس سے فارغ ہونے کے بعد میں پولیس اسٹیشن ضرور آؤں گا۔

دن بھر کی مصروفیات کے باوجود میں مسز سیمسن کے بہیمانہ قتل کو نہ بھلا سکا۔ مجھے شدید دکھ اور شاک پہنچا تھا۔ مسز سیمسن سے میرے تعلقات تھے اور ہم برسوں سے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہے تھے اور اب اس کے اندوہناک قتل پر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا کوئی قریبی عزیز قتل ہوگیا ہو۔

شام میں کوئی پانچ بجے کے قریب میں آفس سے نکلا اور سیدھا پولیس اسٹیشن جا پہنچا۔ جیف ہنٹر سے ملاقات ہوئی اور میں نے پہلا سوال چھوٹتے ہی یہ کیا کہ آیا قاتل کا کچھ پتا چلا؟

جیف ہنٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں افسوس ہے مسٹر جیمسن کہ ہمیں مجرم کے بارے میں کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجرم اتنی صفائی سے بغیر کوئی نشان چھوڑے کیسے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔"

"کیا سیڑھی پر یا کہیں اور اس کی انگلیوں کے نشانات وغیرہ نہیں پائے گئے۔" میں نے پوچھا۔

"نشانات تو ملے ہیں مگر خدا جانے وہ کس کے نشانات ہوں۔ ویسے یہ بات تو یقینی ہے کہ قاتل اسی راستے سے اور اسی سیڑھی سے اندر آیا اور اسی سیڑھی کے ذریعے وہ قتل کر کے فرار ہوا۔ اس سلسلے میں چوکیدار کا یہ بیان بھی قابل غور ہے کہ اس نے کوئی ڈھائی بجے کے قریب ایک سائے کو اس سیڑھی کے قریب سے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ وہ گہرے سبز رنگ کا شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے تھا اور اس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چور کسی قریبی مکان سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک چور کے لیے ویسے اس قسم کا لباس کچھ تعجب خیز ہی ہے۔''

''تو کیا چوکیدار نے اس کا تعاقب نہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں...... اس نے تعاقب بھی کیا مگر افسوس کہ وہ ایک دم اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ کیونکہ وہ چوکیدار ذرا دور تھا۔''

''افسوس...... کاش چوکیدار اس بدبخت اور ظالم شخص کو پکڑ لیتا۔'' میں نے تاسف سے کہا۔

جیف نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر جیمسن کیا آپ کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جس کی مسز سیمسن سے کوئی پرخاش یا دشمنی ہو۔''

''ہرگز نہیں...... مسز سیمسن ایک دوست نواز اور مخلص خاتون تھیں اور پھر ان کے کسی سے اس نوعیت کے تعلقات ہی نہیں تھے کہ جہاں رنجشیں عداوتیں جنم لیں۔'' میں نے کہا۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اب ان کی جائداد کا وارث کون ہے؟'' جیف نے سوال کیا۔

''مسز سیمسن کی صرف ایک بھانجی ہے اور وہی اب اس کی جائداد کی وارث ہے۔ وہ کیلی فورنیا میں رہتی ہے۔ میں نے اسے اطلاع کر دی ہے۔ وہ جلد ہی یہاں پہنچ جائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

جیف نے سگار کا کش کھینچتے ہوئے دھواں فضا میں چھوڑا' وہ کچھ سوچ رہا تھا پھر اس نے سگار کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی اور کہا مسٹر جیمسن یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ قاتل صرف ایک ہار لے گیا۔ کمرے میں اور بھی بہت سی قیمتی چیزیں موجود تھیں۔ مگر قاتل نے ان تمام چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ آپ کے خیال میں کوئی ایسا شخص ہے کہ جس کو اس ہار سے کوئی خاص دلچسپی ہو؟''

میں نے بلا تامل جواب دیا۔ ''نہیں مسٹر جیف ایسا کوئی شخص میری نظروں میں نہیں ہے۔ ویسے وہ ہار واقعی بہت قیمتی تھا۔ مگر میں نے آج تک کسی کو اس میں کوئی خاص دلچسپی لیتے نہیں دیکھا کہ اس کے حصول کا خواہاں ہو۔''

''بڑی حیرت انگیز واردات ہے مسٹر جیمسن۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ مجرم چوری کی نیت سے کمرے میں داخل ہوا اور اچانک مسز سیمسن کی آنکھ کھل جانے پر اس نے اسے گولی ماردی اور ہار اٹھا کر بھاگ نکلا۔ شاید یہی حقیقت ہو۔ مگر مجھے کوئی بات بے چین کر رہی ہے۔''

''ہاں...... مسٹر جیف میری بھی کچھ یہی کیفیت ہے۔ یہ بڑا عجیب معمہ ہے۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ اس کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا اور جیف سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر جیف اگر اس سلسلے میں جیسے ہی کوئی نئی بات سامنے آئے مجھے ضرور بتایئے گا۔ اگر میری ضرورت محسوس ہو تو مجھے فون کر لیجیے گا۔''

''ضرور...... ضرور......'' جیف نے کہا اور میں باہر نکل آیا۔

سارے راستے میں اس نامعلوم قاتل کے متعلق سوچتا اور غور کرتا رہا جو صرف ایک ہار چرا کر اور مسز سیمسن کو قتل کر کے فرار ہو جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ واقعی ایک عجیب معمہ تھا۔

گھر آ کر میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر کافی بنا کر بیڈروم میں آ گیا۔ بے اختیار مجھے کل کی شام یاد آ گئی اور مجھے اپنے آپ سے شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ کاش میں کل ہی مسز سیمسن کو خطرات اور اپنے خیالات سے آگاہ کر دیتا

تو آج یہ صورت حال نہ پیش آتی مگر آنے والے واقعات کے بارے میں کون صحیح اندازہ لگا سکتا ہے کہ کل کیا واقعات پیش آئیں گے۔

میں کافی دیر تک خود سے الجھتا رہا اور اس واقعے کے بارے میں غور کرتا رہا۔ پھر میں کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

کھانا کھا کر میں حسب معمول باہر نکل گیا اور جب واپس مکان پر آیا تو سخت تھکن محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اب سونا چاہیے۔

میں بیڈروم میں آیا اور شب خوابی کا لباس پہننے لگا۔ پہلے شرٹ پہنی پھر پاجامہ' اچانک مجھے پاجامے کی جیب میں کوئی سخت سی چیز محسوس ہوئی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس چیز کو باہر نکالا اور پھر میری آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور میرے سارے جسم سے ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے پھوٹ پڑے۔

مجھے لگا کہ جیسے میرا دل دھڑکنا بھول جائے گا۔ پورے جسم میں درد کی ایک لہر سی اٹھی میں نے قریب رکھی کرسی کو تھام لیا اور اس پر بیٹھ گیا۔ بدن حقیقتاً کانپنے لگا تھا اور ہاتھ میں مسز سیمسن کا گمشدہ ہار لرز رہا تھا۔

وہ مسز سیمسن کا ہی ہار تھا جو میرے پاجامے کی جیب میں سے نکلا تھا۔ میری آنکھوں میں خوف کے ساتھ شدید حیرت تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ خواب ہے یا حقیقت...... اگر حقیقت ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے وہ ہار سامنے میز پر رکھ دیا۔ سرخ ہیرا انگارے کی طرح چمک رہا تھا اور میری آنکھوں میں موت کی پرچھائیاں اتر آئی تھیں۔

میں نے جلدی سے قریب رکھی گولیوں کی شیشی اٹھائی اور اس میں سے دو گولیاں نکال کر حلق میں ڈالیں اور پھر پانی کے چند گھونٹ کے ساتھ نگل لیں۔ میرے اعصاب جواب دے گئے تھے اور مجھے خطرہ تھا کہ مجھے دل کا دورہ نہ پڑ جائے۔ اس لیے میں نے دو گولیاں کھائی تھیں۔

''آخر یہ ہار میری جیب میں کیسے آ گیا۔'' میں نے اپنے ہیجان پر قابو پاتے ہوئے سوچا۔ ''کیا کسی نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے مگر ایسا کون ہو سکتا ہے۔ کون اس قسم کا سنگین مذاق کرنے کی جرات کر سکتا ہے۔ کیا مجھے کسی قسم کی سازش میں پھنسایا جا رہا ہے مگر کوئی مجھے کیوں پھنسائے گا مگر وہ میرے مکان میں کس طرح داخل ہوا نہیں ناممکن ہے پھر یہ سب کیا ہے۔ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ کوئی بھیانک خواب مگر یہ خواب تو نہیں ہے۔ حقیقت ہے۔ کھلی حقیقت...... وہ ہار سامنے ہی میز پر پڑا تھا۔

اچانک میں نے سوچا کہ کیا مجھے سوتے میں چلنے کی بیماری تو نہیں ہوگئی۔ نہیں' نہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں رات کو کسی وقت نیند میں باہر نکل گیا ہوں اور...... اور یہ سب کچھ میں نے بلا ارادہ گہری نیند کی حالت میں کیا ہو۔

''اوہ میرے خدا' کیا میں نے مسز سیمسن کو قتل کیا ہے۔ کیا میں ہی اس کا قاتل ہوں۔'' میں بڑبڑایا' میرے ذہن کی رگیں پھٹنے لگیں اور میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

میں لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھا۔ پھر میں نے

اپنی میز کی دراز سے اپنا ریوالور نکال کر دیکھا۔ اس کا چیمبر چیک کیا اور پھر میرے ہاتھوں میں ریوالور کانپ اٹھا۔ چیمبر میں ایک گولی کم تھی۔

میرے شب خوابی کے لباس کا رنگ بھی گہرا سبز تھا...... تو...... تو اس کا مطلب یہ تھا کہ مسز سیمسن کا قاتل میں ہی تھا۔

میری آنکھ میں پھانسی کا پھندا گھوم گیا اور میرا ضمیر مجھے کچوکے دینے لگا۔ میں نے اپنی عزیز دوست کو قتل کر دیا تھا۔ آہ میں اپنی دوست کا قاتل تھا۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نیند میں چلنے والی بیماری میں مبتلا تھا۔ مشی النوم کا شکار تھا اور اسی بیماری کے ہاتھوں میں نے اپنی دوست مسز سیمسن کو قتل کر ڈالا۔

''آہ...... یہ سب کیا ہو گیا۔ اب' اب میں کیا کروں؟ کیا پولیس کو بتا دوں کہ قتل میں نے کیا ہے۔ مسز سیمسن کا قاتل میں ہوں۔ اصل مجرم میں ہوں۔ مجھ سے ہی یہ جرم سرزد ہوا ہے۔

مگر میں کس طرح بتاؤں' کس طرح' سارے شہر میں کس قدر بدنامی ہو گی میں نے سوچا اور پھر بستر پر گر گیا۔ میرا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

سرخ ہیرے کا ہار اب بھی سامنے میز پر پڑا تھا۔ میں نے جھپٹ کر وہ ہار اٹھا لیا۔ میں نے سوچا کہ اس ہار کو کہیں دور پھینک آنا چاہیے۔ کسی گندے جوہڑ میں۔ یا گہرے دریا میں۔ جہاں سے یہ کسی کے ہاتھ نہ لگے۔

پھر اچانک مجھے اپنے شب خوابی کے لباس کا خیال آیا۔ چوکیدار نے اس لباس کو دیکھ لیا تھا۔ کہیں اس پر کوئی اور نشان تو نہیں ہے۔

اچانک میری نظر آستین پر لگے ہوئے ایک دھبے پر پڑی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ وہی رنگ تھا جو مسز سیمسن کی دیوار پر کل نیا نیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اچانک مجھے اپنی شرٹ کا ایک بٹن بھی غائب نظر آیا۔

میں بری طرح سے گھبرا گیا۔ یہ بٹن کہاں گر گیا۔ میں نے بے چینی کے ساتھ سوچا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر میں نے فوری طور پر اس لباس اور اس قیمتی ہار سے پیچھا چھڑانے کے بارے میں سوچا۔ کیونکہ جب تک یہ میرے پاس موجود رہتے میرے لیے خطرہ ہی خطرہ تھا۔

میں نے جلدی سے دوبارہ لباس تبدیل کیا اور شب خوابی کے لباس کو ایک خالی لفافے میں پیک کیا۔ ہار بھی اسی میں رکھا اور باہر نکل آیا۔ باہر آ کر میں اپنی گاڑی میں بیٹھا اور ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔

میرا رخ دریا کی طرف تھا۔ ابھی رات کے دس ہی بجے تھے اور سڑکوں پر خاصی ٹریفک تھی۔ میں خاصی احتیاط سے ڈرائیونگ کر رہا تھا مگر اس کے باوجود بار بار اسٹیئرنگ پر میرے ہاتھ بہک جاتے تھے۔

میں شدید نروس ہو رہا تھا اور میرے اعصاب میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ جلد ہی میں ٹریفک کے اژدہام سے نکل کر اس سڑک پر آ گیا جو دریا۔ اسٹرون کی طرف جاتی تھی۔

یہ ایک چھوٹا سا دریا تھا جو شہر کے وسط میں بہتا تھا۔ اس پر ایک پل بنا ہوا تھا۔ جلد ہی میں پل پہنچ گیا۔ میں نے اپنی گاڑی ایک کنارے پر پارک کی اور گاڑی لاک کر کے نیچے اتر آیا۔ میرے ہاتھ میں وہ خاکی لفافہ دبا ہوا تھا جس میں میرا شب خوابی کا لباس اور مسز سیمسن کا قیمتی ہار تھا۔

اچانک میرے قدم رک گئے۔ کوئی کار میرے قریب آ کر رکی تھی۔ میرا دل بری طرح سے دھڑکنے لگا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ اس میں سراغ رساں جیف ہنٹر اور میکائل بیٹھے ہوئے تھے۔

ان کی آنکھوں میں کوئی بات تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔ جیف ہنٹر نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔

''ہیلو مسٹر جیمسن یہ کہاں کی چہل قدمی ہو رہی ہے؟''

میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''وہ بس ذرا ہواخوری کے لیے نکل آیا تھا۔

''ہوں۔ ہواخوری کے لیے اچھی جگہ ہے۔'' میکائیل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

پھر اچانک جیف نے کہا۔ ''مسٹر جیمسن آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ ہم نے آپ کی دوست مسز سیمسن کے قاتل کا پتا چلا لیا ہے۔''

''کک...... کیا...... کون ہے؟'' میں نے بمشکل کہا۔

میکائل نے اپنی مٹھی میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''اس بٹن کو دیکھ رہے ہیں آپ' یہ قاتل کی شرٹ کا بٹن ہے جو مجھے مسز سیمسن کی خواب گاہ کی کھڑکی کے نیچے سے ملا تھا۔''

''پھر......'' میں نے تھوک نگل کر کہا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرے گرد وہ دونوں اپنا جال کستے جا رہے ہوں۔

اچانک جیف نے کہا۔ ''یہ آپ کے ہاتھوں میں کیا چیز ہے مسٹر جیمسن...... اوہ یہ تو خاکی لفافہ ہے۔ کیا کوئی خاص چیز ہے اس میں۔''

''نہیں...... نہیں...... وہ بس......'' میں ہکلا کر رہ گیا۔

''کیا آپ ہمیں دکھانا پسند کریں گے؟''

میکائیل نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔

اور میں نے سوچا کہ بازی ختم...... لیکن میں نے اپنی سی آخری کوشش کرتے ہوئے چاہا کہ وہ خاکی لفافہ دریا میں پھینک دوں مگر جیف میرا ارادہ بھانپ گیا اور اس نے جھپٹ کر وہ لفافہ مجھ سے چھین لیا۔

میں اپنا سر پکڑ کر ہانپنے لگا۔

ان کی آنکھوں میں فتح مندی کے آثار ابھر آئے۔

سراغ رساں جیف لفافہ پھاڑتے ہوئے بولا۔

''ہم شام ہی سے آپ کی نگرانی کر رہے تھے مسٹر جیمسن' اور ہمیں یقین تھا کہ آپ کسی نہ کسی طرح اپنا یہ لباس ضرور ضائع کرنے کی کوشش کریں گے لیکن سمجھ میں نہیں آتا آپ نے اس ہار کی خاطر مسز سیمسن کو قتل کیوں کیا؟''

''آہ۔'' میرے ہونٹوں سے سرد آہ نکلی۔

میں اس کے اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ کیونکہ انہیں میری بات کا یقین نہیں آتا۔ میں انہیں کس طرح بتاتا کہ یہ قتل میں نے شعوری طور پر نہیں کیا۔ یہ جرم تو لاشعوری طور پر مجھ سے سرزد ہوا ہے۔ اس میں میری نیت کو کوئی دخل نہیں تھا مگر میں کس طرح کہتا۔

مسز سیمسن کے قتل کا معمہ حل ہو گیا تھا مگر میری ذات میں ابھی یہ معمہ نامکمل ہے۔

دوراندیش

اسرار احمد

ہر شخص اپنے تئیں خود کو بہت ہوشیار اور سمجھ دار تصور کرتا ہے۔ لیکن حالات کے آگے ان کی تمام چالاکیاں بے سود ہوجاتی ہیں۔

ایک امیر باپ کا قضیہ' اس نے اپنے بیٹے کو اس کی محبوبہ سے بہت دور کردیا تھا

اس وقت میری جیب میں' زرد رنگ کا ایک بوسیدہ کاغذ تھا جس پر میرے باپ کی وصیت تحریر تھی۔ اس وصیت میں اس نے دعاؤں کے بعد یہ لکھا تھا کہ وہ میرے اور میری بہن کے لیے بھاری قرض چھوڑ کر رخصت ہونے پر مجبور ہے اور یہ کہ خاندانی جاگیر کے رہن ہوجانے کے بعد وہ اسے بہتر سمجھتا ہے کہ ہم دونوں بھائی بہنوں کو تقدیر کے حوالے کر کے موت کو گلے سے لگالے۔

میں نے اپنی جیب میں پڑے ہوئے کاغذ کو ٹٹولا' اس تحریر کی روشنائی ماند پڑ چکی تھی اور اس سے کہیں زیادہ واضح ایک دوسری تصویر تھی جو میرے ذہن میں اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ محفوظ تھی' ایک چودہ سالہ لڑکی اور ایک چوبیس سالہ نوجوان کی تصویر جسے صرف میں دیکھ سکتا تھا۔ وقت نے میرے باپ کی تحریر کے نقوش کو دھندلا دیا تھا لیکن یہ دوسری تصویر وقت کی دستبرد سے محفوظ تھی۔ چنانچہ چوبیس سال بعد جب میں نے ڈانٹن کے دروازے پر دستک دی تو پچھلے صبر آزما اور تکلیف دہ چوبیس برس کے مقابلے میں مجھے وہ چند سیکنڈ کہیں زیادہ دشوار اور صبر آزما محسوس ہوئے جو مجھے دروازہ کھلنے کے انتظار میں گزارنے پڑے۔ میں نے بے چین ہوکر دروازے پر ہاتھ رکھا تو دروازے کے شفیق لمس کو محسوس کرتے ہی میرے سارے وجود میں سلگتی ہوئی انتقام کی آگ سرد پڑ لگی اور اس کی جگہ فخر وانبساط کی ایک لہر نے سرشار کردیا کیونکہ میرے دوسرے ہاتھ میں وہ طاقت تھی جس کے سہارے میں اپنا ماضی خریدنے آیا تھا۔

ڈانٹن نے دروازہ کھولا' پچھلے چوبیس برس میں اس کے سر کے بال سفید ہوگئے تھے لیکن چہرے کے نقوش نہیں بدلے تھے۔ میں نے اسے پہچان لیا لیکن وہ مجھے بدستور اجنبی نظروں سے دیکھتا رہا کیونکہ اب میں چوبیس سال کا دبلا پتلا نوجوان نہیں اڑتالیس سال کا معزز آدمی تھا' فربہ اور خوش پوش۔

''مسٹر ڈانٹن......'' میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے بغیر مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں فلپ ہوں...... کیا میں اندر آسکتا ہوں۔'' میرا خیال ہے میرے طنزیہ لہجے نے اسے بوکھلا دیا۔

''فلپ......؟ فلپ راجرسن...... او گاڈ...... مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔ اندر آجائیے۔ یہ آپ ہی کا گھر ہے۔'' اس عاجزی سے کہا۔

''ہے نہیں...... تھا۔'' میں نے اپنے لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''چوبیس سال پہلے یقیناً میرا گھر تھا اور میں اس میں بغیر اجازت داخل ہو تھا۔ لیکن اب؟''

''اوہ مسٹر فلپ...... خدا کے لیے ایسی باتیں مت کیجیے...... اندر آئیے۔'' وہ پریشان ہوکر بولا۔

چوبیس برس بعد میں نے اس دہلیز کے اندر قدم رکھا جہاں میرا ماضی زندہ تھا اور جہاں میرے ماں باپ کی روح میری منتظر تھی۔ گھر کے اندر کی کوئی چیز نہیں بدلی تھی۔ چوبی زینے کے تختے کچھ گھس گئے تھے اور ان پر قالین کی جگہ گرد پڑی تھی۔ دیواروں کا روغن اڑ گیا تھا اور دروازوں کے پٹ سیاہ پڑ گئے تھے۔ آرائشی فانوس اور فرنیچر' سنہرے فریموں میں سجے ہوئے مصوری کے شاہکار اور قیمتی قالین سب غائب تھے' بلند وبالا نقشین چھت والے کمرے ویران پڑے تھے لیکن مکان کا نقشہ وہی تھا۔

''بیٹھیے مسٹر فلپ۔'' ڈانٹن نے خفت سے ایک کرسی کی گرد جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو اپنے گھر والوں سے ملواتا ہوں۔''

''ڈانٹن۔'' میں نے بادل ناخواستہ کرسی پر ٹکتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف مطلب کی بات کرنے آیا ہوں اور مجھے تمہارے خاندان سے قطعی طور پر کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

ڈانٹن کا چہرہ اُتر گیا۔ ''آپ......؟''

''ہاں۔'' میں نے سوٹ کیس کھولتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہارا اشتہار دیکھ لیا تھا۔ قانونی طور پر اس مکان پر پہلا حق میرا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تم سے کوئی رعایت طلب کررہا ہوں' اس سوٹ کیس میں اتنی رقم ہے کہ جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔'' میں نے سوٹ کیس اس کے سامنے الٹ دیا۔ نوٹوں کا ڈھیر ننگے فرش پر بکھر گیا۔ یہ لمحہ میری زندگی میں کتنے انتظار کے بعد آیا تھا۔

کوئی خریدار تمہیں اس سے زیادہ قیمت دینے کی حماقت نہیں کرسکتا۔ اس رقم میں سے جتنی چاہو رکھ لو سب رکھ لو تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' میں نے پیر سے نوٹوں کے ڈھیر کو سمیٹ کر ایک جگہ کرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ میں اسے زیادہ سے زیادہ ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ باتوں کی آوازیں سن کر ڈانٹن کی بیوی بھی کمرے میں آگئی تھی اور حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ فرش پر پڑے ہوئے نوٹوں کے انبار کو دیکھ رہی تھی ان دونوں کے زرد چہرے دیکھ کر میرے جسم کا رواں رواں مسرت سے سرشار ہوگیا۔ ان کی زبان گنگ ہوگئی تھی اور میری زبان کی کاٹ تلوار کی دھار کی طرح انہیں زخم لگا رہی تھی۔

''ڈانٹن چوبیس برس پہلے تم نے اپنی کمینگی سے میرے باپ کو قتل کردیا تھا۔''

''مسٹر فلپ...... آپ زیادتی کررہے ہیں۔ اس نے خودکشی کی تھی۔'' ڈانٹن نے تیز لہجے میں احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں تم نے اسے خودکشی کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ ایک باعزت آدمی تھا۔ تم نے اس کی جائیداد پر قبضہ کرلیا تھا۔ میں اسے قتل ہی کہوں گا۔ چوبیس سال پہلے تم دولت مند تھے۔ تم نے مجھے اور میری بہن کو دھکے کھانے اور فاقے کرنے کے لیے کھلے آسمان کے نیچے چھوڑ دیا تھا لیکن قدرت نے ایک بار پھر پانسہ پلٹ دیا ہے۔ بتاؤ تم مجھ سے میرے مکان کی کیا قیمت لوگے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں۔''

''میرا اندازہ اس کو پچاس ہزار ڈالر میں فروخت کرنے کا ہے......'' اس نے نوٹوں کے انبار کی مالیت کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ستر ہزار ڈالر ہیں...... لیکن اس کے ساتھ ایک شرط ہے۔ تمہیں شام تک مکان خالی کردینا

ہوگا۔"

اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "لیکن مسٹر فلپ قانونی کارروائی......"

"جہنم میں جائے قانونی کارروائی...... تم نے مجھے اتنی مہلت دی تھی۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "قانونی کارروائی بعد میں ہوتی رہے گی...... اگر تم نے شام تک اسے خالی نہ کیا تو میں سامان کے ساتھ تمہاری لاشیں بھی باہر سڑک پر پھینک دوں گا...... سمجھے۔"

ڈانٹن نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کو سمیٹا۔ "او کے مسٹر فلپ...... مکان آپ کا ہوگیا' لیکن میں بااصول آدمی ہوں۔ آپ باقی بیس ہزار لے جاسکتے ہیں۔" میرے غرور کے شیشے میں بال پڑگیا۔ وہ بیس ہزار ڈالر کتنی آسانی سے ٹھکرا رہا تھا۔

○......○......○

روزا بڑی محنت سے اپنے بالوں کو نئے انداز سے سجا رہی تھی۔ آدھے گھنٹے سے وہ اسی کام میں مصروف تھی۔ "فلپ...... تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟" اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو روزا...... میں پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں۔" میں نے بیزاری سے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"فلپ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تمہارا دل اتنا چھوٹا ہے۔ ہم سے پہلے ہمارے آباؤاجداد بھی یہاں رہے ہیں اور......" اس نے اچانک پلٹ کر میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں ڈانٹن کی صورت سے نفرت کرتا ہوں...... اس نے میرے باپ کو مار ڈالا...... اس نے میری زندگی کے بیس سال مجھ سے چھین لیے اور اب میں اس کے گھر جاؤں۔"

"فلپ ہمارے والد نے یہ مکان شراب اور جوئے میں ہار دیا تھا اور ڈانٹن نے اس کو خرید کر کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ ہمارا باپ اس مکان پر قابض نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ وہ مقروض تھا اور دیوالیہ ہوچکا تھا ایسے ہی جیسے آج ڈانٹن مقروض اور دیوالیہ ہے' اور تم نے اس سے یہ مکان خرید لیا ہے۔ اگر تمہارے پاس دولت نہ ہوتی تو کوئی اور خرید لیتا۔ کیا ڈانٹن کی غربت کے ذمے دار تم ہو' کیا اسی طرح ڈانٹن کی اولاد کو حق پہنچتا ہے کہ تمہیں ذلیل کرے۔ اگر ڈانٹن آج خودکشی کرلے تو کیا اس کے قتل کا الزام تم قبول کرسکو گے؟"

"روزا...... تم میری چھوٹی بہن ہو لیکن مجھ سے بڑی وکیل ہو۔" میں نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

ڈانٹن کا خاندان اب ایک چھوٹے سے گھر میں آباد تھا۔ اس کے گھر میں قدم رکھتے ہوئے مجھے زندگی میں پہلی بار اپنے کمینہ پن کا احساس ہوا۔ ڈانٹن نے مجھے بڑی فراخدلی سے خوش آمدید کہا۔

"یہ میری بیٹی ازابیلہ ہے......" اس نے اٹھارہ سال کی ایک دبلی پتلی مگر حسین لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے آہستہ سے سرخم کیا۔ جواب میں لڑکی نے بڑی دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ "ہماری بڑی عزت افزائی کی آپ نے جناب۔" لیکن میں نے دیکھا اس کی نگاہیں ایلکس پر جم کر رہ گئی تھیں۔

میں جواب دیئے بغیر ایک کونے میں بوسیدہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہاں میرے لیے سب اجنبی تھے اور ان میں سے کوئی بھی میرا اہم رتبہ نہ تھا۔ میں نے

محسوس کیا کہ وہ لوگ بھی مجھ سے کسی قدر خائف تھے۔ چنانچہ میں اکیلا بیٹھا وہسکی پیتا رہا' جس کا ذائقہ اتنا خراب تھا کہ اپنے گھر پر میں اپنے نوکر کے کتے کو بھی ایسی گھٹیا شراب نہ دیتا لیکن روزا نے دو مرتبہ مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ میں اپنے چہرے سے درشتی اور بیزاری کے آثار کم کرکے اور زیادہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کروں۔ ایک بار اس نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے چپکے سے کہا۔ "فلپ اٹھ کر لوگوں سے ملو۔" لیکن میں نے بداخلاق اور مغرور کہلانے کو ترجیح دی۔ ڈانٹن نے رقم کا زیادہ حصہ قرض خواہوں کو ادا کردیا تھا اور باقی رقم سے یہ مکان خرید لیا تھا۔ وہ خود ایک اخبار فروش کی دکان پر ملازم ہوگیا تھا اور اس کی لڑکی ازابیلا معذور بچوں کے اسکول میں پڑھانے لگی تھی۔ انتہائی بدمزہ کھانے کے بعد دیہاتی ذائقے کی کافی پیتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایلکس اور ازابیلا ایک کونے میں کھڑے گفتگو میں مصروف ہیں۔ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے میں ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا لیکن کبھی کبھی ان کے قہقہے کی آواز مجھ تک پہنچ جاتی تھی اور میں ان کے چہروں پر کھلتی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھ سکتا تھا۔ اس مختصر سے مجمع میں ایلکس اپنے قیمتی سوٹ کے علاوہ اپنی مردانہ وجاہت کی وجہ سے بھی بہت نمایاں تھا۔ میں نے ان دونوں کو یکجا دیکھ کر اپنے دل میں ایک خلش سی محسوس کی اور میری چھٹی حس نے مجھے ایک انجانے خطرے سے خبردار کردیا۔

"مسٹر فلپ......" ڈانٹن نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے معذرت آمیز انداز میں کہا۔ "مجھے امید ہے کہ ہم ماضی کی تلخیوں کو فراموش کرسکیں گے۔"

"میرا خیال ہے مسٹر ڈانٹن۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میرے لیے فوری طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں۔" وہ بھونچکا رہ گیا مگر میں اس کی طرف دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھا۔

"ایلکس۔" میں نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ "میں جارہا ہوں میرا خیال ہے رات کافی ہوگئی ہے۔ بہتر ہوگا' اگر تم اور روزا بھی میرے ساتھ چلو۔"

"میں ابھی ٹھہروں گا ڈیڈی۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "آپ آنٹی کو لے جایئے۔"

"روزا۔" میں نے راستے میں کہا۔ "میرا خیال ہے ہم نے ڈانٹن کے گھر جاکر سخت حماقت کی ہے۔ ہمیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔" گاڑی کی روشنی میں نظر آنے والی سڑک دور دور تک خالی تھی۔

"خمیازہ؟" روزا نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔

"ہاں۔" میں نے نظریں سڑک پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اس خبیث ڈانٹن نے ہمارے خلاف سازش کی ہے' لیکن میں اس کے بچھائے ہوئے جال میں نہیں آؤں گا۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی......"

"عورتیں ذرا دیر میں سمجھتی ہیں لیکن تم نے شکل سے بھولی بھالی نظر آنے والی لڑکی کو دیکھا؟"

"تمہارا مطلب ازابیلا سے ہے۔"

"ہاں...... تم نے دیکھا وہ ایلکس سے کس طرح باتیں کررہی تھی۔ اس کا انداز' اس کا لباس' اس کی گفتگو' اس کی مسکراہٹ اور اس کی ادائیں ان سب کا کیا مقصد تھا...... صاف ظاہر ہے کہ وہ ایلکس کو پھانس رہی ہے۔"

"فلپ...... تم ڈانٹن کی نفرت میں حد سے بڑھ گئے ہو۔ جو کچھ تمہاری آنکھوں نے دیکھا' مجھے اس

میں ایک فی صد بھی صداقت نظر نہیں آتی اور نہ الیکس اور ازابیلا کے ذہن میں کوئی ایسی بات ہوگی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم پاگل نہ ہو جاؤ۔"

میں ہنسا۔ "میں پاگل نہیں ہوں۔ روزا۔ میرا سارا کاروبار اور ساری دولت میری عقل اور دور اندیشی کا نتیجہ ہے۔ میں صاف طور پر دیکھ رہا ہوں کہ ڈانٹن نے ازابیلا کے ساتھ مل کر مجھ سے اس جائیداد کو پھر سے چھین لینے کا شیطانی منصوبہ بنایا ہے جسے میں نے چوبیس سال بعد اپنا خون پسینہ ایک کر کے حاصل کیا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ الیکس میرا ایک ہی لڑکا ہے...... اس کی ماں بھی...... اور ظاہر ہے......" میں نے بات نامکمل چھوڑتے ہوئے کہا۔ روزا مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے اسے میری ذہنی صحت کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ہے۔ میں خاموش ہوگیا لیکن جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا تھا وہ نشے کی کیفیت کا نتیجہ نہیں تھا اور میں یہ بات روزا پر ثابت کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسٹڈی میں بیٹھ کر میں نے عمداً دروازے کو نیم وا رکھا تا کہ جب الیکس گھر آئے تو میں اسے دیکھ سکوں۔ نصف شب کے بعد وہ گھر پہنچا تو اسٹڈی کے کھلے دروازے سے اس نے مجھے دیکھا اور اندر آ گیا۔ وہ حسب معمول وجیہہ قد آور اور مضبوط نظر آ رہا تھا' ایک ایسا مرد جسے کوئی بھی لڑکی پہلی ہی نگاہ میں پسند کر سکتی ہے۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو پارٹی پسند نہیں آئی۔" اس نے میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے ایسی بیہودہ پارٹی کے پسند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خصوصاً ان حالات میں۔" میرے لہجے سے بیزاری جھلک رہی تھی اور حالات سے میری مراد اپنے ماضی کے چوبیس سال تھے اور میں آئندہ ان لوگوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق رکھنے کے حق میں نہیں ہوں۔" میرا بیٹا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔ "آپ آج اپنی مرضی سے وہاں گئے تھے۔ اگر آپ اپنے ماضی کو دفن نہیں کرنا چاہتے تو اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"روزا نے مجھے مجبور کر دیا تھا ورنہ وہ لوگ مجھے بالکل پسند نہیں۔"

"ان لوگوں سے آپ کی مراد ازابیلا سے تو نہیں؟" اس نے غیر متوقع طور پر اچانک پوچھا۔

"تم خصوصیت کے ساتھ ازابیلا کے متعلق میرے خیالات کیوں جاننا چاہتے ہو...... جب کہ میں نے اس کا نام بھی نہیں لیا؟" میں نے اس کا سوال لوٹاتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ میں اس سے شادی کرنے والا ہوں۔" اس نے کامل اطمینان اور اعتماد سے جواب دیا۔ کوشش کے باوجود میں اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ سکا۔ غیر ارادی طور پر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔" میں نے گرج کر کہا۔ "میں تمہیں اپنی طرح دور اندیش سمجھتا تھا...... صرف ایک ملاقات کے بعد اتنا بڑا فیصلہ...... اپنی اور اس کی حیثیت کا فرق تو دیکھو...... کیا اس جیسی ناشائستہ اور بدتمیز لڑکی سے جو عمر میں تم سے چار سال بڑی ہے......" شدت جذبات اور صدمے کی انتہا سے میں نے بے ربط جملوں میں اپنی بات مکمل کی' لیکن میرے ہاتھوں میں برانڈی کا گلاس کانپنے لگا۔

"جس طرح آپ ڈانٹن کی دشمنی میں پھوپی جان کے دلائل کو نظر انداز کر دیتے ہیں اسی طرح میں ازابیلا کی محبت میں آپ کے دلائل نظر انداز کرنے پر مجبور ہوں۔ میں صرف آج اس سے ملا ہوں لیکن میں اس کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اگر آپ میری نگاہوں سے اسے دیکھیں۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے گلاس کو دیوار پر مارتے ہوئے کہا۔ اس معاملے کو ڈانٹن کی نگاہوں سے دیکھو' وہ الو کا پٹھا مجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے اس مکان پر ایک بار پھر قبضہ کر لے' جس کے لیے میں نے اپنی زندگی برباد کر لی اور اس ناپاک مقصد کے لیے وہ اپنی بیٹی کو استعمال کر رہا ہے۔" اسی وقت روزا کمرے میں داخل ہوئی۔ ظاہر ہے اس نے ہماری گفتگو سن لی تھی۔

"ڈیڈی......" الیکس کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے معلوم تھا آپ یہ بات کہیں گے' چنانچہ میں اس کا جواب سوچ کر آیا تھا۔ میں شادی کر کے کیلی فورنیا جا رہا ہوں' آپ چاہیں تو مجھے عاق کر سکتے ہیں۔" وہ پلٹا اور کمرے سے نکل گیا۔

"تم نے دیکھا روزا......" میں نے صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔ "میں نشے میں نہیں تھا۔"

"فلپ...... شراب کے نشے سے زیادہ دولت کے نشے نے تمہیں اتنا بے بس کر دیا ہے کہ تم سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہو۔" روزا نے تلخی سے کہا۔ "تم اپنے آپ کو بہت دور اندیش سمجھتے ہو نا...... پہلے تمہاری بیوی تمہاری دولت کو ٹھکرا کر چلی گئی اور اب تمہارے بیٹے کی باری ہے جسے تم کہتے ہو کہ تم اپنی زندگی سے زیادہ عزیز رکھتے ہو...... لیکن میرا خیال ہے یہ مکان تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہے اور اپنی انا۔"

"لیکن روزا......" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "میں نے الیکس کے لیے یہ نہیں سوچا تھا۔ میں نے اس کے مستقبل کے ساتھی کی حیثیت سے ازابیلا جیسی کم حیثیت لڑکی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔"

"ہاں...... تمہارا خیال تھا کہ تم اس کی شادی کسی شہزادی سے کرو گے جبکہ یہ تمہارا معاملہ نہیں تھا...... الیکس تمہارا بیٹا ہے...... غلام نہیں...... اور شاید تمہیں الیکس کی ضرورت زیادہ ہے۔" اس نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ "اسے تمہاری اتنی ضرورت نہیں ہے۔"

"اگر یہ سب لوگ مل کر مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "تو یہ سب غلطی پر ہیں' میں ان سب کو دیکھ لوں گا۔"

O......O......O

دو ہفتے کے بعد میں نے الیکس کو پھر طلب کیا۔ وہ روزا کے سمجھانے کے بعد ہوٹل میں منتقل ہو جانے سے باز آ گیا تھا لیکن اس دوران میرا اور اس کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ ہم ایک ہی چھت کے نیچے اجنبی بن کر زندگی گزارتے رہے اور عمداً ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کتراتے رہے۔ روزا کی معرفت مجھے اس کی مصروفیات کی اطلاعات ملتی رہی تھیں۔ اس نے بیشتر وقت ازابیلا کے ساتھ گزارا اور اب معاملات اس حد تک آگے بڑھ چکے تھے کہ میرا کوئی بھی جذباتی فیصلہ مجھے الیکس سے ہمیشہ کے لیے جدا کر سکتا تھا لہٰذا میں نے ٹھنڈے دل سے بڑے غور و خوض کے بعد ایک منصوبہ بنایا تھا۔ چنانچہ جب الیکس میرے سامنے آیا تو میں اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آیا۔

"الیکس مجھے افسوس ہے' میں نے اس روز تمہارے ساتھ ضرورت سے زیادہ سختی کی۔ میرا خیال ہے' دنیا کے تمام بوڑھوں کی طرح اگرچہ میں ابھی بوڑھا کہلانا پسند نہیں کرتا لیکن بہرحال عمر سے زیادہ ہمارے سوچنے کے انداز میں فرق کی وجہ سے میں

نے طے کرلیا ہے کہ تمہیں ازابیلا سے شادی کی اجازت دے دوں۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں۔'' خلاف توقع اس نے کسی قسم کے خوشگوار ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ ''کیا اس کے ساتھ کوئی شرط بھی ہے۔'' اس نے طنز سے کہا۔

میں اس کی ذہانت پر دنگ رہ گیا۔ وہ بہرحال میرا بیٹا تھا۔

''ہاں...... لیکن وہ شرط نہیں ہے' بلکہ تمہارے لیے چیلنج ہے۔ تم ازابیلا سے شادی کرسکتے ہو...... مگر ایک سال بعد بھی تمہارے جذبات وہی رہے جو اب ہیں تو میں سمجھ لوں گا کہ تم نے کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کیا تھا۔''

''مجھے منظور ہے...... آپ کی دولت کے لیے نہیں...... صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ محبت کا تعلق ہمیشہ دل سے ہوتا ہے۔ یہ بتائیے مجھے کہاں جانا ہوگا۔''

میں نے دل ہی دل میں پھر اس کی ذہانت کا اعتراف کیا۔ ''جہاں تم چاہو...... جزیرہ کیپری یا بالی...... سوئٹزرلینڈ یا کنیڈا...... لیکن اس سے قبل میں ڈانٹن کے خاندان سے ملنا چاہتا ہوں۔ چند ضروری معاملات پر بات کرنے کے لیے...... ازابیلا کی اور تمہاری موجودگی میں۔''

O......O......O

دعوت کی رات میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور ڈاکٹر نے مجھے مکمل طور پر آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے ڈانٹن اور اس کی بیوی کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر بڑے محتاط انداز میں بات شروع کی۔ میری دائیں جانب ایلکس اور اس کے سامنے بائیں ہاتھ والے صوفے پر ازابیلا بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے چہرے مسرت سے گلنار ہو رہے تھے۔

''مسٹر ڈانٹن...... یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میں نے تمہیں یہاں کس لیے بلایا ہے۔ میری صاف گوئی کو معاف کرنا' لیکن میں لگی لپٹی رکھنے کا عادی نہیں ہوں۔ میں اس شادی سے ذرا بھی خوش نہیں ہوں۔ اس لیے نہیں کہ ازابیلا میں کوئی خرابی ہے' اس کا سبب میرا اور تمہارا ماضی ہے۔ جس کا ازابیلا اور ایلکس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے اس شادی سے کیا توقعات وابستہ کی ہیں۔'' یہ سوال بے حد غیر متوقع تھا۔ چند لمحوں تک کسی نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بالآخر ڈانٹن نے اس سکوت کو توڑا۔

''مسٹر فلپ جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا...... آپ نے اچھا کیا جو صاف گوئی اختیار کی۔ میرا خیال ہے میں بھی آپ کو صاف صاف بتادوں کہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میں نے دولت دیکھی ہے لیکن اب میں اپنی بیٹی کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا...... جو کچھ کرنا ہے وہ آپ ہی کو کرنا ہے۔''

''مجھے نہیں مسٹر ڈانٹن...... جو کچھ کرنا ہے' وہ ایلکس کو کرنا ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''آپ کی بیٹی سے ایلکس شادی کررہا ہے' میں نہیں......''

''لیکن ایلکس آپ کا اکلوتا بیٹا ہے...... اور آپ اس بات کو یقیناً پسند نہیں کریں گے کہ وہ ازابیلا کی کمائی کھائے۔'' ڈانٹن نے اس طرح میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''پسند یا ناپسند کا کوئی سوال اگر ہے تو وہ ایلکس کے لیے...... میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں' وہ نوجوان ہے' تعلیم یافتہ ہے۔ وہ اپنی زندگی خود بنا سکتا ہے۔ ایسے ہی جیسے میں نے اپنی زندگی کو کسی کی مدد کے بغیر بنایا ہے۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''میں اس میں اپنی بے عزتی نہیں سمجھتا۔''

''بہت خوب......'' ڈانٹن نے طنز سے کہا۔ ''آپ شاید اپنی دولت کی بات کررہے ہیں...... لیکن آپ یہ بھول رہے ہیں کہ تقدیر بھی بہرحال کوئی چیز ہوتی ہے...... آج کل کے حالات مختلف ہیں۔''

''میں حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔'' ایلکس نے جوش سے کہا۔

''لیکن وہ آپ کی دولت کا واحد وارث ہے۔'' ڈانٹن کی بیوی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اسی کی ہے۔''

''آپ نے صحیح فرمایا محترمہ...... لیکن میری موت کے بعد...... اور میرے باپ کو چھوڑ کر میرے خاندان میں لوگوں کی عمر عموماً اسی اور نوے سال کے درمیان ہوتی ہے چنانچہ میری آدھی زندگی ابھی باقی ہے...... آپ کی زندگی میں آپ کی یہ خواہش شاید پوری نہ ہوسکے گی۔'' روزا نے مجھے غصے سے دیکھا ایلکس کے چہرے سے ایک لمحہ پہلے کی مسکراہٹ بجھ گئی اور ڈانٹن کا چہرہ ذلت کے احساس سے سفید پڑ گیا۔ وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ کوئی لفظ کہے بغیر اس کی بیوی اور بیٹی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ازابیلا......'' ایلکس نے اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میری بات تو سنو۔''

''ایلکس۔'' ازابیلا نے رکے بغیر کہا۔ ''تمہارے والد کو اپنی دولت اور میرے والد کو اپنی عزت زیادہ عزیز ہے۔ میں کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں۔'' وہ تینوں باہر نکل گئے۔ ایلکس کچھ دیر دروازے میں کھڑا انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا چند لمحوں تک وہ انتہائی نفرت وحقارت سے مجھے دیکھتا رہا' لیکن میں اس کے لیے تیار تھا۔

''میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔'' اس نے میرے سامنے آکر کہا۔ ''آپ نے اس شیطانی ڈرامے میں ولن کا کردار بڑی خوب صورتی سے ادا کیا۔'' اگر کسی اور وقت کوئی اور مجھ سے یہ الفاظ کہتا تو میں اس کے تھپڑ مار دیتا۔

''احمق مت بنو۔ میں تم پر صرف یہ بات ثابت کرنا چاہتا تھا کہ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ وہ صرف میری دولت کے لیے ازابیلا کی شادی تم سے کررہے تھے۔ اس دولت سے تم ازابیلا جیسی سیکڑوں لڑکیاں خرید سکتے ہو۔''

''لیکن بیوی خریدی نہیں جاتی۔'' میں نے مشتعل ہوئے بغیر کہا۔ وہ اپنا سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرا تیر نشانے پر لگا تھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے جو کچھ میں نے کہا تھا وہ صحیح تھا۔'' میں نے شفقت سے کہا۔ ''تم اگر چاہو تو کل ہی اس سے شادی کرسکتے ہو...... لیکن تم نے دیکھ لیا...... وہ تمہیں نہیں تمہاری دولت کو چاہتی ہے...... اور میری دولت بہرحال تمہاری ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی تمہیں بے وقوف بنا کر یہ دولت چھین لے۔'' اسے دل شکستہ اور شکست خوردہ دیکھ کر میں ایک بار پھر اپنی دور اندیشی کا قائل ہوگیا۔

''شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں...... کم از کم ازبیلا کو تو میری بات سننی چاہیے تھی۔'' وہ مایوسی سے بولا۔ ''خیر میں پروگرام کے مطابق کل جارہا ہوں...... مجھے آپ کی دولت اور ازابیلا کی محبت دونوں نے مل کر تباہ کردیا ہے۔'' وہ اُٹھا اور نڈھال انداز میں چلتا

ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

○......○......○

اس دن موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ میں رات کا کھانا کھانے سے پہلے چھڑی لے کر تفریح کے لیے نکلا۔ میرا ارادہ تھا کہ قصبے کے آخری سرے پر پہاڑی تک پیدل چکر لگا کر آؤں گا۔ راستے میں ڈانٹن کا گھر بھی پڑتا تھا' تین کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا مکان جس کے درو دیوار مکینوں کی غربت کا پتا دیتے تھے۔ گزشتہ ایک سال کے دوران ان کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بلکہ وہ کچھ اور غریب ہو گئے تھے' بوڑھے ڈانٹن کو اخبارات کی ایجنسی نے برطرف کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ صبح کے اخبارات کی تقسیم میں عموماً دیر کر دیتا تھا اور گاہک شکایت کرتے تھے کہ انہیں ناشتے سے پہلے اخبار نہیں ملتا۔ اب ان کی گزر اوقات ازابیلا کی ملازمت سے حاصل ہونے والی آمدنی پر تھی۔ میرے نزدیک اس راستے سے ہو کر گزرنے کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو ڈانٹن کی مالی حالت کی ابتری دیکھ کر سکون حاصل کرنا' کیونکہ اپنے آبائی مکان سے نکالے جانے کے بعد میں نے اتنے دکھ اٹھائے تھے اور اتنی محنت کی تھی کہ میری صحت تباہ ہو گئی تھی اور میں دل کا مریض بن گیا تھا۔ دوسرے میں ایلکس کی جدائی کے بعد ازابیلا کے جذبات کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ عموماً مجھے نظر آ جاتی تھی۔ کبھی دھلے ہوئے کپڑے پھیلاتے ہوئے' کبھی اسکول جاتے ہوئے یا واپسی پر' لیکن اس نے ہمیشہ مسکرا کر سلام کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ پچھلے ایک سال کے پہلے چھ ماہ میں مجھے ایلکس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی' پھر اس کے خط باقاعدگی سے آنے لگے' وہ شہر شہر گھوم کر تجربہ حاصل کر رہا تھا۔ کاروباری اعتبار سے بھی اس کا یہ دورہ میرے لیے بڑا فائدہ مند ثابت ہوا۔ اس نے دوسرے شہروں میں میرے لیے بہت اچھے گاہک بنائے اور کمپنی کی ساکھ میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ میرا صحیح جانشین ثابت ہو رہا تھا۔ میں ایلکس کی طرف سے بالکل مطمئن تھا لیکن ازابیلا کو دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ میں یہ بات فراموش نہیں کر سکتا تھا کہ کس طرح اس نے اپنے باپ کے شیطانی منصوبے میں' اس کا ساتھ دے کر ایلکس کو محبت کے نام پر دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ اگر اسے ایلکس سے محبت ہوتی تو وہ خودکشی کر لیتی' اپنے باپ کو چھوڑ دیتی یا کم سے کم اس صدمے سے بیمار پڑ جاتی لیکن میں نے اسے ہمیشہ مسکراتے دیکھا' اس کے گالوں کی سرخی میں کوئی کمی نہیں آئی اور نہ ہی اس نے ایک بار بھی مجھ سے ایلکس کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اس کی بے حسی اور سنگدلی اس کے جرم کا سب سے بڑا ثبوت تھی۔

اس دن بھی جب میں اس کے گھر کے سامنے سے گزرا تو وہ اپنے دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ حسب معمول مسکرائی اور مجھے سلام کیا۔

''ہیلو ازابیلا...... کیا حال ہے؟'' میں نے پہلی مرتبہ خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''بڑی خوب صورت شام ہے مسٹر فلپ۔'' اس نے رسماً کہا۔ اس وقت بہت ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔

''ہاں...... میں بھی محض تفریح کے ارادے سے نکلا تھا۔'' میں نے چھڑی سے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی ایسے وقت میں پیدل چلنا بڑا اچھا لگتا ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ پہاڑ کی سمت بڑھنے لگے۔

''ایلکس آج کل کیپری میں ہے...... مجھے آج ہی اس کا ایک خط ملا ہے۔'' میں نے اس کی صورت کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

'''اچھا؟'' اس نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار کیے بغیر سپاٹ آواز میں کہا۔ ''کیا حال ہے اس کا؟'' مجھے اس کی بے رخی کا انداز بڑا برا لگا۔ یہی وہ لڑکی ہے جو سال بھر پہلے ایلکس کی محبت میں دیوانی ہونے کا دعویٰ کرتی تھی اور اب اس کا ذکر یوں کر رہی ہے جیسے وہ کوئی اجنبی ہے...... جسے وہ جانتی ہی نہیں۔

''وہ بہت مزے میں ہے۔'' میں نے اسے جلانے کے لیے کہا۔ ''اس نے لکھا ہے کہ سیاح لڑکیاں ہر وقت اس کے پیچھے لگی رہتی ہیں۔'' وہ ہنسی لیکن اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''ایلکس بہت اسمارٹ ہے...... وہ ٹینس بہت اچھی کھیلتا ہے۔ ظاہر ہے اسے لڑکیوں کی کیا کمی؟''

''تم بھی تو ایک زمانے میں اسے پسند کرتی تھیں۔''

''جی ہاں......'' وہ خفت سے بولی۔ ''وہ میری حماقت تھی۔''

''حماقت۔'' میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ یہ لڑکی پھر مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔

''آج سے چھ مہینے پہلے مجھے ایلکس نے بھی یہی لکھا تھا۔ اس کا خط میرے پاس محفوظ ہے...... میرا خیال ہے اس نے سمجھ لیا تھا کہ تم اتنی بھولی نہیں ہو جتنی نظر آنے کی کوشش کرتی ہو۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں اپنے کیے پر ذرا ندامت نہیں ہوئی...... تم نے اسے بڑی آسانی سے فراموش کر دیا ہے۔''

''ان باتوں سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ مسٹر فلپ۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا ایلکس کا پیچھا چھوڑ دو...... میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اب آپ کو شکایت ہے کہ میں نے اسے فراموش کر دیا ہے۔ آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''ہاں اسی بات پر تو مجھے حیرت ہے مگر تم جیسی لڑکیاں سب کچھ کر سکتی ہیں ایلکس تمہاری محبت میں دیوانہ تھا لیکن تم محض ڈرامہ کر رہی تھیں۔ میں پوچھتا ہوں تمہیں اس کی زندگی سے کھیلنے کا کیا حق تھا؟''

''حق؟'' وہ رک گئی۔ ''حق کیا ہو سکتا ہے مسٹر فلپ خصوصاً میری جیسی لڑکی ایلکس پر اپنا حق کیسے جتا سکتی ہے...... مجھے معلوم تھا کہ وہ آپ کا بیٹا ہے...... وہ آپ سے مختلف نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ ورنہ مجھ میں ایسا کون سا سرخاب کا پر لگا تھا کہ وہ آپ کو اور آپ کی جائیداد کو چھوڑ دیتا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں سول میرج کر لوں۔''

میں رک گیا۔ یہ اطلاع میرے لیے بالکل نئی تھی۔

''پھر......؟ تم دونوں بالغ تھے شادی کر سکتے تھے۔''

وہ تلخی سے ہنسی۔ ''وہ مجھ سے کہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ کیلی فورنیا چلی جاؤں لیکن میں نے انکار کر دیا مجھے معلوم تھا کہ وہ بعد میں پچھتائے گا۔ اس کی شکل وصورت' عادات واطوار آپ سے ملتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ بھی دولت سے اتنی ہی محبت کرتا ہوگا...... بعد میں وہ اپنی غربت کا الزام مجھے دیتا۔ محبت کا نشہ دو دن میں ہرن ہو جاتا' اسے محنت مزدوری کرنی پڑتی اور اس کا نتیجہ تلخی کے سوا کچھ نہ نکلتا اور انجام طلاق کے سوا کچھ نہ ہوتا لیکن کیا میں یہ ساری باتیں

الیکس سے کہہ سکتی تھی...... کیا میں اپنے خدشات کا اظہار کرسکتی تھی۔"

میرے دل میں اس لڑکی کے لیے ہمدردی کا تھوڑا سا جذبہ پیدا ہوا۔

"مسٹر فلپ جب کوئی کم حیثیت اور معمولی شکل وصورت کی لڑکی الیکس جیسے لڑکے کی محبت میں گرفتار ہوجائے تو آپ کی طرح کوئی بھی اسے محبت نہیں سمجھتا۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"تمہیں کون معمولی شکل وصورت کی لڑکی کہہ سکتا ہے۔ تم بہت حسین ہو۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"صورت تو دو دن میں بگڑ جاتی ہے مسٹر فلپ...... اور اس کے ساتھ ہی الیکس کے جذبات بھی بدل جاتے۔ وہ آپ کی دولت کے بدلے محبت کے اس سودے کو مہنگا سمجھنے لگتا۔ ذہنی طور پر وہ آپ سے مختلف تو نہیں ہے۔" میں نے دیکھا آنسو اس کے گالوں پر سے بہتے ہوئے اس کے کپڑوں میں جذب ہو رہے تھے۔ "چنانچہ میں نے خود ہی اس سے شادی کرنے سے انکار کردیا۔"

"تو تم واقعی اس سے محبت کرتی تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں غلط سمجھا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ ڈانٹن کا گھر آ گیا تھا۔ میں نے محبت سے اس کو تھپکی دی۔ "تم نے واقعی بڑی دوراندیشی کا ثبوت دیا۔ تم بہت بہادر لڑکی ہو۔"

"شکریہ مسٹر فلپ......" وہ مسکرائی۔ "اب تو بات ختم ہوچکی...... اب اس کا ذکر ہی کیا۔"

وہ ہفتہ میں نے بڑے کرب میں گزارا۔ مجھے بار بار اپنے ظلم کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے ایک سیدھی سادی محبت کرنے والی لڑکی کے دل کو توڑ دیا تھا۔ آہستہ آہستہ میری دولت کا نشہ اترنے لگا اور میں اس واقعے پر ایک عام انسان کی طرح غور کرنے کے قابل ہوگیا۔ اگر الیکس کی شادی ازابیلا سے ہوجاتی تو یقیناً وہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوتی لیکن ایسا اسی صورت میں ممکن تھا جب وہ ڈانٹن کی بیٹی نہ ہوتی۔

اسی ہفتے میں نے الیکس کو لکھا کہ وہ گھر آجائے۔ میں کاروبار مکمل طور پر اس کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔

اس کے آنے سے پہلے ایک شام میں نے روزا سے ازابیلا کا ذکر چھیڑا...... "روزا" میں نے کہا۔ "کاش ازابیلا کسی اور کی بیٹی ہوتی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا۔" روزا نے طنز سے کہا۔ "ہاں وہ کروڑ پتی باپ کی بیٹی ہوتی تو اور بات تھی۔"

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں نے زیادتی کی۔ معلوم نہیں الیکس کے جذبات کیا ہیں۔" لیکن بہت جلد مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ الیکس اسے قطعی فراموش کرچکا تھا۔ واپس آنے کے بعد اس کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ اس نے ایک اسپورٹس کار خرید لی، باقاعدگی سے ٹینس کھیلنے لگا اور کاروبار میں دلچسپی لینے لگا۔ اس نے ایک بار بھی ازابیلا کا ذکر نہیں کیا۔ روزا کی معرفت مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس نے ازابیلا سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ تاہم اپنا اطمینان کرلینے کے لیے میں نے ایک ضیافت کا اہتمام کیا اور اس میں خاص طور سے ازابیلا کو مدعو کیا۔

میں اور الیکس دروازے پر کھڑے ہوئے مہمانوں کا استقبال کرتے رہے۔ ہم دونوں ایک جیسا قیمتی نیلا سوٹ پہنے ہوئے تھے اور دونوں کی ٹائی پن ہیرے کی تھی۔ الیکس ہوبہو میری تصویر تھا اور اسے دیکھ کر میرا سر فخر سے بلند ہو رہا تھا۔ وہ نسبتاً سنجیدہ ہوگیا تھا اور بڑے باوقار اور شائستہ انداز میں مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا اور ان سے ہاتھ ملا

رہا تھا۔ مجھے بڑی بے چینی سے ازابیلا کا انتظار تھا لیکن میں اپنے دلی جذبات کو چھپانے کی پوری کوشش کررہا تھا۔ بالآخر وہ دروازے میں نمودار ہوئی ہمیشہ کی طرح سادہ مگر خوب صورت کپڑوں میں۔ گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ اور معصوم اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ الیکس سے ہاتھ ملا کر اس کی خیریت پوچھی اور مہمانوں میں شامل ہوگئی۔ الیکس نے بھی رسمی طور پر اس کا حال پوچھا اور پھر دوسرے آنے والے مہمان کی طرف بڑھ گیا۔ اس تمام عرصے میں میری آنکھیں ان دونوں کے چہروں کا بغور مطالعہ کرتی رہیں لیکن ان کے چہرے ہر قسم کے جذبات سے عاری تھے۔ محبت کی وہ روشنی جو سات پردوں سے بھی جھلکتی ہے ان کی آنکھوں میں کہیں نہ تھی۔ پارٹی کے دوران بھی میں نے ان کی حرکات وسکنات پر نظر رکھی لیکن وہ ایک دوسرے سے یوں بے نیاز تھے جیسے وہ ایک دوسرے سے واقف ہی نہ تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میری دوراندیشی نے مجھے ایک بہت برے انجام سے بچالیا تھا۔

رات گئے پارٹی ختم ہونے سے پہلے ازابیلا نے اجازت چاہی میں نے الیکس کو حکم دیا کہ وہ ازابیلا کو گھر چھوڑ آئے۔ ان کے باہر نکلنے سے پہلے میں پچھلے دروازے سے نکل گیا اور اس راستے پر چھپ کر بیٹھ گیا جہاں سے گزر کر انہیں باہر جانا تھا۔ پھر میں نے ان کی باتوں کی آواز سنی۔ وہ اسی جھاڑی کے قریب آ کر رک گئے۔ جس کے پیچھے میں چھپا بیٹھا تھا۔ میرے سامنے الیکس نے ازابیلا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر چوما۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

"الیکس...... میں اور انتظار نہیں کرسکتی...... میرے اعصاب، جواب دے رہے ہیں...... میں پاگل ہوجاؤں گی۔" ازابیلا نے روتے ہوئے کہا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو، جہاں تم نے ایک سال گزارا ہے، کچھ وقت اور سہی...... دوراندیشی کا یہی تقاضا ہے۔" وہ اسے چومتے ہوئے بولا۔

"لیکن اس بات کا کیا بھروسہ کہ اب ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر بولی۔ "میں زیادہ دن اداکاری نہیں کرسکتی۔"

"چند دن اور میری جان...... میں ڈاکٹر سے ملا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ میرے باپ کا دل بہت زیادہ بڑھ گیا ہے...... وہ اب بہت کم دن زندہ رہے گا۔ چند ہفتے یا شاید چند مہینے۔" وہ آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے دروازے کی طرف چلنے لگے اور ان کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں۔ میں نے الیکس سے اس کی محبت چھینی تھی۔ اس نے مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا اور اب وہ میری جائیداد کا واحد وارث تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ دوراندیش ثابت ہوا تھا۔

قسط نمبر 8

بازی گر

حسام بٹ

وقت سب سے بڑا بازی گر ہے۔ اس کی بازی گری اور رنگا رنگی عجیب تماشے دکھاتی ہے جو لوگ وقت کی آواز نہیں سمجھتے وہ اس کا شکار ہوکر حالات کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ گزرے ہیں جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں وقت کی باگیں موڑ دیں حالات کا رخ تبدیل کرکے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ تاریخ میں امر ہوکر رہ گئے۔ آج ان کا نام فخر سے لیا جاتا ہے۔

ایک آشفتہ سر نوجوان کی سرگزشت' اس نے پھولوں کی چاہ کی تھی مگر حالات نے اس کا دامن کانٹوں سے بھردیا لیکن اس نے وقت کے آگے سپر ڈالنے کی بجائے اس سے مقابلے کی ٹھان لی تھی۔

سطر سطر تجسس قدم قدم ہنگامے لیے نئے افق کی دلچسپ ودلکش سلسلے وار کہانی

کسی چیز کی اہمیت کا تعین وقت اور حالات کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ بعض مخصوص غیر متوقع حالات میں معمولی سی بات بھی ایٹم بم کی مانند سر پر گرتی محسوس ہوتی ہے اور اگر بڑی سے بڑی بات کی بھی پہلے سے توقع ہو تو انسانی ذہن اس صدمے کو جھیلنے کے لیے دل وجاں سے تیار ہوتا ہے۔ ان لمحات میں، میں اول الذکر کیفیت سے گزر رہا تھا۔

شہزاد کے ساتھ، جنید خان اور فرحانہ کے تبادلے کی ڈیل فائنل ہونے کو تھی کہ اس کے ایک برے کی مانند تیکھے اور نکیلے جملے نے گویا میرے دماغ کو چھید ڈالا تھا۔ اس کے منحوس الفاظ بے رحم سفاک بگولوں کی مانند میری کھوپڑی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکرا رہے تھے اور میری سوچ کو تہ وبالا کر رہے تھے۔

''بھولے بادشاہ! مطلب مجھ سے پوچھ رہے ہو۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ ''آج صبح سے تمہارے دروازے کے سامنے صف ماتم بچھی ہے۔ ہم نے تو اس خیال سے اپنے بندے تمہاری نگرانی سے ہٹالیے تھے کہ.....''

بس اس کے آگے میں کچھ نہیں سن سکا تھا۔ ''صف ماتم'' کے الفاظ نے میرے دماغ کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔ میرے دروازے کے سامنے صف ماتم بچھنے کا مطلب یہی تھا کہ میرے گھر کے اندر خیریت نہیں۔ امی یا شازیہ کے ساتھ کوئی ناگہانی ہوگئی ہے۔ میں نے رات صدر والے گودام سے لگ بھگ پونے چار بجے فون کیا تھا مگر تین چار بار کی کوشش کے باوجود بھی فون اٹینڈ نہیں ہوا تھا اور میں نے یہی سمجھ لیا تھا کہ شاید امی اور شازیہ اس وقت گہری نیند میں ہیں۔ امی کی طبیعت تو ویسے بھی بڑی غیر یقینی رہتی تھی۔

''میرا خیال ہے، تم اس وقت اپنے گھر پر نہیں ہو۔'' شہزاد کی آواز نے مجھے اپنی جگہ پر حاضر ہونے پر مجبور کردیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''ورنہ تم مجھ سے یہ سوال نہ کرتے کہ..... کون سی میت، کس کی میت؟''

''ہاں ...... میں اس وقت گھر میں نہیں ہوں۔'' میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ ''اب بتاؤ، تم کیا کہہ رہے تھے۔ میرے گھر کے سامنے صف ماتم کیوں بچھی ہے..... ایسی کون سی قیامت آگئی ہے وہاں؟''

''قیامت تمہارے پڑوس میں آئی ہے۔'' شہزاد کی آواز نے مجھے ایک نئے زاویے سے دہلا کر رکھ دیا۔

''رات گئے فرحانہ کے باپ کی ڈیتھ ہوگئی ہے وہ صف ماتم اسی سلسلے میں بچھی ہے۔''

''میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے لائن کاٹ دی۔

''ماجد.....!'' میں نے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے شہزاد کی پوری بات سنی ہے نا؟''

آواز بہ مشکل میرے ہونٹوں سے جدا ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے حلق کے اندر ببول کے کانٹے اگ آئے ہوں۔ ماجد نے اثبات میں گردن ہلائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم فوراً اپنے گھر فون کر کے اس خبر کی تصدیق کرو۔ ہم آنکھیں بند کر کے شہزاد پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے اپنے سیل فون سے گھر کا نمبر ٹرائی کرتے ہوئے کہا۔ ''شہزاد اور اس کا پرائیویٹ باپ ندیم شیروانی جس قماش کے لوگ ہیں ان پر کسی بھی صورت اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔''

''تم نے آخری بار اپنے گھر والوں سے کب رابطہ کیا تھا؟'' ماجد نے پوچھا۔

''جب تم جنید خان کو ٹھکانے لگانے گئے ہوئے تھے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لگ بھگ پونے چار بجے، تمہاری واپسی سے پندرہ منٹ پہلے۔''

''جب تک ادھر سب خیریت تھی نا؟''

''مجھے نہیں معلوم!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''اس وقت گھر والوں سے میرا رابطہ نہیں ہوسکا تھا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''دوسری جانب گھنٹی بجتی رہی مگر فون کسی نے اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد گھر فون کرنے کا نہ موقع ملا اور نہ ہی خیال آیا اور اب......'' میری آواز میں تعجب در آیا۔ ''اب بھی کوئی فون نہیں اٹھا رہا۔ بیل جارہی ہے۔''

''مجھے لگتا ہے تمہاری فیملی کے لوگ میت والے گھر میں ہوں گے۔'' ماجد نے خیال آرائی کی۔ ''اگر شہزاد کی فراہم کردہ اطلاع درست ہے تو یہ ایک عظیم سانحہ ہوگا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو......'' اچانک مجھے ماجد سے توجہ ہٹانا پڑ گئی۔ دوسری جانب فون اٹینڈ ہوگیا تھا۔ مجھے شازیہ کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو''

''ہاں شازی، یہ میں ہوں۔'' میں نے بندئی سے کہا۔

''بھائی جان......'' اس کی آواز کپکپا گئی۔ ''آپ کہاں ہیں...... آپ کو پتا ہے...... یہاں کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟''

شازیہ کی بھیگی ہوئی آواز نے شہزاد کی فراہم کردہ اطلاع کی تصدیق کردی۔ اس کے لہجے سے ٹپکتی ہوئی پریشانی نے میرے دل کی عجیب حالت کردی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں، مجھے سب معلوم ہے شازی۔ رات کو انکل خالق کا انتقال ہوگیا تھا اور اس وقت باہر گلی میں صف ماتم بچھی ہے۔''

''میں انہی کے گھر میں تھی۔'' شازیہ نے قدرے سنبھلتے ہوئے بتایا۔ ''امی بھی ادھر ہی ہیں۔ یہ تو میں کسی کام سے گھر آئی تھی کہ فون کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی نے مجھے متوجہ کرلیا اور جب فون اٹینڈ کیا تو آپ کی آواز سنائی دی......'' لمحے بھر کو رک کر اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”بھائی جان! آپ اس وقت کہاں ہیں اور انکل خالق کے بارے میں آپ کو کس نے بتایا ہے؟“

رات کے ابتدائی حصے میں میری جب شازیہ سے بات ہوئی تھی تو اس وقت میں نے عاطف رشید صاحب کے آفس سے اپنے گھر فون کیا تھا۔ جبھی مجھے پتا چلا تھا کہ بیٹی کی جدائی نے عبدالخالق صاحب کے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ انہیں دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ اسپتال پہنچ گئے تھے۔ اس وقت میں نے شازیہ سے دوبارہ رابطہ کرنے کا کہہ کر ٹیلی فونک سلسلہ منقطع کر دیا تھا لیکن بدقسمتی سے اس کے بعد مجھے اس کام کا موقع نہیں ملا تھا اور پچھلی رات جب صدر والے گودام سے میں نے اپنے گھر فون کیا تو کسی نے کال اٹینڈ نہیں کی تھی۔

”میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں میری گڑیا۔“ شازیہ کے سوال کے جواب میں‘ میں نے بتایا۔ ”اور خالق انکل کی موت کی اطلاع مجھے میرے دشمنوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی دی ہے۔“

”دشمنوں نے......“ اس کی آواز میں خوف سمٹ آیا۔ ”آپ کا مطلب ہے‘ وہ لوگ جنہوں نے فرحانہ کو اغوا کیا تھا؟“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں جواب دیا پھر پوچھا۔ ”رات کو پونے چار بجے میں نے فون کیا تھا۔ کسی نے کال اٹینڈ نہیں کی تھی۔ کیا تم لوگ گہری نیند سو رہے تھے یا......“

”یا“ کے بعد شازیہ نے مجھے بولنے کا موقع نہیں دیا اور بتانے لگی۔ ”انکل خالق کی ڈیتھ رات تین بجے ادھر اسپتال ہی میں ہوئی تھی۔ میں اور امی اسپتال گئے ہوئے تھے۔ حالانکہ امی کی طبیعت کے پیش نظر میں نے انہیں گھر میں روکنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن انہوں نے میری ایک نہیں سنی اور میرے ساتھ ہی اسپتال پہنچ گئیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میں تم سے لمبی بات نہیں کر سکتا‘ جلدی سے میرا سیل نمبر نوٹ کر لو۔“

”آپ کا سیل نمبر تو میرے پاس ہے مگر وہ مسلسل آف آ رہا ہے۔“ وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

”اس نمبر کو فی الحال بھول جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”یہ میرا نیا نمبر ہے جس سے میں اس وقت بات کر رہا ہوں۔ اب اسی نمبر پر تم مجھ سے رابطہ کر سکتی ہو۔“

اس نے نمبر نوٹ کرنے کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بھائی جان! آپ جلدی سے گھر آ جائیں نا......ہم آپ کے لیے بہت پریشان ہیں۔“

”آپ بالکل پریشان نہ ہوں مجھے اللہ کے فضل و کرم سے کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ ”میں خالی ہاتھ واپس نہیں آنا چاہتا۔ میں انکل خالق کو تو واپس نہیں لا سکتا‘ البتہ فرحانہ کو اس کی ماں تک ضرور پہنچا کر دم لوں گا۔“

”رات آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے فرحانہ کا سراغ لگا لیا ہے‘ اور بہت جلد آپ اسے حاصل کر لیں گے۔“ شازیہ نے پوچھا۔ ”بھائی جان! آپ کی وہ کوشش کس حد تک کامیاب ہو سکی ہے؟“

”میں فتح و کامیابی سے چند قدم کی دوری پر کھڑا ہوں شازی۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ان شاءاللہ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے فرحانہ اپنے گھر میں ہوگی۔“

”اس گھر میں بھائی جان......“ شازیہ روہانسی ہوگئی۔ ”جس گھر میں سے آج اس کے باپ کا جنازہ اٹھنے والا ہے۔“

”بری بات شازی“ میں نے ہمت بندھانے والے انداز میں کہا۔ ”تم نے صبر کا دامن چھوڑ دیا تو امی کو کون سنبھالے گا‘ امینہ آنٹی کے آنسو کون پونچھے گا......“

”میں بہت ٹوٹ گئی ہوں بھائی جان۔“ وہ بلک اٹھی۔ ”بس‘ آپ فوراً آ جائیں۔ اس وقت ہمیں آپ کی اشد ضرورت ہے۔“

”میں تمہاری کیفیت کو سمجھ رہا ہوں میری جان مگر یہاں بھی کچھ ایسی مجبوریاں ہیں کہ میں فوری طور پر تمہارے پاس نہیں آ سکتا۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”انکل کی میت کب اٹھے گی؟“

”عصر اور مغرب کے درمیان۔“ شازیہ نے نم ناک آواز میں جواب دیا۔ ”بھائی جان! اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ فرحانہ کو جرائم پیشہ افراد نے اغوا کر لیا ہے اور آپ اس کی واپسی کے لیے گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں‘ اس حقیقت کو آخر کب تک چھپایا جا سکتا تھا۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”آپ کے ساتھ ایسی کون سی مجبوریاں لگی ہوئی ہیں کہ فوری طور پر یہاں نہیں آ سکتے؟“ شازیہ نے پوچھا۔

”دشمنوں کا ایک خاص آدمی میرے قبضے میں ہے۔“ میں نے نپے تلے الفاظ میں کہا۔ ”آج دوپہر میں کسی وقت فرحانہ اور اس خاص آدمی کا تبادلہ کیا جائے گا۔ اس کے بعد ہی میں تم لوگوں کے پاس آ سکوں گا اور ہاں......“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر چونکے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”ایک خوشخبری ہے شازی......!“

”کیسی خوش خبری بھائی جان؟“ اس نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

”ابھی میں نے دشمنوں کے جس بندے کا ذکر کیا ہے نا......“ میں نے کہا۔ ”رات اس کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ خوش ولی ان لوگوں کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے آج کسی وقت اسے گھر پہنچ جانا چاہیے۔“

”شکر الحمدللہ......“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”امی کا خیال رکھنا اور میرے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتانا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تم سے بعد میں رابطہ کروں گا اور ہاں‘ ان شاءاللہ! میں انکل کی تدفین کے موقع پر ضرور موجود ہوں گا۔“

رسمی کلمات کے بعد ہمارے بیچ رابطہ موقوف ہو گیا۔

میں جانتا تھا کہ شازیہ‘ خوش ولی میں گہری دلچسپی رکھتی تھی۔ ان کے کنکشن کو میں نے کئی مواقع پر محسوس کیا تھا۔ خوش ولی میرا گہرا دوست تھا اور وہ بھی شازیہ کے لیے اپنے دل میں پسندیدگی کے جذبات رکھتا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ان دونوں کی باہمی پسندیدگی پر کسی قسم کا کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر میں امی سے اس موضوع پر ضرور بات کروں گا لیکن ابھی تک مجھے کوئی ایسا موزوں موقع میسر آ نہیں سکا تھا اور اب......تو میں جس ڈگر پر چل نکلا تھا اس کے تقاضوں کی روشنی میں یہ نیک کام جلد از جلد ہو جانا ضروری تھا۔

”تم اپنی بہن سے بہت محبت کرتے ہو نا......؟“ میں نے فون بند کیا تو ماجد نے پوچھا۔

جب تک میں فون پر شازیہ سے بات کر رہا تھا۔ ماجد یک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا اور جیسے ہی میں نے بات ختم کی‘ اس نے سوال داغ دیا تھا۔

”اس میں کسی شک و شبے کی کہاں گنجائش ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”شازیہ میری اکلوتی بہن ہے اور میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی پرورش کی ہے۔“

”اللہ اس کا نصیب اچھا کرے۔“ وہ جذب کے عالم میں بولا۔

میں نے بے ساختہ کہا۔ ”خدا تمہاری زبان مبارک

کرے۔ آمین۔"

"یہ تو ثابت ہوگیا کہ شہزاد کی فراہم کردہ اطلاع بالکل درست ہے۔" ماجد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم اسے فون کرو تاکہ آگے کے معاملات طے کیے جاسکیں۔"

شہزاد کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کوئی ماجد نام کا شخص بھی ہے جو اس صورت حال میں میری بھرپور مدد کررہا ہے۔ ہاں البتہ جنید خان کو اس حقیقت کا علم ہوچکا تھا کیونکہ صدر والے ماجد کے گودام میں جنید خان نے ایک ساتھ ہم دونوں کا نظارہ کرلیا تھا۔ میں نے ماجد کی بات کے جواب میں کہا۔

"شہزاد کو فون کرنے سے پہلے ہمیں آپس میں بھی کچھ طے کرلینا چاہیے۔"

"مثلاً......؟" ماجد نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔

"مثلاً یہ کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "شہزاد سے ہم نے فرحانہ اور جنید خان کے تبادلے کا معاملہ طے کرنا ہے نا؟"

"ظاہر ہے" ماجد نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"یہ ایک حقیقت ہے کہ فرحانہ ندیم شیروانی کی کسٹڈی میں ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی ایک سچائی ہے کہ جنید خان ہماری تحویل میں نہیں پھر...... کیسا تبادلہ؟"

"ہم یوٹوپیا کے باسی نہیں ہیں......" ماجد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

"یہ افراتفری کی دنیا ہے پیارے اور یہاں ہر کوئی اپنے مفاد کی جنگ لڑ رہا ہے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "ہمارا واسطہ کسی شریف النفس، عالی ظرف اور بلند اخلاق شخص سے نہیں ہے۔ ہمارے مد مقابل زمانے کے چھٹے ہوئے بدفطرت اور کمینہ خصلت انسان ہیں لہٰذا ان سے نمٹنے کے لیے ہر نوعیت کی چال بازی اور فریب جائز ہے۔ جیسا دیس، ویسا بھیس اور...... تم نے وہ نہیں سنا کہ "لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔"

"ہاں، سنا ہے" میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔

"شرافت صرف شریف انسان کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔" وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ندیم شیروانی اور شہزاد جس قماش کے لوگ ہیں انہیں مکاری اور عیاری ہی سے چت کیا جاسکتا ہے۔ جھوٹے کو جھوٹ کی مار مارنا چاہیے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو......" میں نے گمبھیر انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "تمہارے ذہن میں کیا ہے؟"

"میرے ذہن میں جو بھی ہے اسے بعد میں بھی ڈسکس کیا جاسکتا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "فی الحال، تم شہزاد کو فون کرکے اس تبادلے کو فائنل کرو۔ جس انداز میں جو بات ہورہی تھی بس وہی فائنل ہے۔"

"ٹھیک ہے......" میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

میں نے اپنے سیل فون سے شہزاد کو کال کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس کی کال آگئی۔ میں نے ماجد کو اشارہ کرتے ہوئے شہزاد کی کال اٹینڈ کرلی اور اس کے ساتھ ہی فون کا اسپیکر بھی آن کردیا۔ اگلے ہی لمحے شہزاد کی آواز کمرے میں گونجی۔

"میں تو سمجھا تھا، تم اپنے یا فرحانہ کے گھر فون کرکے میری اطلاع کی تصدیق کروگے لیکن تمہاری طرف چھائی ہوئی خاموشی سے لگتا ہے کہ تم خود ہی وہاں چلے گئے ہو......؟"

"میری مصروفیات کو ناپنے کے بجائے تم کام کی بات کرو۔" میں نے رکھائی سے کہا۔

"میں تو کام کی ہی بات کررہا تھا۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تم ہی غوطہ مار گئے تھے خیر......" اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں، تو ہمارے درمیان کیا بات ہورہی تھی......؟"

"فرحانہ اور جنید خان کے تبادلے کی بات ہورہی تھی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آج ٹھیک ایک بجے دوپہر، سوسائٹی قبرستان کی سائیڈ والی گلی میں، قبرستان کے گیٹ کے قریب تم فرحانہ کو لے کر آؤ گے اور میں جنید خان کو۔ نہ تمہارے ساتھ کوئی تیسرا ہوگا اور نہ ہی میرے ساتھ کوئی تیسرا ہوگا۔ ہمارے درمیان اسی بات پر اتفاق ہوا تھا۔"

"ڈن!" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "ہمارے درمیان جس بات پر اتفاق ہوا ہے۔ ہم دونوں اس کا پاس کریں گے۔ مجھے امید ہے، تم کسی قسم کی چال بازی سے کام نہیں لوگے۔"

"میں کمزور اینڈ پر ہوں۔" میں نے دانستہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھ سے تمہیں اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں فرحانہ کی صحیح وسلامت واپسی کے لیے پوری دیانتداری کے ساتھ تم سے تعاون کروں گا۔"

"مجھ سے بھی کسی بددیانتی کی توقع نہ رکھنا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "اب میں ایک بجے سے کچھ پہلے تم سے رابطہ کروں گا۔ اپنا سیل آن رکھنا۔ ہم تبادلے کا طریقہ کار اسی وقت طے کریں گے......"

"اوکے!" میں نے کہا۔

"اوکے اینڈ خدا حافظ۔" اس نے یہ کہتے ہوئے سیلولر رابطہ منقطع کردیا۔

میں نے سیل فون کو ایک طرف رکھتے ہوئے سوالیہ نظر سے ماجد کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اب بتاؤ؟"

"بتانا کیا ہے۔" وہ سرسری انداز میں بولا۔

"میں سمجھتا ہوں، شہزاد ساڑھے بارہ بجے تک تم سے دوبارہ رابطہ کرے گا۔"

"اس بات کا اندازہ تو مجھے بھی ہے۔" میں نے دیوار گیر کلاک کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ "سوا گیارہ بج رہے ہیں۔ ہمارے پاس صرف ڈیڑھ گھنٹہ ہے۔ جو کچھ بھی کرنا ہے اسی دوران میں کرنا ہے۔ تمہارے ذہن میں جو بھی ہے، مجھے بھی بتاؤ تاکہ آئندہ کا لائحہ عمل تیار کیا جاسکے۔"

"میرے ذہن میں تو یہی ہے کہ فرحانہ اور جنید خان کا تبادلہ بہ خیر وخوبی ہوجانا چاہیے۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ "شہزاد کے لہجے سے تو مجھے یہی اندازہ ہوا ہے کہ جنید خان شیروانی کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے، جبھی وہ لوگ فرحانہ کی واپسی کے لیے راضی ہوئے ہیں۔ مجھے امید ہے، اس ڈیل میں شہزاد کی طرف سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ ایک بات اور......" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بہ دستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"پچھلے چند روز میں شیروانی نے تمہارے ہاتھوں پے درپے جو نقصانات اٹھائے ہیں ان کی روشنی میں اسے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ تمہارے ساتھ دشمنی سراسر گھاٹے کا سودا ہے لہٰذا وہ اس کانٹے کو نکالنے کے لیے راضی خوشی فرحانہ کی واپسی کے لیے تیار ہوگیا ہے۔"

"تم ایک بات کو نظر انداز کررہے ہو ماجد۔" میں نے اپنی جائز تشویش سے اسے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس تبادلے کے لیے ضروری ہے کہ جنید خان ہمارے پاس ہو......"

"جنید خان کا بندوبست ہوجائے گا۔" وہ میری

بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''اس کی تم فکر نہ کرو۔''

''فکر کیسے نہ کروں ماجد.....'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''جنید خان کو پچھلی رات اس کی گاڑی سمیت تم نے ریلوے لائن کی پلیا کے نیچے چھوڑا تھا۔ اس بات کو لگ بھگ آٹھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ ٹھیک ہے اس پلیا کے نیچے ٹریفک کا اژدھام نہیں ہوتا مگر بہرحال ٹریفک جاری تو رہتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اور اس کی گاڑی ابھی تک کسی کی نظر میں نہ آئی ہو۔ میں تو کہتا ہوں.....''

''دیکھو اسد!'' اس نے ایک مرتبہ پھر میری بات کاٹ دی۔ اور بہ دستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''یہ بات میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جنید خان اور اس کی گاڑی کم از کم شیروانی اور اس کے نیٹ ورک کے کسی آدمی کی نظر میں ابھی تک نہیں آئی ورنہ شہزاد فرحانہ کے تبادلے والی ڈیل کے لیے کبھی تیار نہ ہوتا اور اگر..... جنید خان اور اس کی گاڑی کسی غیر متعلقہ شخص کی نظر میں آئی بھی ہو تو ہمیں اس کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں اسی ڈیڑھ گھنٹے کے اندر کسی طرح اپنا کام نکالنا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

بات ختم کر کے اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں سمجھ رہا ہوں۔ تم کسی ڈمی جنید خان کا انتظام کرنے کا ارادہ رکھتے ہو.....!''

''یس..... تمہارا اندازہ درست ہے۔''

''لیکن ایسا شخص ملے گا کہاں سے۔'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''جس کو دیکھ کر شہزاد بھی دھوکا کھا جائے؟''

''یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ ''جنید خان کے قد کاٹھ اور جسامت کا ایک بندہ ہے میری نظر میں۔ چہرے پر تھوڑا سا کام کرنا ہوگا اور شاید تمہیں معلوم نہیں کہ بشارت محض ہیئر ڈریسر ہی نہیں، وہ ایک بہت اچھا میک اپ مین بھی ہے وہ جنید خان کے چہرے پر ایسا میک اپ کرے گا کہ خود جنید خان بھی آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر دھوکا کھا جائے گا.....واہ.....''

وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر بڑے مسرور کن انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک مانے ہوئے ڈائریکٹر پروڈیوسر کا میک اپ..... میرا مطلب ہے، کسی اجنبی شخص کو میک اپ کے زور پر بشارت، جنید خان بنا دے گا اور..... ایسا بنا دے گا کہ خود جنید خان کو بھی دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے ماجد۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ اگر شہزاد کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس ہو گیا کہ جنید خان کے بہروپ میں وہ کوئی اور شخص ہے تو فرحانہ کے ساتھ ہی اس نقلی جنید خان کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ سراسر رسکی قدم ہوگا۔''

''رسکی.....'' ماجد نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ پھر چند لمحات تک وہ مجھے گہری نظر سے دیکھنے کے بعد بولا۔

''کیا اس وقت فرحانہ تمہارے پاس ہے؟''

''نن..... نہیں۔'' میں نے متذبذب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''مگر یہ کس قسم کا سوال ہے؟''

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور پوچھا۔

''فرحانہ تم سے دور ہے۔ تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کتنی دوری پر اور کہاں ہے لیکن اس کے باوجود بھی تم نے اس کے حصول کے لیے اپنی جان کو رسک میں ڈال رکھا ہے..... ڈال رکھا ہے یا نہیں؟''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر.....''

''اگر مگر کچھ نہیں۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

''جب تم دوری پر رہتے ہوئے خود کو خطرات میں ڈال سکتے ہو تو اس وقت کیوں نہیں جب فرحانہ تمہارے سامنے ہوگی؟''

''میں اپنی جان کی نہیں فرحانہ کی جان کے خطرے کی بات کر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''نقلی جنید خان کا بھید کھل جانے کے بعد شہزاد کی جانب سے کوئی بھی بدترین ردعمل دیکھنے کو مل سکتا ہے اور اس ردعمل کا نشانہ سب سے پہلے فرحانہ ہی بنے گی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں فرحانہ کو کوئی بھی گزند پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔''

''کچھ نہیں ہوگا فرحانہ کو۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولا۔ ''اور اگر کوئی گڑبڑ ہوگئی تو ہم وہاں مہندی لگا کر اور چوڑیاں پہن کر تو نہیں جا رہے نا۔''

''اوکے ڈن۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں تمہاری اسکیم پر عمل کرنے کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہوں۔ تم نقلی جنید خان کی کھوج میں لگ جاؤ۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔''

''نقلی جنید خان کو کہیں سے کھوجنا ہے اور نہ ہی کھودنا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سب کچھ میرے ذہن میں ہے، بس مجھے ''جائے وقوعہ'' پر تھوڑا اعتراض ہے!''

''جائے وقوعہ؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں اس مقام کی بات کر رہا ہوں جہاں فرحانہ اور جنید خان کے تبادلے کی بات ہو رہی ہے۔'' ماجد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں، مسجد کے گیٹ کے سامنے اس نوعیت کی کارروائی مناسب نہیں رہے گی..... کیونکہ اس وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے..... کچھ بھی!''

''اوہ.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''تبادلے کے مقام کو تھوڑا آگے پیچھے کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے، تھوڑا آگے رہائشی علاقے میں کوئی پوائنٹ مقرر کیا جا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، اس معاملے کو تھوڑا بعد میں دیکھیں گے۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں اب چلتا ہوں۔''

''کہاں.....؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''مجھے ساڑھے بارہ سے پہلے نقلی جنید خان تیار کرنا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس دوران میں تم اس فلیٹ ہی میں رہو گے، جب میں تمہیں فون کروں تو تم فلیٹ کو لاک کر کے باہر نکل آنا۔''

''باہر کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ میں تمہیں اسی وقت بتاؤں گا۔'' وہ بہ دستور سنجیدہ انداز میں بولا۔ ''تمہیں زیادہ دور آنے کی زحمت نہیں دوں گا۔ بس، بارہ بجے کے بعد تم ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل تیار رہنا۔''

''وہ تو میں ابھی سے تیار ہوں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

ماجد نے کہا۔ ''اس فلیٹ پر تم جتنی بھی دیر رکو گے کوئی تمہیں تنگ کرنے نہیں آئے گا۔ میں نے آس پاس کے لوگوں سے میل جول نہیں رکھا ہوا۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

ماجد نے کہا۔ ''تم اپنے فون کو چارجنگ پر لگالو۔ پتا نہیں ہمیں کتنی دیر پھر سیل فون چارج کرنے کا موقع نہ ملے اور ہاں.....'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس دوران میں اگر شہزاد کا فون آئے تو تم مجھے اس کے حوالے سے اپ ڈیٹ کرتے رہنا۔''

''ہاں یہ تو ضروری ہے۔'' میں نے سرسری انداز

میں کہا۔ ”جنید خان کا سیل فون بھی میرے پاس ہی ہے اور اتفاق سے اس فون کی بیٹری میرے فون میں بھی لگائی جاسکتی ہے۔ میں اس کے سیل فون کو آف کر کے چارج کر لیتا ہوں۔ بہ وقت ضرورت اس کی بیٹری کو بھی استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔“

”گڈ آئیڈیا۔“ اس نے سراہنے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔

پھر مزید دس منٹ تک ہمارے درمیان مختلف امور پر بات ہوتی رہی۔ اس کے بعد ماجد نے مجھے اس فلیٹ کی چابیوں کا ایک سیٹ دیا اور ضروری ہدایات کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔ مذکورہ چابیوں کا دوسرا سیٹ اس نے اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا۔

❀......❀......❀

ماجد کا اور میرا ساتھ زیادہ پرانا نہیں تھا۔ بلکہ اس تعلق کو ابھی ایک دن بھی پورا نہیں ہوا تھا۔ کل رات کو عاطف صاحب کے دفتر میں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی اور جب سے اب تک وہ میرے ساتھ تھا۔ یعنی لوگ برسوں ساتھ رہتے ہیں لیکن ان کے ساتھ انسیت اور قربت کا تعلق پیدا نہیں ہوتا اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا گھنٹوں یا چند دنوں کا ساتھ صدیوں پر محیط محسوس ہونے لگتا ہے۔ ان کو دیکھتے ہی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے ان سے ہماری سال ہا سال کی جان پہچان ہے۔ ماجد بھی ایسا ہی انسان تھا۔

عاطف رشید صاحب کی میں دل سے قدر کرتا تھا۔ وہ برہانی ٹریڈرز کے کرتا دھرتا تھے۔ اس فرم میں وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتے تھے۔ میں ان کے آفس میں بھی کئی بار جا کر ان سے ملا تھا۔ ان کا کاروبار بہت منظم اور شفاف تھا۔ وہ نہایت ہی تجربہ کار اور دانا و بینا انسان تھے لیکن ایک دو واقعات ایسے رونما ہوئے کہ عاطف صاحب کی ذات میں میری دلچسپی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ مجھے ایک عام بزنس مین سے بڑھ کر کوئی افلاطونی شخصیت معلوم ہونے لگے تھے۔

پہلے جب ان کے بڑے بھائی خالد رشید کی فارماسیوٹیکل کمپنی میں گڑبڑ کو محسوس کر کے میں نے عاطف صاحب کو اس راز سے آگاہ کیا تھا تو ان کی حکمت عملی کے درمیان بعض ایسے لوگوں نے نہایت ہی اہم کردار ادا کیا تھا جو روٹین میں شمار نہیں کیا جاتا۔ مثلاً نقلی ادویات کے مذموم دھندے میں ملوث اکاؤنٹنٹ انور، مارکیٹنگ منیجر مرزا یاسین بیگ اور فورمین عظیم احمد کو بے نقاب کرنے کے لیے عاطف صاحب نے اپنے جن قابل بھروسا افراد کا استعمال کیا تھا ان میں ماہر فوٹوگرافر سلیم بھی شامل تھا۔ سلیم نے ہائی ڈیفی نیشن (ایچ ڈی) کیمرے کی مدد سے ان تینوں جرائم پیشہ افراد کے جرائم کے ٹھوس ثبوتوں کو عکس بند کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا تھا، وہ ہما شما کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کارروائی کا جو بھی انجام ہوا اس کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔ عاطف صاحب نے اپنی ذہانت اور حکمت عملی کی مدد سے اپنے بڑے بھائی کے بزنس کو نہ صرف یہ کہ تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا تھا بلکہ اس تباہی و بربادی کے لیے کمر بستہ ان تینوں کرداروں کو بھی بڑی ہوشیاری سے کیفر کردار تک پہنچا دیا تھا۔

دوسرا واقعہ ماجد والا تھا۔ کل شام میں، میں جب بنگلے پر شیروانی کے بندوں شہبازی، عمران اور مراد کو چھٹی کا دودھ یاد دلانے کے بعد عاطف صاحب کے آفس پہنچا تھا تو انہوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ میں نے انہی کے اٹیچڈ واش روم میں شاور بھی لیا تھا اور ان کے سامنے بیٹھ کر فاسٹ فوڈ کا ڈنر بھی کیا تھا۔ جب میں نے انہیں اپنے تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا تھا تو انہوں نے اپنے کسی ایم این اے / ایم پی اے دوست نجیب غوری کو اس معاملے میں داخل کرنے کی بات کی تھی لیکن مجھے اس کام کے لیے رضامند نہ پا کر انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

جب میں نے عاطف صاحب کو بتایا کہ اس رات مذکورہ بنگلے پر دشمنوں کا کیا پروگرام ہے تو انہوں نے میری مدد کے لیے ماجد کا بندوبست کر دیا تھا۔ تمام تر سنگین حالات سے آگاہی کے بعد وہ مجھے اکیلے اس بنگلے میں نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ ماجد کو اپنا ”خاص بندہ“ کہہ کر میرے ساتھ لگا دیا تھا بلکہ وہ خود ہم دونوں کو اپنی گاڑی میں جوہر موڑ تک چھوڑ کر بھی گئے تھے۔ تب سے اب تک ماجد میرے ساتھ تھا۔

ماجد ابتدا میں مجھے ایک خاموش طبع اور خشک مزاج شخص لگا تھا مگر جلد ہی مجھے اس کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کرنا پڑی تھی۔ اپنی روایتی خاموشی پر وہ زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا تھا بلکہ میرے ساتھ جلد ہی گھل مل گیا تھا۔ پچھلی رات اس کا ٹیلنٹ بھی کھل کر سامنے آچکا تھا میں کندھے پر بے آواز گولی لگنے سے کار پورچ میں اوندھے منہ گرا تھا۔ ماجد مجھے نہیں دیکھ پایا تھا ماجد کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ پورچ میں رک کر میرا انتظار کرتا۔ اگر اس مرحلے پر وہ ذرا سی بھی کوتاہی کا مرتکب ہوتا تو جنید خان نے ہاتھ سے نکل جانا تھا اور میں کسی بھی قیمت پر جنید خان کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ میری مصدقہ معلومات کے مطابق، ندیم شیروانی نے فرحانہ کو جنید خان کی تحویل میں دے رکھا تھا۔ اگر جنید خان جوہر والے بنگلے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کا مطلب تھا، میں نے فرحانہ کا سراغ کھو دیا اسی لیے ماجد میرا انتظار کیے بغیر گن پوائنٹ پر جنید خان کو اپنے صدر والے ٹھکانے پر لے آیا تھا۔

پچھلی رات کے آخری حصے میں ماجد کے صدر والے ”ٹھکانے“ پر جو کچھ پیش آیا اس کی جزئیات میرے ذہن میں نقش تھیں۔ وہ اڈا بہ ظاہر لنڈا بازار کے کپڑوں کا گودام تھا لیکن ماجد بڑی مہارت اور چالاکی کے ساتھ اسے اپنے غیر نصابی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا تھا اور اس قسم کی سرگرمیوں میں بشارت اس کے لیے دست راست کا کردار ادا کر رہا تھا۔ جنید خان کی زبانی بہت سے انکشاف ہوئے تھے جن میں سب سے زیادہ اہم دو باتیں تھیں۔ ایک خوشخبری تھی اور دوسری بدخبری۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ میرے جگری یار نے کسی نہ کسی طرح دشمن کی قید سے نجات حاصل کر لی تھی۔ جب خوش ولی کو مردہ سمجھ کر ٹھکانے لگانے کے لیے جوہر والے بنگلے کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو سہراب گوٹھ اور ابوالحسن صفہانی روڈ کے بیچ وہ ایک تاریک مقام پر شدید زخمی حالت میں، اندھیرے کی آڑ لے کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔

دوسری خبر افسوس ناک اور مایوسی بھری تھی اور وہ یہ کہ فرحانہ جنید خان کی کسٹڈی میں نہیں رہی تھی، جنید خان کے مطابق، شہزاد فرحانہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کہاں؟ یہ جنید خان نہیں جانتا تھا۔ ماجد نے پوچھ گچھ کے دوران میں جو اسٹائل اختیار کیا تھا اس کو دیکھ کر میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ جنید خان نے دروغ گوئی سے کام نہیں لیا ہوگا۔ ازاں بعد ماجد، جنید خان کو بے ہوش کر کے اس کی گاڑی سمیت، صدر سے لگ بھگ پانچ کلومیٹر دور ریلوے لائن کی پلیا کے نیچے چھوڑ آیا تھا۔

ماجد کی اب تک کی سنسنی خیز کارروائی دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جس ڈگر کا مسافر تھا وہاں ہنگامے اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوں گے اور رات دن وہ نت نئی صورت حال سے نبرد آزما رہتا ہوگا۔ اس وقت بھی وہ نقلی جنید خان کا بندوبست کرنے گیا تھا اور تبادلے والے اس مشن کے سلسلے میں وہ خاصا پرجوش اور اولوالعزم دکھائی دیتا تھا۔

پہلے فوٹو گرافر سلیم اور اب ماجد...... انہیں عاطف رشید صاحب نے اپنے خاص بندوں کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا اور ان دونوں کے ''کارنامے'' عام لوگوں سے ہٹ کر تھے۔ بظاہر ایسا نظر نہیں آتا تھا کہ عاطف صاحب کو اپنے بزنس کے سلسلے میں اس قسم کے ہنگامہ پرور لوگوں کی ضرورت پیش آ سکتی ہو۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ ...... عاطف صاحب امپورٹ ایکسپورٹ کے علاوہ بھی کسی فیلڈ میں ٹانگ پھنسائے بیٹھے تھے۔ کون سی فیلڈ ......؟ اس بارے میں، میں سردست کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

عاطف صاحب کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے خوش ولی کا خیال آ گیا۔ اس خبر نے میرا ڈھیروں خون بڑھا دیا تھا کہ خوش ولی نہ صرف زندہ تھا بلکہ وہ دشمنوں کی قید سے فرار ہونے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ رات جب ماجد، جنید خان کو ''ٹھکانے'' لگانے گیا ہوا تھا تو میری عاطف صاحب سے بات ہوئی تھی۔

وہ تقریباً رات کے ساڑھے تین کا عمل تھا۔ میں ماجد کے صدر والے گودام میں بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا کہ عاطف صاحب کا فون آ گیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے بہانہ تو یہی کیا تھا کہ ''اے سی'' کی کسی خرابی کے باعث ان کی آنکھ کھل گئی تھی اور انہوں نے سوچا کہ چلو ہماری خیر خبر ہی لے لیں لیکن اسی وقت مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ابھی تک سوئے نہیں تھے۔ ان کا ذہن ہمارے مشن کی طرف ہی لگا ہوا تھا جیسے ان تمام تر معاملات میں ان کی ذاتی دلچسپی شامل رہی ہو۔ یہ حالات و واقعات ان کی ذات کو بعض معاملات میں مختلف زاویوں سے پراسرار بناتے تھے۔

رات جب میں نے انہیں خوش ولی کے کامیاب فرار کی خبر سنائی تھی تو انہیں بھی خوشی ہوئی تھی اور انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ خوش ولی کی تلاش کے لیے اپنے کسی آدمی کی ڈیوٹی لگا دیں گے بلکہ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ان کا ایک بندہ ادھر ابوالحسن صفہانی روڈ پر ہی رہتا ہے۔ وہ صبح اسے خوش ولی کو ڈھونڈنے کا کام سونپ دیں گے۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں عاطف صاحب کو فون کر کے خوش ولی کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ ماجد کے جاتے ہی میں نے اپنا اور جنید خان والا سیل فون چارجنگ پر لگا دیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ جنید خان والا سیل فون رات ہی سے میں نے آف کر رکھا تھا۔ میں صرف اس کی بیٹری فل کرنا چاہتا تھا تاکہ بہ وقت ضرورت میں اس بیٹری کو اپنے سیل فون میں استعمال کر سکوں۔

میں نے اپنے سیل فون سے عاطف صاحب کا نمبر ملایا۔ ایک بیل جانے کے بعد لائن کٹ گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ دوسری طرف سے دانستہ لائن کاٹی گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ میرے سیل فون پر عاطف صاحب کی کال آ گئی تھی۔ میں نے ان کے آفس کے لینڈ لائن نمبر پر کال کی تھی اور انہوں نے اپنے سیل سے مجھے فون کیا تھا۔ یہ سیل نمبر انہوں نے رات ہی مجھے دیا تھا اور میں نے انہی کے دیے ہوئے سیل فون میں مذکورہ نمبر کو فیڈ کر لیا تھا۔ عاطف صاحب نے لینڈ لائن کی کال کو کاٹ کر اپنے سیل سے مجھے فون کیا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ احتیاط سے کام لے رہے تھے۔

''ہیلو سر!'' میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''اسد صاحب! کیا ہو رہا ہے؟'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''آواز سے تو لگ رہا ہے، کافی فریش ہیں۔ نیند کرنے کا موقع ملا؟''

''یس سر! پورے پانچ گھنٹے کی نیند لی ہے۔''

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا رات کو...... بلکہ اسے صبح کہنا چاہیے...... میں کم و بیش پانچ بجے سویا تھا اور لگ بھگ دس بجے میری آنکھ کھلی تھی اس حساب سے میں نے پانچ گھنٹے کی پرسکون نیند لے لی تھی۔

''سر کی چوٹ کا کیا حال ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

عاطف صاحب اس چوٹ کی بابت پوچھ رہے تھے جو گلستان جوہر والے بنگلے پر اس وقت کسی آہنی شے سے میری کھوپڑی کے عقبی حصے میں لگائی گئی تھی جب میں فرحانہ کی بازیابی کے لیے پانچ لاکھ کے نقلی نوٹ لے کر مذکورہ بنگلے پر پہنچا تھا۔ عاطف صاحب نے پچھلی رات میرے لیے چند ادویات بھی منگوائی تھیں۔ اب تو میرا کندھا بھی گھائل تھا۔

میں نے انہیں اپنی سابق اور موجودہ کیفیت سے آگاہ کیا اور کہا۔ ''سر! یہ چوٹیں تو آنی جانی چیزیں ہیں اور میں ایسا موم کا بھی نہیں بنا ہوا کہ ان معمولی تکالیف سے گھبرا جاؤں۔''

''مجھے آپ کی برداشت اور ہمت کا بہ خوبی اندازہ ہے اسد۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''آپ ڈٹے رہیں۔ ان شاء اللہ! بہت جلد کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔''

''ان شاء اللہ!'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''ماجد نے تھوڑی دیر پہلے مجھے رات والے تمام تر واقعات اور آئندہ کی پلاننگ کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا ہے۔'' وہ بہ دستور گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''آپ دونوں کی ثابت قدمی مثبت نتائج ہی لے کر آئے گی۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے سر۔'' میں نے خلوص دل سے کہا پھر ان الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس وقت کسی اور کام کے لیے فون کیا تھا۔''

''ہاں، بولیں...... کیا کام ہے؟''

''آپ نے رات بتایا تھا کہ جہاں خوش ولی دشمن کی قید سے فرار ہوا ہے وہاں اس علاقے میں آپ کا کوئی بندہ رہتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ اس بندے کو خوش ولی کی تلاش پر لگا دیں گے......؟''

''میں نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''سجاد حسین نامی میرا ایک آدمی ادھر پر رہتا ہے۔ میں نے آج صبح ہی اسے خوش ولی کی تلاش پر مامور کر دیا ہے۔''

''سر! اس تلاش کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہوا؟''

''ابھی تک نہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''لیکن مجھے قوی امید ہے کہ سجاد بہت جلد خوشی کی کوئی خبر دے گا۔''

''انشاء اللہ۔'' میں نے کہا۔

ہمارے درمیان مزید چند منٹ تک حالات حاضرہ کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی پھر عاطف صاحب نے نیک تمناؤں کے ساتھ سیلولر رابطہ موقوف کر دیا۔

اگلے ہی لمحے ماجد کی کال آ گئی۔ میں نے فون اٹینڈ کرنے کے بعد ''ہیلو'' کہا تو وہ بولا۔

''اسد! میں نے جائے وقوعہ کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔''

''اچھا...... تو ابھی تک تم ادھر پی ای سی ایچ سوسائٹی ہی میں گھوم رہے ہو؟'' میں نے کہا۔

''نہیں یار! میں تو اس وقت بشارت کے ساتھ اس بندے کے پاس بیٹھا ہوں جو انیس بیس کے فرق سے بنا بنایا جنید خان ہے۔'' اس نے پرجوش انداز میں کہا۔ ''بس، بشارت کو اس کے چہرے پر تھوڑی محنت کرنا پڑے گی اور وہ ہو بہ ہو جنید خان بن جائے گا۔''

''کیا جنید خان کا چہرہ تمہارے ذہن میں ابھی تک محفوظ ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''پوری جزئیات کے ساتھ؟''

یہ نہایت ہی اہم نکتہ تھا لیکن ماجد کے جواب نے میری تسلی کردی۔ میرے سوال کے جواب میں وہ بولا۔

''ذہن میں تو نہیں البتہ میرے سیل فون میں ضرور محفوظ ہے۔ میں نے جنید خان کو اپنے ٹھکانے پر پہنچانے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ اپنے موبائل کے کیمرے سے اس کے مختلف پوز شوٹ کرلیے تھے تاکہ سند رہے اور بہ وقت ضرورت کام آئے۔''

''یہ تم نے عقل مندی کا کام کیا ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اس سے میک اپ کا کام بہت سہل ہوجائے گا۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔'' اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ذہن میں بسا ہوا خاکہ ادھر ادھر ہوسکتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ میک اپ میں نے نہیں' بشارت نے کرنا ہے۔ یہ ساری تفصیلات اس کی ضرورت ہے۔''

''تم جائے وقوعہ کے بارے میں کچھ بتارہے تھے؟'' میں نے اسے اصل موضوع کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

''ہاں' میں نے وہ علاقہ تو پہلے ہی سے دیکھا بھالا ہوا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس مشن کے حوالے سے میں نے اس کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں' ایک دو گلی آگے کا کوئی ''پوائنٹ'' فکس کرنا چاہیے۔''

''ایک دو گلی آگے......'' میں نے اسی کے الفاظ کو دہراتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے' آگے خالد بن ولید روڈ کی طرف یا لبرٹی کی جانب......؟''

''خالد بن ولید روڈ کی طرف۔'' اس نے جواب دیا۔ ''رہائشی علاقے میں رش اور شور شرابا زیادہ نہیں ہوتا۔ یہ کام وہاں نہایت ہی پرسکون انداز میں ہوسکتا ہے۔''

''میں تمہاری تجویز سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن پہلے شہزاد کے فون کا انتظار کرنا ہوگا' پھر ہی کوئی مقام فائنل کرسکیں گے۔''

''اوکے......!'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''شہزاد سے تمہاری جو بھی بات ہو' مجھے بتادینا۔ میں ریڈی میڈ جنید خان کے ساتھ ٹھیک ساڑھے بارہ بجے جائے وقوعہ کے آس پاس ہی موجود ہوں گا۔''

ماجد نے فرحانہ اور جنید خان کے تبادلے کے مقام کو ''جائے وقوعہ'' کا نام دے دیا تھا۔ اگرچہ تکنیکی اعتبار سے یہ نام درست نہیں تھا۔ جائے وقوعہ یا جائے واردات یا کرائم سین اس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں پر کوئی واردات ہوئی ہو۔ بہرحال یہ ''تبادلہ'' بھی ایک نوعیت کی ''واردات'' ہی تھی جو ابھی تک ہوئی نہیں تھی مگر کم وبیش دو گھنٹے کے بعد ہونے والی ضرور تھی۔

''ٹھیک ہے ماجد۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہیں لمحہ بہ لمحہ ''نیوز الرٹس'' کی طرح اپ ڈیٹ کرتا رہوں گا۔''

چند ضروری باتوں کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو ''خدا حافظ'' کہہ دیا۔

فون بند کرنے کے بعد میں نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ یہ ایک آسودہ اور فرحت بخش انگڑائی تھی۔ میں پچھلے دو' تین دن سے نہ تو ڈھنگ سے کھاپی سکا تھا اور نہ ہی کسی معقول جگہ پر آرام کرنے کا موقع ملا تھا۔ پچھلی رات میں نے لگ بھگ پانچ گھنٹے کی نیند لی تھی جس نے میرے بدن میں چستی بھر کر مجھے چاق وچوبند کردیا تھا۔ اب میں خود کو ایک دم فریش محسوس کررہا تھا۔ سر کے عقبی حصے میں لگنے والی چوٹ کی تکلیف اب

نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اسے درد نہیں بلکہ دکھن کہا جاسکتا تھا البتہ بازو والا زخم ابھی تک ''ہرا'' تھا۔ گزشتہ رات عمران کی چلائی ہوئی بے آواز گولی نے میرے بائیں کندھے کا ''مزاج'' پوچھ لیا تھا۔ سائیلنسر لگی گن سے نکلنے والی گولی نے میرے ٹرائی سپس (Triceps) کو چھیل ڈالا تھا۔ خیریت گزری کہ گولی گوشت کے اندر نہیں دھنسی تھی۔ اگر گولی کندھے کے گوشت میں گھس جاتی تو مسلز کے علاوہ جوڑ کی ہڈی کو بھی شدید نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اس ذات پاک نے مجھے ہڈی ہڈی بچالیا تھا۔

مجھ پر فائر کرنے والا عمران نامی دشمنوں کا آدمی وہی کلین شیو تھا جسے کل دوپہر میں نے انٹا غفیل کرکے جوہر والے بنگلے کے ایک واش روم میں بند کردیا تھا۔ نصف شب میں جب اس بنگلے سے جنید خان کے تعاقب میں نکل رہا تھا تو عمران نے اپنی دن والی ہزیمت کا بدلہ لینے اور مجھے فرار سے روکنے کے لیے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ ''ہزیمت'' والی بات میں نے اپنے اندازے کی بناء پر کی ہے ورنہ رات کی تاریکی میں عمران کو یہ پتا نہیں تھا کہ میں دوبارہ اس بنگلے میں کسی مہم جوئی پر ہوں۔ اغلب امکان یہی تھا کہ عمران نے میرے فرار کو ناکام بنانے کے لیے وہ فائر کیا تھا۔ بہرحال' میں نے اسے لان کی گھاس پر ایک بار پھر دنیا ومافیہا سے بے خبر کردیا تھا۔

میں صوفے پر بیٹھ کر اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ میری زندگی میں یہ ''مارا ماری'' اچانک ہی داخل ہوگئی تھی۔ میں سیدھی سادی زندگی گزار رہا تھا۔ نوکری کا آغاز ہوتے ہی ہنگاموں سے میری دوستی ہوگئی تھی۔ عاطف رشید اور خالد رشید کے معاملات نے اس ''ایشو'' کو ہوا دی تھی اور میں ہر گزرتے دن کے ساتھ قتل وغارت گری اور خون ریزی کی اس دلدل میں دھنستا چلا جارہا تھا۔ ندیم شیروانی نے ایک معمولی سی بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا اور مجھ سے کھلی دشمنی پر اتر آیا تھا۔ اسی دشمنی میں اس نے میری بہن کو اغوا کرانے کی کوشش کی تھی۔ فرحانہ کی بدقسمتی کہ وہ اپنی شوخی کے باعث اس جھمیلے میں جا پھنسی تھی اور ابھی تک پھنسی ہوئی تھی۔ شہزاد کے مطابق' وہ آج دوپہر ایک بجے فرحانہ کو واپس کرنے والا تھا۔

حالات وواقعات اور تمام تر آثار بھی اسی جانب اشارہ کررہے تھے کہ آج میں فرحانہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا لیکن پتا نہیں کیوں' میرا دل پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ ایک خدشہ' ایک اندیشہ اور ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔

ایسا ہوتا ہے...... جو کام بہت کٹھن اور مشکل نظر آرہا ہو' جب اس کے ہونے کا وقت قریب آجائے تو یقین ہی نہیں آتا۔ ہر لمحہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ...... یہ ہو نہیں سکے گا۔

میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد فرحانہ مجھے ملنے والی تھی مگر دل کو تسلی نہیں ہورہی تھی۔ ندیم شیروانی فرحانہ کی واپسی کے لیے تیار ہوگیا تھا' یہ بات مجھے ہضم نہیں ہورہی تھی جو شخص ایک معمولی سی بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر دشمنی پر اتر آئے وہ اتنی آسانی سے گھٹنے ٹیکنے پر کیسے مجبور ہوسکتا تھا۔ میری ذاتی سوچ' سمجھ اور عقل یہی کہہ رہی تھی کہ دو میں سے کوئی ایک بات ضرور ہے۔

نمبر ایک...... جنید خان' شیروانی کی نظر میں حد سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے جبھی وہ اس کے حصول کے لیے فرحانہ کو آزاد کرنے پر آمادہ ہوا ہے۔ نمبر دو...... فرحانہ کی اس واپسی کے جلو میں شیروانی کی کوئی خطرناک سازش چھپی ہوئی ہے۔ وہ فرحانہ کو چارے کے طور پر استعمال

کر کے کوئی گھناؤنا کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔

جو بھی تھا' بہت جلد سامنے آنے والا تھا۔ آنے والے حالات سے خوف زدہ ہو کر خود کو اندر باہر سے کم زور کرنے کی بجائے ان سے نمٹنے کی منصوبہ بندی کر کے ذہن اور بدن کو تقویت پہنچانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

میں نے ان تمام تر پراگندہ خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لینے لگا۔ چہرے سے یہی تاثر ابھرتا تھا کہ گھنے جنگلوں میں کوئی خطرناک ایڈونچر کر کے واپس آیا ہوں تاہم آنکھوں میں امید کے چراغ روشن تھے اور یہ ایک خوش آئند اور تسلی بخش تاثر تھا۔ میرے من میں ورزش کی خواہش نے چٹکی لی اور میں ادھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ پاؤں کی مختلف حرکات سے ہلکی پھلکی ورزش کرنے لگا۔

اصولی طور پر مجھے اس وقت کسی قسم کی ورزش نہیں کرنا چاہیے تھی۔ چند منٹ پہلے ہی میں نے سیر ہو کر بڑا دھانسو قسم کا ناشتا کیا تھا۔ کسی بھی قسم کی جسمانی ورزش کے دو بنیادی اصول ہیں۔ اول' ورزش کبھی بھی خالی پیٹ اور ننگے پاؤں نہیں کرنا چاہیے۔ مطلب یہ کہ ورزش سے پہلے کم از کم ایک گلاس صاف پانی ضرور پی لینا چاہیے اور پاؤں میں ہلکے پھلکے پی ٹی شوز یا کوئی اور جوتا ہونا بھی لازمی ہے۔

دوم..... کھانا کھانے کے فوراً بعد ورزش ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ کھانے کے کم از کم چار گھنٹے بعد ورزش کی جاسکتی ہے لیکن یہ تمام اصول اور قواعد وضوابط نارمل حالات کے لیے ہیں۔

اگر اچانک سر پر کوئی افتاد آپڑے یا کوئی خطرناک دشمن آپ پر حملہ آور ہو جائے تو صرف اس خیال سے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا نہیں جاسکتا کہ ابھی تو ہم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا ہے۔ ان لمحات میں فوری ایکشن کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں بھی کچھ اسی نوعیت کی صورت حالات سے گزر رہا تھا اس لیے ہلکی پھلکی ایکسرسائز کی مدد سے خود کو ''ایکٹو'' کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد پتا نہیں' کن حالات سے واسطہ پڑنے والا تھا۔

میں چند منٹ سے زیادہ ایکسرسائز جاری نہ رکھ سکا۔ بائیں کندھے والے زخم میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ میں نے ایکسرسائز روک کر شرٹ اتاری اور زخم کا جائزہ لینے لگا۔ رات صدر والے گودام میں ماجد نے پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ میری مرہم پٹی کر دی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے تک سب ٹھیک تھا لیکن ہاتھوں کی مخصوص حرکت کی وجہ سے کندھے کے مسلز کے کھنچاؤ کے باعث زخم کے اندر درد ہونے لگا تھا۔ میں نے دوبارہ شرٹ پہنی' دوا کھائی اور دوبارہ صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے فرحانہ چھم سے میرے خیالات میں اتر آئی۔

فرحانہ سے میری محبت کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن مجھ سے فرحانہ کی محبت خاصی پرانی تھی۔ کتنی پرانی؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی درست جواب نہیں تھا۔ ہم سال ہا سال سے ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ پتا نہیں کب اور کیسے اس کے دل میں میری محبت جاگ اٹھی تھی۔ ہاں البتہ' میں یہ ضرور جانتا تھا کہ اگرچہ میں کچھ عرصہ پہلے ہی فرحانہ کی محبت میں مبتلا ہوا تھا لیکن محسوس ایسا ہی ہوتا تھا جیسے اس ''واردات'' کو صدیاں بیت گئی ہوں اور فرحانہ کے اغوا کے بعد تو اس کی جدائی میں گزرنے والا ایک ایک پل' ایک ایک صدی پر محیط تھا۔ بہت کم وقت میں اس کی چاہت کا پودا میرے دل ودماغ میں کسی تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

فون کی گھنٹی نے مجھے فرحانہ کے فرحت بخش اور کیف آور تصور سے چونکا دیا۔ میں نے اٹھ کر فون اٹینڈ

کیا۔ وہ شہزاد کی کال تھی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ وہ بارہ اور ساڑھے بارہ بجے کے درمیان کال کرے گا لیکن لگتا تھا کہ وہ اس تبادلے کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی بے چین تھا اور اس کے پیچھے اس کا باس شیروانی بے تاب اور بے قرار تھا۔ میں نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے کہا۔

''ہیلو......!''

''اتنی دیر سے کال کیوں ریسیو کی۔'' وہ قدرے برہمی سے بولا۔ ''کیا ارادہ تو نہیں بدل گیا......؟''

''شہزاد......'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں کہ سیل فون کو ہاتھ میں پکڑ کر بیٹھ جاؤں اور اسکرین پر تمہارا نام اور نمبر ابھرنے کا انتظار کروں اور...... جہاں تک ارادہ بدلنے کا تعلق ہے تو ایک بات ذہن میں رکھ لو کہ میں قدم اٹھانے کے بعد پلٹنے کا عادی نہیں ہوں۔ بس' جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔''

''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے......'' وہ سرسری انداز میں بولا۔ ''زیادہ فلسفے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کچھ ضروری باتیں کرنے کے لیے فون کیا ہے۔''

''کہو......'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔ ''تم نے مجھ سے دو شرطیں پوری کرنے کے لیے کہا تھا۔ نمبر ایک' مجھے فرحانہ کو لے کر اکیلے آنا ہوگا' نمبر دو' فرحانہ اور جنید خان کا تبادلہ' سوسائٹی قبرستان کی سائیڈ والی گلی کے گیٹ پر ہوگا۔''

''ہاں...... مجھے وہ دونوں شرطیں یاد ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم اس سلسلے میں نیا کیا بتانے والے ہو؟''

''نیا کچھ نہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سب وہی ہے جو تم نے کہا تھا بس' میں اس پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی چاہتا ہوں۔''

''کیسی تبدیلی؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مقام اور تعداد کی تبدیلی؟''

''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے کہا۔ ''جو بھی کہنا چاہتے ہو' کھل کر کہو شہزاد۔''

''میں فرحانہ اور جنید خان کے تبادلے والے مقام میں تھوڑی تبدیلی چاہتا ہوں۔ مسجد کے دروازے کے سامنے یہ مناسب نہیں رہے گا۔ ایک بجے دوپہر ظہر کی نماز کا وقت بھی ہے۔''

جگہ کی تبدیلی کے حوالے سے وہ میرے اور ماجد کے دل کی بات کہہ رہا تھا لیکن میں نے اپنی کیفیت اس پر ظاہر نہیں ہونے دی اور چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مسجد کا گیٹ تو نہایت ہی پرسکون اور امن وسلامتی کی جگہ ہے۔ تم مقام بدل کر کوئی گیم کھیلنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے ہو؟''

''میری نیت پر شک نہ کرو۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں چاہتا ہوں تبادلے والا یہ معاملہ بہ خیر وخوبی انجام تک جا پہنچے۔''

''میں بھی ایسا ہی چاہتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے میں تمہاری خواہش ضرور پوری کروں گا۔ ہم تبادلے کے مقام کو ایک دو گلی آگے کر لیتے ہیں۔''

''ہاں' ایک دو گلی آگے۔'' اس نے میرے کہے ہوئے الفاظ کو دہرایا پھر بولا۔ ''ادھر آگے رہائشی علاقے کے بیچوں بیچ ایک پارک ہے۔ میرا خیال ہے' اس پارک کے باہر یہ تبادلہ زیادہ مناسب رہے گا۔''

وہ جس پارک کا ذکر کر رہا تھا وہ میرا دیکھا ہوا نہیں تھا لیکن ماجد نے وہ پارک یقیناً دیکھا ہوگا۔ وہ طارق روڈ کے جس فلیٹ میں رہتا تھا' یہ علاقہ اس سے زیادہ دور نہیں تھا۔

''ڈن!'' میں نے مضبوط لہجے میں شہزاد کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''پارک کے باہر کس جگہ...... میرا مطلب ہے' کس لوکیشن پر......؟''

''پارک کا وہ کونا جو خالد بن ولید روڈ کی جانب ہے' میں ٹھیک ایک بجے تمہیں وہاں ملوں گا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نیلے رنگ کی ٹویوٹا کرولا میں فرحانہ کو لے کر آؤں گا۔ تم پارک کے اس کونے پر پہنچو گے جہاں سوسائٹی قبرستان والی مسجد قریب پڑتی ہے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے سانس ہموار کرنے کو رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''تم کس گاڑی میں جنید خان کو لے کر آؤ گے؟''

''یہ میں تمہیں تھوڑی دیر کے بعد بتا سکوں گا۔'' میں نے کہا۔

شہزاد کے اس سوال کا جواب دینے کے لیے مجھے ماجد سے بات کرنا تھی کیونکہ وہی جانتا تھا' کون سی گاڑی اس مشن میں استعمال ہونے جا رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' شہزاد کی سنجیدہ آواز ابھری۔ ''تم جنید خان کو لے کر ٹھیک ایک بجے پارک کے اس کونے پر موجود ہو گے جس کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔ میں بھی اپنے بتائے ہوئے کونے پر پہنچ جاؤں گا۔ ہم دونوں اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھے رہیں گے' صرف جنید خان اور فرحانہ کو حرکت میں آنا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں سمجھا نہیں' تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔''

''ویری سمپل۔'' وہ بہ دستور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''تبادلہ جنید خان اور فرحانہ کا ہونا ہے' تمہارا اور میرا نہیں' لہٰذا ہم دونوں اپنی اپنی گاڑی کے اندر موجود رہیں گے۔ سیل فون پر ٹھیک ایک بجے ہمارا رابطہ ہوگا۔ اس کے بعد میں فرحانہ کو گاڑی سے باہر نکال دوں گا۔ عین اسی وقت تم بھی جنید خان کو اپنی گاڑی سے باہر نکالو گے۔ یہ دونوں افراد اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو جائیں گے یعنی فرحانہ تمہارے پاس پہنچ جائے گی' اور جنید خان میرے پاس۔ اس کے بعد ہم اپنی اپنی مرضی کی سمت چل پڑیں گے۔ میں نے تبادلے کے اس طریقے سے فرحانہ کو تفصیلاً آگاہ کر دیا ہے۔ تم بھی جنید خان کو سمجھا دینا تاکہ کوئی کنفیوژن پیدا نہ ہو۔''

''تمہاری یہ ''تبادلے'' والی پلاننگ تو نہایت ہی عمدہ ہے۔ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اگر تمہارے ذہن میں کوئی چال بازی نہ پنپ رہی ہو تو......''

''تم صرف اپنی سوچ کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرو۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میری طرف سے کوئی بے ایمانی نہیں ہوگی۔''

''اوکے......!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''ذرا فرحانہ سے میری بات تو کرا دو۔''

یہ آخری جملہ بے ساختہ میری زبان سے جدا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی دل کی دھڑکن میں بھی بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ شہزاد نے رکھائی سے جواب دیا۔

''تمہاری فرحانہ اس فون کے ساتھ نہیں بندھی ہوئی جو میں فوراً تمہاری اس سے بات کرا دوں۔ وہ گھنٹے' سوا گھنٹے کے بعد تمہارے پاس ہوگی۔ ذرا صبر سے کام لو......''

''وہ ٹھیک تو ہے نا؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''ایک دم ٹھیک ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''جب وہ اپنے قدموں سے چل کر' میری گاڑی سے تمہاری گاڑی تک پہنچے گی تو تمہیں اس وقت میری بات کا یقین آ جائے گا۔''

''اوکے...... اور دوسری بات؟''

''دوسری بات......'' اس کی چونکی ہوئی آواز ابھری۔

''تم نے کہا تھا کہ مقام اور تعداد میں تھوڑی تبدیلی کرنا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''مقام کا معاملہ تو طے ہوگیا...... یہ تعداد کا کیا قصہ ہے؟''

''اوہ ......اچھا وہ'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا پھر بتانے لگا۔''تعداد سے میری مراد یہ تھی کہ میرے اور فرحانہ کے علاوہ میرے ساتھ ایک آدمی اور ہوگا۔''

''کیا مطلب!''میں نے پوچھا۔''کون ہوگا وہ؟''

''ڈرائیور......''اس نے جواب دیا۔''میں تو فرحانہ کے ساتھ کرولا کی عقبی نشست پر موجود ہوں گا۔ گاڑی ڈرائیو کرنے کے لیے تو ایک آدمی چاہیے نا!''

''درست۔'' میں نے کہا۔''یہ سہولت مجھے بھی چاہیے ہوگی۔ جیسے تم فرحانہ کی طرف سے غافل ہوکر خود ڈرائیونگ کی ذمے داری نہیں اٹھانا چاہتے' ویسے ہی میں بھی جنید خان کی جانب سے کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔ مجھے جنید خان کو اپنی نگرانی میں رکھنا ہوگا اور ڈرائیونگ کوئی اور کرے گا...... بولو' منظور ہے؟''

''منظور ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے اس سے یہ کہنے کے بعد رابطہ ختم کر دیا کہ تھوڑی دیر میں اسے اپنی گاڑی کے رنگ اور میک کے بارے میں بتاتا ہوں۔

اگلے ہی لمحے میں نے ماجد کو فون کیا۔ نہایت ہی جامع مگر مختصر الفاظ میں اسے شہزاد سے ہونے والی اپنی اہم گفتگو کے بارے میں بتایا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔

''یہ تعداد میں ایک بندے کے اضافے والا آئیڈیا ہمیں بھی سوٹ کرتا ہے۔ اس بہانے ڈرائیور کے روپ میں تمہارے ساتھ رہ سکوں گا۔''

''جب شہزاد نے یہ بات کی تھی تو اسی وقت میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔''ماجد! تم نے گاڑی وغیرہ کا تو ڈی سائیڈ کرلیا ہے نا؟''

''وھائٹ کلٹس۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔''اس مشن میں سفید کلٹس کا استعمال ہوگی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر میں اور عقبی نشست پر تم جنید خان کے ساتھ بیٹھے ہوگے...... نقلی جنید خان کے ساتھ۔''

''اوہ......''میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔''تم بھی اپنے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرلینا۔ ہوسکتا ہے' بعد میں بھی کبھی شیروانی یا اس کے آدمیوں سے تمہارا واسطہ پڑ جائے۔''

''ضرور...... میں اس نکتے کو اپنے ذہن میں رکھے ہوئے ہوں۔'' اس نے کہا۔''تم فکر نہ کرو' میں تمہیں کافی بدلا ہوا نظر آؤں گا۔''

''دیٹس گریٹ۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔''ہماری ملاقات کب اور کیسے ہورہی ہے۔ میرا مطلب ہے' میں تمہیں کب اور کہاں جوائن کرنے والا ہوں؟''

''تم ٹھیک ساڑھے بارہ بجے لبرٹی کے سگنل پر آجانا۔'' ماجد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''میں تمہیں پک کرلوں گا۔''

''یعنی آدھا گھنٹا قبل از مقررہ وقت......!''

''ہاں۔ یہ آدھا گھنٹا ہم ریکی کرتے ہوئے گزاریں گے۔'' وہ بہ دستور گہری سنجیدگی سے بولا۔''جائے وقوعہ کا جائزہ لیں گے۔ مذکورہ پارک کے آس پاس کی گلیوں کا معائنہ کریں گے جس کے ہمیں دو فائدے ہوں گے' نمبر ایک' اس علاقے کا نقشہ ہمارے ذہن میں تازہ ہوجائے گا اور واپسی پر ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا' نمبر دو......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس ٹماٹر گشت سے ہمیں یہ اندازہ کرنے میں بھی آسانی رہے گی کہ شہزاد ہمارے ساتھ کوئی چالاکی تو نہیں کررہا۔ تبادلے کا مقام اس کا طے کردہ ہے۔ عین ممکن

ہے' اس نے اپنی مدد کے لیے آس پاس کی گلیوں میں اپنے چند پٹھے تعینات کر رکھے ہوں۔ یہ ناممکن تو نہیں ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو ماجد۔''میں نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔''شیروانی اور اس کا سارا گروہ جس قماش کے لوگ ہیں ان کی کسی بھی بات پر آنکھیں بند کرکے یقین نہیں کیا جاسکتا۔''میں نے لمحاتی توقف کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کیا۔''......اور یہ ٹماٹر گشت کیا ہوتی ہے؟''

''مٹر گشت کی بڑی بہن۔'' وہ زندہ دلی سے بولا۔''جب پیدل چلنے کو مٹر گشت کہا جاسکتا ہے تو یہی کام کار میں بیٹھ کر کیا جائے تو اسے ٹماٹر گشت کیوں نہیں کہہ سکتے۔''

''خاصے موڈ میں لگ رہے ہو......''

''میں کب موڈ میں نہیں ہوتا؟'' جواب دینے کے بجائے الٹا اس نے مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں نے ماجد کے حوالے سے جو پہلا تاثر قائم کیا تھا وہ اب یک سر زائل ہوچکا تھا۔ وہ خاموش طبع اور گم صم انسان نہیں تھا۔ وہ بولنا جانتا تھا اور حسب حال خوب بولتا تھا۔ موقع محل کی مناسبت سے اس کا ذوق خاصا بڑھیا تھا۔

میں نے بھی اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور پوچھا۔''ماجد تم تو بدلے ہوئے حلیے میں ہوگے' پھر میں تمہیں کیسے پہچانوں گا۔ کوئی کوڈ ورڈز رکھ لیں؟''

''سب سے بڑا کوڈ تو گاڑی کی نمبر پلیٹ ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا اور مجھے وھائٹ کلٹس کا نمبر نوٹ کرادیا' پھر کہا۔''میرا خیال ہے' اس کے بعد کسی قسم کے کوڈ ورڈز کی ضرورت نہیں رہے گی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی تمہیں اپنے پہلو میں جنید خان بیٹھا نظر آئے گا۔''

''اوکے......!''میں نے کہا۔

ہمارے درمیان مزید چند منٹ تک حالات حاضرہ پر بات ہوتی رہی پھر ساڑھے بارہ بجے ملاقات کی یقین دہانی کرانے کے بعد میں نے رابطہ ختم کر دیا۔

اگلے ہی لمحے میں شہزاد کے نمبر پر کال کر رہا تھا۔

❀......❀......❀

ماجد کے بنائے ہوئے جنید خان کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ جب میری نظر دھوکا کھاسکتی تھی تو یقیناً شہزاد کو بھی اس بندے کے جنید خان ہونے پر کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔

''کمال ہے......'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''میں ماجد ہوں۔ تم اسد ہو اور یہ شفیع محمد عرف جنید خان ہے۔'' ماجد نے ٹھوس انداز میں کہا۔''یہ کمال کون ہے بھئی۔ کہیں تم میرے بدلے ہوئے حلیے کی وجہ سے مجھے تو کمال نہیں کہہ رہے......؟''

اس وقت ہم وھائٹ کلٹس میں مذکورہ پارک اور اس سے ملحقہ علاقے کا دورہ کر رہے تھے۔ ماجد کی شوخی نے مجھے بھی بہت حوصلہ دیا ورنہ ہم اس وقت جس قسم کے حالات سے گزر رہے تھے ان میں شوخی اور شرارت کی باتیں نہیں سوجھتیں۔ ہر لمحہ ذہن کسی نہ کسی فکر یا اندیشے ہی میں گھرا رہتا ہے۔ ماجد کی اس نوعیت کی باتیں اس کے اعصاب کی مضبوطی کو ظاہر کرتی تھیں۔ میں نے بڑی رسان سے جواب دیا۔

''میں کسی کمال یا جمال نامی آدمی کی بات نہیں کر رہا بلکہ تمہارے فن کی داد دے رہا ہوں۔ تم نے بڑی مہارت سے ان صاحب کو جنید خان بنا دیا ہے۔''

''ان صاحب نہیں...... شفیع محمد شاہ۔'' میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے نقلی جنید خان نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔

”بھئی جیسا کہ میں تمہیں بتاچکا ہوں......“ ماجد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کا نام شفیع محمد ہے مگر یہ خود کو شفیع محمد شاہ کہتا ہے۔ اسے ایکٹنگ کا بہت شوق ہے اور شفیع محمد شاہ اس کے پسندیدہ آرٹسٹ تھے۔ یہ ہر وقت انہی کی کاپی کرتا رہتا ہے اور انہی کی محبت بھری عقیدت میں اس نے اپنے نام کے ساتھ ”شاہ“ کا اضافہ بھی کرلیا ہے۔“

”اوہ......!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر کہا۔ ”شفیع محمد شاہ واقعی بے مثال اداکار تھے۔“

”اور جہاں تک تمہارے بیان کردہ ”کمال“ کا تعلق ہے نا......“ ماجد نے کہا۔ ”تو وہ کمال بشارت نے کیا ہے۔ میں نے صرف ڈائریکشن دی ہے۔“

میں نے شفیع محمد سے پوچھا۔ ”شاہ جی! آج ہماری پہلی ملاقات ہے......“

”ان شاءاللہ......“ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ”اب ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ مجھے پتا چلا ہے آپ ماجد کے دوست ہیں۔ میں ماجد کے دوستوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہوں اور انہیں کھونے کا کبھی تصور بھی نہیں کرسکتا۔“

وہ شخص جسامت اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے مرحوم شفیع محمد شاہ سے بہت ملتا جلتا تھا تاہم میں اس کی صورت کے حوالے سے ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ جنید خان کے میک اپ میں تھا البتہ میں نے اس کی تازہ ترین ”حرکت“ سے اس بات کا اندازہ ضرور لگالیا تھا کہ اسے بولنے‘ وقت سے پہلے بولنے اور بول کر دوسرے کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کا بھی خاصا شوق تھا۔

”یار اسد! شاہ جی بہت ہی نائس اور زندہ دل انسان ہیں۔ اس کی بات کا برا نہیں منانا۔“ ماجد نے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ یہ مجھے اور میرے دوستوں کو کھونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ مجھے اس بات کا تلخ تجربہ ہے......“

”تلخ تجربہ......!“ میں نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔ ”ماجد! میں کچھ سمجھا نہیں......؟“

ہم اس کی ہلکی پھلکی گفتگو کے ساتھ ہی اپنے اصل مقصد کے ساتھ بھی چپکے ہوئے تھے یعنی پارک کی گردونواح کا سروے......!

”اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے۔“ ماجد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تم نے وہ بلی والی مثال تو سن رکھی ہوگی جس میں ایک شخص کسی بلی سے جان چھڑانے کے لیے اسے کبھی کہیں چھوڑ آتا تھا اور کبھی کہیں لیکن وہ بلی پلٹ کر واپس اسی شخص کے پاس آجایا کرتی تھی......“

”قربانی کے بکرے اور بلی کا آپس میں کیا تعلق؟“ شاہ جی نے الجھن بھرے انداز میں سوال کرڈالا۔

”قربانی کا بکرا کون ہے بھئی؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”میں......اور کون؟“ شاہ جی نے کہا۔

”یہ خود کو قربانی کا بکرا سمجھ رہا ہے۔“ ماجد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میک اپ کے دوران میں بھی اس نے یہی رٹ لگائی ہوئی تھی......“ لمحاتی توقف کے بعد ماجد اصل موضوع کی طرف لوٹ آیا۔

”تو میں تمہیں یہ بتارہا تھا کہ......میں نے شاہ جی سے جان چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کرکے دیکھ لی جیسے اس شخص نے بلی سے جان چھڑانے کے سلسلے میں کیا تھا۔ نہ تو اس شخص کی حکمت عملی کامیاب ہوپائی تھی اور نہ ہی مجھے اپنے مقصد میں سرخ روئی حاصل ہوسکی ہے۔ لہٰذا میں نے صبر کی راہ اختیار کرلی کہ......اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے......اب یہ حضرت شفیع محمد شاہ میرے اور میرے دوستوں کے سینے پر مونگ دلنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تم اسے بھگتو گے تو تمہارا پندھواں طبق روشن اور ساتویں حس بیدار ہوجائے گی۔“

”میں نے اگر خود کو قربانی کا بکرا کہا ہے تو اس میں ایسا غلط بھی کیا ہے۔“ شاہ جی نے قدرے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ اس کا مخاطب ماجد تھا۔ ”تم مجھے قربانی کے لیے ہی تو سجا سنوار کر لائے ہو......“

”میں اسی حوالے سے پوچھنا چاہتا تھا کہ شاہ جی نے میری بات کاٹ دی تھی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ماجد! تم نے شاہ جی کو ان کے حصے کا اسکرپٹ اچھی طرح یاد کرادیا ہے نا؟“

”یہ اپنا کردار پڑھنے کے بعد مطمئن ہوکر ڈیٹ دیتا ہے۔ میرا مطلب ہے‘ ڈیٹس دیتا ہے۔“ ماجد نے کہا۔ ”میں نے ساری صورت حال اسے اچھی طرح ذہن نشین کرادی ہے۔“

میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ ”ماجد! فرض کرو‘ اگر سب کچھ ویسا ہی پیش آتا ہے جیسا ہم نے سوچا ہے اور ترتیب دیا ہے تو اس صورت میں فرحانہ ہمارے پاس اور شاہ جی شہزاد کی کسٹڈی میں چلے جائیں گے اور جب شہزاد کو پتا چلے گا کہ جنید خان کے روپ میں کوئی اور ہے تو شاہ جی مشکل میں نہیں آجائیں گے۔ تم نے ان کی سیفٹی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”یہ اللہ میاں کے چھوٹے بھائی ہیں۔“ شفیع محمد عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”ایسی باتیں اس کے ذہن میں آتی ہی نہیں ہیں......“

”کیا مطلب......؟“ شفیع محمد کے طنزیہ جملے نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”یہ تم اللہ تعالیٰ کو بیچ میں کیوں لارہے ہو؟“

میرے انداز میں بھی خود بہ خود تلخی در آئی تھی۔ میں نے محسوس کیا ماجد ڈرائیونگ کرنے کے دوران میں ہلکا ہلکا مسکرارہا تھا۔ شفیع محمد نے کہا۔

”بھائی! اللہ تو ہر معاملے میں موجود ہوتا ہے۔ شاید آپ میری بات کو سمجھ نہیں سکے ہو......“

”آپ نے بات ہی ایسی کی ہے کہ جس سے دماغ خراب ہوجائے۔“ میں نے بہ دستور خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ”آپ نے ماجد کو اللہ تعالیٰ کا چھوٹا بھائی کہا ہے نا......یہ سراسر کفر کے کلمات ہیں۔ وہ ذات پاک وحدہ لاشریک ہے۔ کوئی اس کا رشتے دار کیسے ہوسکتا ہے؟“

”ناراض نہ ہوں بھائی۔ وہ بات میں نے آپ کو سمجھانے کے لیے مثالاً کہی تھی۔“ شفیع محمد نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”ٹھہریں میں وضاحت کرتا ہوں۔“ لمحاتی توقف کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”کسی زمانے میں ایک شخص نے خدا کا چھوٹا بھائی ہونے کا دعویٰ کردیا۔ سب لوگ اس کی اس حرکت کی مذمت کرنے لگے۔ چند جذباتی نوجوان اسے گھسیٹتے ہوئے بادشاہ سلامت کے دربار میں لے گئے اور اس کی جرأت رندانہ کے بارے میں بادشاہ کو بتایا۔ یہ قصہ سن کر بادشاہ کا چہرہ غصے سے لال ہوگیا۔ اس نے غضب ناک انداز میں مذکورہ شخص سے استفسار کیا۔

”کیا تم نے ایسی کوئی بکواس کی ہے؟“

”یہ بکواس نہیں حضور‘ حقیقت ہے۔“ وہ شخص بڑے اطمینان سے بولا۔

”کیا تم ثابت کرسکتے ہو کہ تمہارا دعویٰ درست ہے؟“ بادشاہ کے غیظ و غضب میں اضافہ ہوگیا۔

”جی سرکار......ثابت کرسکتا ہوں۔“ اس شخص کے اطمینان میں شمہ برابر کمی واقع نہ ہوئی۔

”کیسے ثابت کروگے؟“ بادشاہ نے پوچھا۔ ”اللہ تعالیٰ تو قادر مطلق ہے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ تمہارے اندر ایسی کون سی خوبی ہے جس نے تمہارا دماغ خراب

کردیا ہے۔ اورتم اس قسم کے جاہلانہ دعوے کرتے پھررہے ہو......؟"

"بادشاہ سلامت۔" وہ شخص پرسکون لہجے میں بولا۔ "ابھی میں حضور کے سامنے اپنی اس خوبی کا عملی مظاہرہ کرتا ہوں۔"

بادشاہ وقت' وزیر باتدبیر اور دیگر امیر وکبیر افراد کے علاوہ تمام درباری بھی سانس روکے اس دعوے دار شخص کودیکھ رہے تھے کہ وہ کون سا کمال دکھانے والا ہے۔ اس شخص نے ایک درباری کو اپنے پاس بلالیا پھر اپنی جیب میں سے ایک خنجر نکالا اور بجلی کی سی سرعت سے اس خنجر کی نوک کی مدد سے اس درباری کی ایک آنکھ پھوڑ ڈالی۔ اگلے ہی لمحے مذکورہ گھائل درباری کی پھوٹی ہوئی آنکھ میں سے خون بہنے لگا۔

اس واقعے پرتمام لوگ مبہوت رہ گئے۔ گھائل شخص اپنی زخمی آنکھ پکڑ کرزمین پر بیٹھ گیا اور تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا۔ بادشاہ نے گرج کر اس آدمی سے پوچھا۔

"بدبخت! تم نے کیا کرڈالا......!"

"حضور! اپنے دعوے کوثابت کرنے کے لیے میں نے طاقت کا مظاہرہ کیا ہے۔" وہ شخص بے خوف لہجے میں بولا۔ "میں اس بات پرقدرت رکھتا ہوں کہ کسی کی آنکھ بھی پھوڑ ڈالوں......"

"تو اتنا ہی قدرت والا ہے تواب اس شخص کی آنکھ کو ٹھیک بھی کرکے دکھا۔" بادشاہ نے طیش کے عالم میں کہا۔ "ورنہ میں ابھی یہیں پر تیری کھال کھنچوادوں گا۔"

"حضور! ناراض نہ ہوں۔" اس شخص نے معتدل انداز میں کہا۔ "اس شخص کی آنکھ کوٹھیک کرنا میرے اختیار میں نہیں۔"

"کیوں اختیار میں نہیں......" بادشاہ نے دہاڑ کر کہا "تم تو خدا کے چھوٹے بھائی ہونے کا دعویٰ کررہے تھے۔ کیا تمہارا وہ دعویٰ جھوٹا تھا۔"

"نہیں سرکار! میں اب بھی اپنے دعوے پر قائم ہوں۔"

"توپھر فوراً ٹھیک کر اس بندے کی آنکھ کو......!"

"نہیں کرسکتا حضور۔" اس شخص نے منت ریز لہجے میں کہا۔ یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔ میں مجبور ہوں۔"

"شعبہ نہیں ہے...... کا کیا مطلب ہوا۔" بادشاہ نے کھاجانے والی نظر سے گھور کراسے دیکھا۔ "تم کیوں مجبور ہو؟"

"وہ بات دراصل یہ ہے ظل الٰہی" وہ شخص وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ہم دونوں بھائیوں نے کام کے حوالے سے اپنے اپنے شعبے بانٹ رکھے ہیں۔ تعمیر کے سب کام بڑے بھائی صاحب کرتے ہیں۔ میں صرف تخریب کے کام کرتا ہوں۔ اس شخص کی آنکھ کو بڑے بھائی صاحب ہی ٹھیک کرسکتے ہیں۔ ہاں' اگر کسی اور کی آنکھ کو پھوڑنا ہوتو میں حاضر ہوں۔"

یہاں تک پہنچنے کے بعد شاہ جی نے ایک گہری اور آسودہ سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "بادشاہ سلامت نے اس دعوے دار شخص کا جوبھی حشر کیا ہوگا اس کا اندازہ آپ بھی بہ خوبی لگاسکتے ہیں اس مثال سے میں صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ماجد صرف پھنسانے والے کام کرتے ہیں۔ اس بندے کو کسی کی سیفٹی سے کوئی مطلب نہیں۔ یہ کسی کو بھی توپ کے دہانے پر باندھ کر گولا داغ سکتے ہیں۔ میں نے اس کو بہت بھگتا ہے۔ اب آپ بھی بھگتو۔"

"اسد! تمہیں شاہ جی کی باتوں سے یہ تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ ماشاء اللہ بہت ہی چھپے رستم بلکہ پہنچے ہوئے انسان ہیں۔"

"آپ دونوں ہی بہت دور تک پہنچے ہوئے ہو بھائی۔" میں نے کہا۔ "لگتا ہے' میں تم دونوں کے

بیچ......"

"جیسے رضیہ غنڈوں میں پھنس جاتی ہے۔" شاہ جی نے جملہ کسا۔ "اسد! آپ ایسا ہی محسوس کررہے ہو نا۔ لیکن آپ فکر نہیں کرو۔ نہ تو آپ رضیہ ہو اور نہ ہی ہم غنڈے ہیں۔"

ماجد نے مجھ سے پوچھا۔ "اسد! تمہیں کہیں سے لگتا ہے کہ اس خدا کے بندے کو کسی سیفٹی وغیرہ کی بھی ضرورت ہے؟"

"یہ آپ دونوں کا آپس کا معاملہ ہے بھائی۔" میں نے اس موضوع کوختم کرنے کی غرض سے کہا۔ "آپ لوگوں نے جو بھی سوچا ہوگا' اسی میں کوئی بہتری ہوگی۔ اگر شاہ جی مطمئن نہیں ہوتے تو اس آگ میں چھلانگ لگانے کو کیوں تیار ہوتے۔"

"بالکل درست کہا تم نے۔" ماجد نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "آج شاہ جی سے تمہاری پہلی ملاقات ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں گی اور ان کا ایک کے بعد ایک گن تم پر عیاں ہوتا چلا جائے گا۔"

"ماجد! ایک بجنے میں پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اب ہمیں پارک کا رخ کرنا چاہیے۔ شہزاد نے مجھے ٹھیک ایک بجے پارک کے کونے پر موجود رہنے کو کہا ہے۔"

"اوکے......!" ماجد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

ہم نے گھوم پھر کر اچھی طرح اندازہ لگالیا تھا کہ اس پارک کے قرب وجوار میں ہمیں گھیرنے کے لیے کسی قسم کی مورچابندی نہیں کی گئی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ شہزاد نہایت ہی ایمان داری کے ساتھ اس معاملے کو نمٹانا چاہتا تھا اور...... اگر اس کے دل میں کوئی ہیر پھیر اور نیت میں کوئی کھوٹ تھی اور اس نے نہایت ہی خفیہ طور پر اپنے بندے کہیں چھپا کر ہماری گھات میں لگا رکھے تھے تو پھر وہ جانے اور اس کا خدا جانے۔ ہمارا معاملہ اور نیت صاف تھی۔

اچانک اندر سے ایک آواز اٹھی اور اس نے میری سوچ میں تعطل پیدا کردیا۔ بے ساختہ ابھرنے والی اس آواز نے مجھ سے سوال کیا۔

"کون سا معاملہ اور کیسی نیت اسد صاحب! کیا آپ لوگ واقعی جنید خان کوشہزاد کے حوالے کررہے ہو؟ اگر تمہارا معاملہ اور نیت صاف ہوتی تو پھر شفیع محمد کو جنید خان بنانے کی کیا ضرورت تھی......؟"

یہ انسان کے اندر جو ایک اور انسان بیٹھا ہوتا ہے نا' یہ بہت ہی سفاک اور منہ پھٹ ہوتا ہے۔ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتا اور ایک پل میں انسان کو آئینے کے سامنے لے جاکر کھڑا کرتا ہے۔ عرف عام میں اس اندر کے انسان کو "ضمیر" کا نام دیا جاتا ہے کوئی بھی شخص جب کوئی غلط کام کرنے کے بارے میں سوچتا ہے تو یہ حضرت اسے ضرور ٹوکتے ہیں اور جب کوئی شخص غلط کرچکتا ہے تو یہ ضمیر صاحب اس کے کارنامے پر لعنت ملامت ضرور کرتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ فلاں شخص کو تو غلط اور صحیح کی ذرا بھی پروا نہیں رہی۔ لگتا ہے' اس کا ضمیر مردہ ہوگیا ہے۔

ضمیر کبھی مردہ نہیں ہوتا۔ آپ کی آخری سانس تک آپ کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اگر آپ اس کی روک ٹوک اور لعنت ملامت پر کان نہ دھریں اور اپنی خوشیوں میں مگن رہیں تو آپ کی اس عاقبت نااندیشی کے باعث یہ ضمیر صاحب بہت رنجیدہ ہوجاتے ہیں اور دل برداشتہ ہوکر آپ کو عاق کردیتے ہیں...... یعنی آپ کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ وہ کیفیت ہوتی ہے جب آپ کا ضمیر آپ کے دیے ہوئے دکھوں سے دھندلا جاتا ہے' کملا جاتا ہے اور آپ کے اندر ایک کونا پکڑ کر خاموش بیٹھ جاتا ہے اور دل ہی

دل میں یہ تسبیح پڑھتا رہتا ہے...... "بیٹا! میری نہیں سنتا' نہ سن۔ تجھے لگ پتا جائے گا' جب تیرا کیا دھرا تیرے سامنے آئے گا۔ میں تو اب کچھ نہیں بولنے والا......"

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ میرا ضمیر مجھ سے ناراض نہیں تھا۔ اس نے ابھی مجھے عاق نہیں کیا تھا اسی لیے بڑے طنزیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔ "کون سا معاملہ...... کیسی نیت اسد صاحب؟"

میں نے اس کے چبھتے ہوئے سوال کے جواب میں کہا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ اصلی جنید خان ہماری دسترس میں نہیں اس لیے شفیع محمد کو جنید خان بنانا پڑا۔ فرحانہ کی واپسی کے لیے جنید خان کا ہونا ضروری تھا۔"

"چیٹنگ تو چیٹنگ ہی ہوتی ہے اسد صاحب!" اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "چاہے کسی مجبوری کے تحت کی جائے یا مصلحتاً۔ اسے جائز تو قرار نہیں دیا جاسکتا نا؟"

"کسی شخص کو مرض سے نجات دلانے کے لیے اسے کڑوی دوا پلانا پڑتی ہے۔" میں نے کہا۔ "انجکشن لگانا پڑتا ہے اور اگر ضرورت پیش آئے تو اس کا آپریشن بھی کرنا پڑتا ہے۔ ہم یہ سب کچھ بھلائی اور سلامتی کے خیال سے کر رہے ہیں۔"

"آہاہاہا...... ہاہاہا......" اس نے معنی خیز انداز میں قہقہہ لگایا۔ "عقل عیار ہے' بہت عیار......!"

اگلے ہی لمحے ماجد نے گاڑی روک دی۔ سامنے ہی وہ پارک نظر آ رہا تھا جس کے باہر روڈ پر چند منٹ کے بعد فرحانہ اور جنید خان کا تبادلہ ہونے والا تھا لیکن ماجد نے جہاں گاڑی روکی تھی یہ وہ کارنر نہیں تھا جہاں شہزاد سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مجھے ہونا چاہیے تھا۔

"ماجد......" میں نے پارک کے مذکورہ کونے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اس کارنر پر شہزاد کی آمد کا انتظار کرنا ہے۔"

"ایک بجنے میں ابھی تین منٹ باقی ہیں۔" ماجد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر دوسرے کونے کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"شہزاد نے اس کونے پر پہنچنے کو کہا ہے نا؟"

"ہاں' وہ پارک کے اسی کونے پر پہنچے گا۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "لیکن وہ کونا تو خالی نظر آ رہا ہے۔"

"ممکن ہے شہزاد اس علاقے میں موجود ہو۔" ماجد نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر چاروں جانب نگاہ دوڑانے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ "ہوسکتا ہے' ہماری طرح وہ بھی کہیں سے دیکھ کر ہمارے والے کونے کے آباد ہونے کا انتظار کر رہا ہو......"

"ہاں...... یہ ممکن ہے۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "شہزاد نے نیلی ٹویوٹا کرولا میں آنے کو کہا تھا اور دور دور تک اس رنگ کی کوئی گاڑی دکھائی نہیں دے رہی لیکن......"

میں جملہ ادھورا چھوڑ کر سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو ماجد نے پوچھا۔

"لیکن کیا......"

"لیکن یہ کہ......" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اپنے وعدے کے مطابق ٹھیک ایک بجے اس کونے پر موجود ہونا چاہیے جہاں پر ہماری موجودی طے شدہ ہے۔"

"ایک بجے سے ایک منٹ پہلے۔" ماجد نے کہا۔ "تاکہ ہماری جانب کسی نشیب کا امکان باقی نہ رہے۔"

"اور ہم نشیب میں پانی بھرنے کے عمل سے محفوظ رہیں۔ میں نے ماجد کے آخری جملے کی تشریح کرتے ہوئے کہا۔

"اوکے باس!" ماجد نے یہ کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

ٹھیک ایک منٹ کم ایک بجے ہماری وہائٹ کلٹس

پارک کے اس کونے پر موجود تھی جو شہزاد کے ساتھ طے ہو چکا تھا۔ مگر پارک کا دوسرا کونا ابھی تک خالی تھا۔ ہماری گاڑی کا رخ خالد بن ولید روڈ کی جانب تھا۔ یقیناً اسی طرف سے شہزاد کی نیلی ٹویوٹا کرولا کو آنا تھا۔ ہماری نگاہیں اسی سمت لگی ہوئی تھیں اور ایک ایک پل پہاڑ کی طرح بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔

"کہیں شہزاد نے آپ کو الو تو نہیں بنا دیا۔" شفیع محمد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسا نہیں ہوسکتا شاہ جی۔" میں نے بہ دستور سامنے دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔"

"دل کی گواہی نہ تو لڑکی کے والدین کے لیے قابل قبول ہوتی ہے اور نہ ہی عدالت میں اسے کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔" شفیع محمد نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"بہرحال' یہ ہماری پہلی ملاقات ہے اور میں نہیں چاہتا' یہ آخری ملاقات ثابت ہو۔ اس لیے میں آپ کے دل کی گواہی کو تسلیم کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کرتا ہوں کہ شہزاد' فرحانہ کو لے کر ضرور آئے گا۔"

"اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر چلا جائے گا۔" ماجد نے سرسری انداز میں کہا پھر اپنے سیل فون کے اسکرین کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"بارہ انسٹھ تو ہو چکے۔ اب یہ کسی بھی لمحے......!"

"بارہ ساٹھ ہو جائیں گے۔" شاہ جی نے قطع کلامی کرتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا۔

"شاہ جی! تمہاری تو مت ماری گئی ہے۔" ماجد نے معتدل انداز میں کہا۔ "بارہ ساٹھ نہیں' ایک کہو...... اگر تم اپنی رخصتی کی وجہ سے اتنے ہی خوف زدہ ہو تو پہلے ہی منع کر دیتے' میں کسی اور کا بندوبست کر لیتا۔"

"میں خوف زدہ ہوں اور نہ ہی حواس باختہ۔" شاہ جی نے برا مناتے ہوئے کہا۔ "بس' ایسے ہی میری زبان سے "بارہ ساٹھ" سلپ ہو گیا تھا۔"

"تم لوگ خاموش نہیں ہوسکتے۔"

میں نے بے ساختہ انہیں ٹوک دیا تھا کیونکہ اسی لمحے میں نے اپنے پہلو میں سے ایک نیلی گاڑی کو نکل کر آگے بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ گاڑی صد فیصد ٹویوٹا کرولا ہی تھی۔ شہزاد سامنے سے نہیں بلکہ ہمارے عقب سے نمودار ہوا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔

ہمارے پہلو سے گزرنے والی اس نیلی ٹویوٹا کرولا کو ماجد نے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "اوہ...... یہ کم بخت ہمارے تعاقب میں پیچھے کہیں کھڑا تھا۔"

نیلی ٹویوٹا کے اندر میں جھانک نہیں پایا تھا کیونکہ وہ ایک دم ہماری گاڑی کے پہلو سے نکل کر آگے بڑھ گئی تھی۔ اگر مجھے اس بات کا پہلے سے علم ہوتا کہ شہزاد عقبی سمت سے آئے گا تو میں چوکنا رہتا' میں تو سامنے' پارک کے دوسرے کونے پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔ بہرحال' نیلی ٹویوٹا کی عقبی نشست پر میں نے ایک مرد اور ایک عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ان دونوں کی بھی مجھے صرف پشت نظر آئی تھی یعنی بالائی دھڑ کا اوپری حصہ۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ فرحانہ اور شہزاد ہی ہوں گے کیونکہ میں ان کی صورتیں نہیں دیکھ پایا تھا۔

نیلی ٹویوٹا سبک خرامی سے چلتے ہوئے پارک کے دوسرے کونے پر پہنچی اور پھر رک گئی۔ اگلے ہی لمحے میرا سیل فون جاگ اٹھا۔ میں نے سیل کو سائیلنٹ موڈ پر رکھا ہوا تھا۔ وائبریشن کے ساتھ ہی سیل کی اسکرین روشن ہوئی اور وہاں شہزاد کا نام چمکنے لگا۔

میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ "ہیلو......"

"ایک بج گیا۔" شہزاد نے گہری سنجیدگی سے کہا "اور ہم دونوں بھی پروگرام کے مطابق اپنے اپنے مقام پر موجود ہیں۔ کیا خیال ہے' تبادلے کا عمل شروع کیا

جائے......؟''

''نیکی اور پوچھ پوچھ'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایسے کاموں میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی لیکن......''

''لیکن کیا؟'' وہ جلدی سے بولا۔

''لیکن یہ کہ......بسم اللہ تمہاری طرف سے ہونا چاہیے۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''اوکے......ایزیو وِش!'' اس نے سرسری انداز میں کہا۔ ''تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں فرحانہ کو گاڑی سے باہر نکال رہا ہوں' جب تم اسے آزاد اور صحیح سلامت دیکھ لو تو جنید خان کو اپنی گاڑی سے نیچے اتار دینا۔ میں تمہیں اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔''

''بس' اتنا وقت ہی کافی ہے۔'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

فرحانہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے زندہ اور سلامت دیکھنے کے تصور نے میرے رگ وپے میں سرور بخش سنسنی دوڑا دی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دے ڈالا ہو۔

''اور ہاں......'' شہزاد کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ''جب جنید خان میری گاڑی کے اندر پہنچ جائے گا تو میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ تمہاری مرضی ہے' جو جی میں آئے کرتے رہنا......خدا حافظ۔''

''اللہ حافظ......!'' جب تک میں یہ الفاظ ادا کرتا' شہزاد نے ٹیلی فونک رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

ماجد اس دوران میں اپنی گن کو ''ریڈی'' کر چکا تھا۔ اس نے گمبھیر انداز میں شاہ جی سے کہا۔

''لے بیٹا! تیار ہو جا۔ تیرے بلی چڑھنے کا وقت آ گیا ہے......''

ماجد نے یہ جملہ اگرچہ گہری سنجیدگی سے ادا کیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی اس میں تفریح کا پہلو موجود تھا۔

شاہ جی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی......''

''میں بکرے تک محدود ہوں اور تم اس کی ماں تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہو۔'' ماجد نے ونڈ اسکرین کے اس پار نیلی ٹویوٹا کرولا کو دیکھتے ہوئے کہا پھر شاہ جی سے پوچھا۔ ''سب یاد ہے نا' تمہیں شہزاد کی گاڑی کے پاس پہنچنے سے پہلے کیا کرنا ہے؟''

''ایک دم ازبر......'' شاہ جی بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''کہو تو سنا دوں؟''

ان کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ انہوں نے اس مشن کے حوالے سے کوئی خاص ''سین'' پہلے سے ڈی سائیڈ کر رکھا تھا جس کے بارے میں انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ جبھی میں تشویش میں مبتلا تھا اور وہ دونوں مطمئن بیٹھے ایک دوسرے کی کھال کھینچنے کا کھیل' کھیل رہے تھے۔

ماجد نے شاہ جی کے سوال کے جواب میں جلدی سے کہا۔

''نن......نہیں' اس کی کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی موقع۔ ریہرسل کا وقت گزر چکا شاہ جی' اب آپ ٹیک دیں......ایسی ٹیک کہ فوراً شاٹ اوکے ہو جائے۔ ری ٹیک کی گنجائش نہیں ہے......!''

''اوکے باس......'' شاہ جی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اس کے بعد میں ان دونوں کی باتوں پر توجہ نہ دے سکا کیونکہ اسی لمحے نیلی ٹویوٹا کرولا کا عقبی دروازہ کھلا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ اس کھلے ہوئے دروازے میں سے میری جان تمنا نمودار ہونے والی تھی۔ فرحانہ کی صورت کو نہ دیکھے ہوئے ابھی چند روز ہی گزرے تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا' میں اسے کئی سالوں' کئی صدیوں کے بعد دیکھنے والا ہوں۔

فرحانہ گاڑی سے باہر نکل آئی۔ وہ مجھ سے اتنے فاصلے پر تھی کہ میں اس کی صورت کو آئینے کی طرح تو نہیں دیکھ سکتا تھا تاہم میں نے اس کے قد کاٹھ جسامت اور حلیے سے فوراً پہچان لیا۔ وہ کوئی اور نہیں' میری فرحانہ ہی تھی۔ اگلے ہی لمحے میرے کانوں میں ماجد کی تحکمانہ آواز پہنچی۔

''گو......!''

یہ لفظ ماجد نے جنید خان (شاہ جی) کے لیے ادا کیا تھا کیونکہ تبادلے کے اصول کے مطابق اب اسے گاڑی سے باہر نکلنا تھا۔ ماجد کی آواز سنتے ہی شفیع محمد نے اپنی جانب کا دروازہ کھولا اور گاڑی سے باہر نکل گیا۔

''اسد! تم ریڈی ہونا......؟'' ماجد کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ایک دم ریڈی۔'' میں نے چاق وچوبند لہجے میں کہا۔

''فرحانہ جیسے ہی گاڑی کے اندر بیٹھے' تم دونوں جھک کر بیٹھ جانا' مطلب یہ کہ سامنے سے اور عقب سے تم کسی کو نظر نہ آؤ' وہ بہ دستور سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں گاڑی کو ریورس میں بہت تیزی کے ساتھ نکالوں گا۔ تم دونوں سنبھل کر بیٹھنا۔''

''اوکے......میں صورت حال کی نزاکت کو سمجھ رہا ہوں'' میں نے فرحانہ کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''دشمن کی جانب سے کسی بھی اوچھے ہتھکنڈے کی توقع رکھنا چاہیے۔ شہزاد کی طرف سے ہماری گاڑی پر فائرنگ ہو سکتی ہے۔''

''تم بالکل صحیح سمت میں سوچ رہے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے ریورس گیئر لگا دیا ہے۔ بس' فرحانہ کے یہاں پہنچنے کا انتظار کر رہا ہوں۔''

جب ماجد نے وھائٹ کلٹس کو پارک کے اس کونے پر کھڑا کیا تھا تو گاڑی کے انجن کو بیدار ہی رہنے دیا تھا تا کہ کسی ہنگامی صورت حال میں گاڑی کو آگے پیچھے بڑھانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ ہو اور اب جیسا کہ اس نے بتایا' وہ گاڑی کو ریورس میں دوڑانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگرچہ ہمارے درمیان بات ہو رہی تھی تاہم ہم دونوں کی نگاہیں باہر فرحانہ اور شاہ جی پر لگی ہوئی تھیں۔ جو قدم بہ قدم اپنی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ یہ بڑے اعصاب شکن لمحات تھے جنہوں نے میرے دل و دماغ کو اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔

میں شاہ جی کی سیفٹی کے حوالے سے مطمئن نہیں تھا لیکن تھوڑی دیر پہلے ماجد اور شاہ جی کے درمیان جس نوعیت کی مزید گفتگو ہوئی تھی اس سے میں نے آسانی سے یہ اندازہ قائم کر لیا تھا کہ انہوں نے اس کے لیے کوئی جامع اور ٹھوس منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔

''ماجد! میں محسوس کر رہا ہوں' تم دونوں' مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔'' میں نے فرحانہ پر نگاہ رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''کس سلسلے میں؟'' وہ بھی بہ دستور باہر دیکھتے ہوئے بولا۔

''شاہ جی کے سلسلے میں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں' شاہ جی کوئی کارنامہ انجام دینے والا ہے۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھ رہا کہ کون سا کارنامہ......؟ بس' ایک بات ذہن میں رہے کہ شاہ جی کی کسی ''حرکت'' سے فرحانہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یار......!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم نے ایسا کیسے سوچ لیا۔ ہم تو یہ سب کچھ فرحانہ کو بچانے اور اس کی سلامتی کے لیے کر رہے ہیں۔''

''تمہارے ذہن میں کیا ہے؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ

سکا۔

”ویری سمپل!“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جب فرحانہ ہماری گاڑی کے قریب پہنچ جائے گی تو شاہ جی بھی شہزاد کی گاڑی کے نزدیک پہنچ چکا ہوگا۔ اس نے اپنا سیل فون سامنے والی جیب میں رکھا ہوا ہے۔ میں جیسے ہی اس کے نمبر پر کال کروں گا‘ وہ گولی کی رفتار سے بغلی گلی میں ریس لگادے گا۔ تم اس کے ڈیل ڈول پر نہ جاؤ‘ وہ بہت تیز رفتاری سے دوڑ سکتا ہے۔ تمہاری توقع سے کہیں زیادہ تیز......“

”لیکن یہ تو بہت رسکی ہوگا۔“ میں نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ”شاہ جی‘ شہزاد سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوگا اگر اس طرف سے شاہ جی پر فائر کھول دیا گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

”کچھ نہیں ہوگا اسد!“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”تم خواہ مخواہ پریشان نہ ہو۔ یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی ہے۔“

”اس کے باوجود بھی تم نے شاہ جی کو قربانی کا بکرا بنادیا!“ میں نے شاکی لہجے میں کہا۔ ”تم کس بناء پر یہ دعویٰ کررہے ہو کہ شاہ جی کو کچھ نہیں ہوگا؟“

”اس کی دو وجوہات ہیں۔“ وہ بڑی رسان سے بولا۔ ”نمبر ایک شہزاد ہرگز ہرگز اس بات کی توقع نہیں کرسکتا کہ جنید خان اچانک اس کی گاڑی کی مخالف سمت میں دوڑ بھی لگا سکتا ہے۔ لہٰذا فوری طور پر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا کہ جنید خان نے یہ کیسی حرکت کی ہے اور...... جب اس کی سمجھ میں آئے گا تب تک شاہ جی شوٹنگ رینج سے نکل چکا ہوگا۔ نمبر دو......“ اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”شاہ جی نے لباس کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں اور جو کوئی چھوٹا موٹا خطرہ ہے بھی تو یار...... اس قسم کے مشن میں اتنا رسک تو لینا ہی پڑتا ہے نا۔ ہم کسی مسجد میں تراویح پڑھنے نہیں آئے ہوئے‘ ایک خطرناک مہم سر کرنے آئے ہیں۔“

”وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچ رہے ہیں......“ میں نے جذبات سے لبریز آواز میں کہا۔

میرا اشارہ فرحانہ اور شاہ جی عرف جنید خان کی جانب تھا۔ ماجد نے فوراً میری بات کو پک کرلیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”قریب پہنچنے کے بعد وہ ایک دوسرے کو کراس کریں گے پھر فرحانہ ہمارے ہاف میں آجائے گی اور شاہ جی......“

ماجد کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اگلے ہی لمحے فضا فائرنگ کی خوف ناک آواز سے گونج اٹھی تھی۔ یہ ایک غیر متوقع اور پریشان کن صورت حال تھی۔ فرحانہ اور جنید خان اتنے قریب آچکے تھے کہ اگلے ہی لمحے وہ ایک دوسرے کو کراس کرنے والے تھے۔

جب تک ہم دونوں اس اچانک ہونے والی فائرنگ کا سبب جاننے میں کامیاب ہوتے‘ سائیڈ اسٹریٹ سے ایک سیاہ جیپ بپھرے ہوئے انداز میں نمودار ہوئی اور تیزی سے فرحانہ اور شاہ جی کی جانب بڑھ گئی۔ اس جیپ سے ہی فائرنگ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

اب اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ شہزاد نے ہمارے ساتھ گیم کھیلا تھا۔ اس سیاہ جیپ میں یقیناً شہزاد ہی کے بندے تھے جو جنید خان کے ساتھ ہی فرحانہ کو بھی اپنی گرفت میں لینے کے لیے میدان جنگ میں کود پڑے تھے۔ میں حلق کی پوری قوت سے چلایا۔

”ماجد...... گاڑی آگے بڑھاؤ...... وہ لوگ فرحانہ اور شاہ جی کو اٹھا کر اپنی جیپ میں ڈالنے والے ہیں۔“

ماجد نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا لیکن نتیجہ برعکس برآمد ہوا۔ گاڑی آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کو چل پڑی۔ ماجد نے گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈال رکھا تھا۔ وہ ایک مشین تھی۔ انسان کی طرح سوچنا سمجھنا اسے نہیں آتا تھا۔ وہ کسی بھی طور یہ نہیں جان سکتی تھی کہ ہم ان لمحات میں کیسی خطرناک اور نازک صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ وہ انجن اور مکینیکل سسٹم سے مجبور ہوکر پیچھے کو بڑھی تھی۔ ماجد کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

”اوہ شٹ......!“

جب تک ماجد گیئر بدل کر گاڑی کو آگے بڑھاتا‘ ایک دل دوز دھماکے نے زمین وآسمان کو دہلا کر رکھ دیا۔ یہ دھماکا عین اس مقام پر ہوا تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے ہم اپنی گاڑی میں بیٹھے شہزاد کی نیلی ٹویوٹا کرولا کا انتظار کررہے تھے۔ اگر اب بھی ہم اسی جگہ پر موجود ہوتے تو گاڑی کے ساتھ ہی ہمارے بھی پرخچے اڑ چکے ہوتے۔ اس گاڑی کے بیک گیئر میں ہونے کی وجہ سے ہماری جان بچ گئی تھی‘ گویا قادر مطلق نے ہمیں بال بال بچالیا تھا۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ قدرت کو ہمیں سلامت رکھنا مقصود تھا جبھی ماجد کے ذہن میں‘ گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈال کر اس کے انجن کو بیدار رکھنے کا خیال آیا تھا۔

اس دھماکے کے ساتھ ہی فضا میں گردوغبار کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا جس نے سامنے کے منظر کو دھندلا کر رکھ دیا تھا۔ اس تازہ ترین آفت کے باوجود بھی میری نظر فرحانہ اور سیاہ جیپ پر ہی لگی ہوئی تھی۔ میری آنکھوں نے جو آخری منظر دیکھا وہ سیاہ جیپ کے فرحانہ کے قریب پہنچنے کا منظر تھا‘ اس کے بعد میں کچھ بھی دیکھ نہیں پایا تھا۔ فضا میں شامل گردوغبار نے ہر منظر کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔

ماجد نے آندھی اور طوفان کی رفتار سے گاڑی کا گیئر بدل کر اسے آگے بڑھا دیا۔ وھائٹ کلٹس کسی ڈرون کی رفتار سے گردوغبار کے طوفان کو چیرتے ہوئے اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگی لیکن یہ کوشش‘ کوشش ہی ثابت ہوئی کیونکہ اس کے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوسکے تھے۔ جب ہم گردوغبار کو پیچھے چھوڑ کر اس مقام پر پہنچے جہاں تھوڑی دیر پہلے فرحانہ اور شاہ جی دکھائی دے رہے تھے تو سب کچھ غائب ہوچکا تھا۔ نہ وہاں فرحانہ تھی‘ نہ شاہ جی اور نہ ہی شہزاد کی نیلی کرولا یا افراتفری مچانے والی سیاہ جیپ۔ وہ تمام لوگ اور ان کی گاڑیاں نگاہ سے اوجھل ہوچکی تھیں۔ اس بدلے ہوئے منظر کو دیکھ کر میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔

ماجد نے گاڑی کو ایک لمحے کے لیے بھی روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے خالد بن ولید روڈ پر آ گیا پھر اس نے گاڑی کو نورانی چورنگی کی جانب بڑھادیا اور بڑبڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”حرامی شہزاد نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے ا؟“

”کسی حرامی سے اسی قسم کی توقع کی جاسکتی ہے۔“ میں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا پھر فوراً خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے کال کرتا ہوں۔“

”ہاں‘ یہ ٹھیک ہے......“ یہ کہتے ہوئے ماجد نے گاڑی کی رفتار ہلکی کردی۔

جب تک میں شہزاد کو کال کرتا‘ ماجد گاڑی کو سڑک کے کنارے لگاچکا تھا۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”تم نے گاڑی کیوں روک دی؟“

”تم آگے آجاؤ۔“ اس نے کہا۔

میں بلاچون وچرا عقبی نشست سے اٹھ کر گاڑی کی پسینجر سیٹ پر آبیٹھا۔ اگلے ہی لمحے ماجد نے گاڑی بڑھادی۔ میں نے شہزاد سے رابطہ کرنے کے لیے اپنے

سیل فون کو زحمت دی۔

تیسری گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کرلی۔ ایرپیس میں مجھے اس کی گمبھیر آواز سنائی دی۔ ”ہیلو جانی! کیسے ہو؟“

میں نے اس خیال سے کہ ماجد بھی ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن لے‘ اسپیکر فون آن کردیا اور شہزاد کے طنزیہ استفسار کے جواب میں غصیلے لہجے میں کہا۔

”یہ تم نے اچھا نہیں کیا شہزاد...... تمہیں اس کی قیمت چکانا پڑے گی۔ بہت بھاری قیمت۔“

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ عیاری سے بولا۔

”زیادہ معصوم بننے کی کوشش نہ کرو شہزاد۔ میں تم جیسی نیک پروینوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے درشتی بھرے انداز میں کہا۔ ”تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔“

”یہ تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے...... والی بات کررہے ہو تم۔“ وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے تو تمہارے کیے کی سزا دی ہے۔“

”کیے کی سزا؟“ میرے لہجے میں تلخی در آئی۔

”دھوکے کی ابتدا تمہاری طرف سے ہوئی ہے اسد۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”مجھے الزام دیتے ہوئے تم اچھے نہیں لگتے۔ میں تو اصلی فرحانہ کو تم تک پہنچا رہا تھا اور تم نے جس جنید خان کو میری طرف بڑھایا ہے‘ میں نے اس کی اصلیت بے نقاب کردی ہے۔“

”دھوکے کی ابتدا میری طرف سے نہیں بلکہ تمہاری جانب سے ہوئی ہے۔“ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”وہ کیسے؟“ اس نے پوچھا۔

”تمہاری نیت میں پہلے ہی سے کھوٹ تھی۔“ میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ”جبھی تم نے سیاہ جیپ میں اپنے آدمیوں کو تیار کررکھا تھا کہ وہ بیچ میں کود کر اس تبادلے کو تمہارے حق میں موڑ ڈالیں اور وہ......“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”وہ ٹائم بم بھی تمہاری مکاری کا منہ بولتا ثبوت ہے جو تم نے عین اس مقام پر نصب کررکھا تھا جہاں ہماری گاڑی کو موجود ہونا تھا۔ یہ سراسر بدنیتی اور دھوکا دہی ہے۔ وہ تو ہماری قسمت اچھی تھی کہ جب وہ بم پھٹا تو ہم اپنی گاڑی سمیت کافی فاصلے پر جاچکے تھے ورنہ اس وقت میں تم سے بات کرنے کے قابل کہاں ہوتا۔“

”وہ ٹائم بم نہیں‘ بلکہ ریموٹ کنٹرول بم تھا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جسے پارک کے اندر بیٹھے ہوئے میرے ایک آدمی نے بلاسٹ کیا ہے۔ ہاں‘ یہ سچ ہے کہ میں تمہارے پرخچے اڑانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ تم نے ہمارے ساتھ اتنی خوفناک بے ایمانی کی ہے کہ تمہیں جتنی بھی بدترین اور عبرت ناک سزا دی جائے وہ کم ہے......“

شہزاد کی بات نے میرے ذہن کو الجھا دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے شاہ جی کو جنید خان کے روپ میں پیش کرکے شہزاد کے ساتھ دھوکا کیا تھا لیکن شاہ جی کی اصلیت تو شہزاد کے پاس پہنچنے کے بعد کھلی تھی جب کہ ریموٹ کنٹرول بم نصب کرنے اور سیاہ جیپ کی ”دخل اندازی“ کا تو اس نے پہلے سے منصوبہ بنا رکھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”میں نے تمہارے ساتھ جو بھی بے ایمانی کی ہے وہ تو اس وقت کھلی ہے نا جب میرا آدمی جنید خان کے روپ میں تمہارے پاس پہنچا ہے۔ اس بے ایمانی کی سزا دینے کے لیے تم نے پہلے سے جو ”بندوبست“ کررکھا تھا اسے اپنی نیت کے کس کھاتے میں ڈالو گے؟“

”اسی کھاتے میں جس میں تم نے اصلی جنید خان کو

ڈالا ہے؟“ اس کی تیکھی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”کیا مطلب......؟“ میں چونک اٹھا۔

ماجد نے بھی کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔

”شروع میں میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔“ شہزاد طنزیہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن جب اصلی جنید خان کی لاش اس کی گاڑی سمیت ہمیں مل گئی تو ہم نے اپنے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کرلی۔“

”اوہ...... تو جنید خان مرگیا۔“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”تم نے اس کے زندہ بچ رہنے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“ وہ غرایا۔ ”اس کا نتیجہ تو تمہیں بھگتنا ہی تھا...... سو بھگتو۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ میں نے ضدی لہجے میں کہا۔ ”تمہاری نیت میں شروع ہی سے خرابی تھی۔ سیاہ جیپ کا ”انتظام“ تو ہنگامی حالات میں‘ سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن پارک کے کونے پر کوئی خطرناک بم نصب کرنا تمہاری بدنیتی کو ظاہر کرتا ہے۔ تم مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کا ارادہ رکھتے تھے۔“

”خواہش تو میری شدت سے یہی ہے۔“ وہ مکروہ آواز میں بولا۔ ”لیکن ہر مرتبہ تم کسی نہ کسی بہانے بچ جاتے ہو۔“

”یہ تو بچانے والے کی کرم نوازی ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر چیل‘ کوؤں کی خواہش پر جانور مرنے لگتے تو چماروں کی چاندی ہوجاتی......!“

”تم نے قسمت بہت اچھی پائی ہے اسد۔“ وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”لیکن میری ایک بات یاد رکھو‘ قسمت ہمیشہ انسان کا ساتھ نہیں دیتی۔“

”مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ کب قسمت میرا ساتھ دے گی اور کب مجھے چھوڑ جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”تم اپنے عبرتناک انجام کے لیے تیار ہوجاؤ۔ میں بہت جلد تمہاری شہ رگ ناپ لینے آرہا ہوں۔“

”تمہارے اس ”بہت جلد“ سے پہلے ہی میں تمہیں ایک ایسا تحفہ دوں گا کہ تم میری شہ رگ کو بھول کر‘ اپنے ناخنوں سے اپنی ہی شہ رگ کو ادھیڑ ڈالو گے...... مرنے کی خواہش کرو گے مگر مر نہیں سکو گے اور جینا...... جینا تو میں تمہارا ایسا عذاب ناک بنادوں گا کہ......“

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ”کہ...... کیا؟“

”انتظار کرو...... صرف انتظار......“ وہ زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ”اور اس نمبر پر یہ ہمارے بیچ آخری رابطہ ہے۔ آج کے بعد تمہیں یہ نمبر آن نہیں ملے گا۔ کبھی نہیں...... وش یو بیڈ لک اینڈ بیڈ بائے۔“

”پتا نہیں‘ تم کیا بکواس کررہے ہو......؟“ میں نے کہا۔

دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں آیا۔ لائن بے جان ہوچکی تھی۔ میں نے ری ڈائل کیا تو ”سوئچ آف“ کی ریکارڈنگ سنائی دی۔ میں نے تین چار مرتبہ ٹرائی کیا لیکن ہر بار اسی ریکارڈنگ سے واسطہ پڑا۔ میں نے جھنجلا کر یہ کوشش ترک کردی اور ماجد سے کہا۔

”اس سور کی اولاد نے فون آف کردیا ہے۔“

”سم کارڈ تبدیل کردیا ہوگا۔“ ماجد کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”کیونکہ وہ بتا چکا ہے‘ اس کا جو نمبر ہمارے پاس ہے وہ اب بے کار ہوچکا ہے‘ اس نمبر پر ہم اس سے رابطہ نہیں کرسکیں گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے......“

ذرا توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”اس کے پاس ڈبل سم والا سیل فون ہو اور اس نے ایک سم کو آف کردیا ہو۔“

''وہ سم کارڈ تبدیل کردے اپنے باپ کو' مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' میں نے سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس وقت وہ میرے سامنے ہوتا تو میں اس کی بوٹیاں نوچ لیتا۔''

''اپنے دماغ کو قابو میں رکھو اسد۔'' ماجد نے ایک بار پھر گاڑی کو سڑک کے کنارے روک دیا۔ ''جوش میں اکثر انسان اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے اور یہ ایسا وقت نہیں ہے کہ دماغ کو گرم کر کے خود کو نقصان پہنچایا جائے۔''

''اب اس سے زیادہ اور کیا نقصان پہنچے گا۔'' میری برہمی میں کمی نہیں آرہی تھی۔ ''وہ الو کا پٹھا ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر چلا گیا۔''

''ہم نے ایک جوا کھیلا تھا۔'' ماجد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''داؤ اس کے حق میں کھل گیا خیر......'' اس نے ایک معنی خیز سانس خارج کی اور کہا۔ ''دشمن زندہ' مخاصمت باقی۔''

''فرحانہ ہم تک نہیں پہنچ پائی اور شاہ جی بھی گیا۔'' میں نے افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ''تم نے گاڑی کیوں روک دی؟''

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی اپنائیت سے بولا۔ ''تمہارا دماغ ٹھنڈا کرنے کے لیے......''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا......

''تم ادھر ہی بیٹھو'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں سامنے والے اسٹور سے کچھ ٹھنڈا پینے کے لیے لاتا ہوں۔ اس کے بعد ہم اپنے فلیٹ پر چلیں گے۔''

''فلیٹ پر چلیں گے......؟'' میری حیرت دوچند ہوگئی۔ ''کیا تم شاہ جی کی بازیابی کے لیے کچھ نہیں کرو گے؟''

''اس کی بازیابی یا بازیافت کے لیے مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں بلی والا وہ واقعہ نہیں سنایا تھا۔ تم شاہ جی کی فکر نہ کرو' وہ کسی نہ کسی طرح خود کو بچا کر واپس لے ہی آئے گا۔ ہم نے ایک سیکنڈ پلان بھی بنا رکھا ہے......فرسٹ پلان کے فیل ہوجانے پر وہ سیکنڈ پلان پر عمل کرے گا۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں اس آہنی اعصاب کے مالک شخص کو جاتے ہوئے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

❀......❀......❀

آدھے گھنٹے کے بعد ہم دونوں طارق روڈ والے فلیٹ کے اندر موجود تھے۔ راستے میں ماجد نے مجھے اپنے سیکنڈ پلان کی تفصیلات سے آگاہ کردیا تھا۔ پروگرام کے مطابق' شاہ جی کو اپنی ایکٹنگ کے زور پر شہزاد کے چنگل سے نکل کر آنا تھا۔ ماجد نے اس کے پاس چند ایسے لوازمات چھوڑ دیے تھے کہ جن سے شاہ جی بہ آسانی ثابت کرسکتا تھا کہ وہ ایک اداکار ہے اور اپنے فلمی یونٹ کے ساتھ وہ ایک سین کرنے وہاں پہنچا تھا۔ اس کے ڈائریکٹر (ماجد) نے اس کے ساتھ دھوکا کیا اور وہ ایک مصیبت میں پھنس گیا۔

میں نے کہا۔ ''ماجد! یہ شہزاد اور اس کا باپ ندیم شیروانی بالکل الٹی کھوپڑی کے ہیں جب انہیں جنید خان کی لاش اور گاڑی مل گئی تھی تو پھر اس ڈرامے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ سیدھا سیدھا ایک فون کر کے مجھ سے کہہ سکتا تھا کہ میں نے اسے دھوکا دینے کی کوشش کی ہے لہٰذا فرحانہ کی واپسی کا خیال دل سے نکال دوں......''

''ممکن ہے' جنید خان کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں انہیں چند منٹ پہلے پتا چلا ہو۔'' ماجد نے خیال آرائی کی ''ہوسکتا ہے' اس وقت تک پروگرام کینسل کرنا ممکن نہ رہا ہو۔''

''میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کہ شہزاد کو جنید خان کی گاڑی اور لاش کا عین وقت پر پتا چلا تھا اگر ایسا ہوتا تو اس نے پھر پارک کے کونے پر ایک خطرناک بم کیوں نصب کرایا تھا اور......وہ سیاہ جیپ پر سوار مسلح غنڈے جنہوں نے فائرنگ کر کے پہلے خوف وہراس پھیلایا اور پھر بم کا دھماکا ہوتے ہی وہ فرحانہ اور شاہ جی کو جیپ میں ڈال کر لے گئے......؟''

''میری سمجھ میں تو یہی بات آرہی ہے کہ شہزاد کو اصلی جنید خان کے بارے میں پہلے پتا چلا تھا یا بعد میں' یہ اتنا اہم نہیں ہے بنیادی بات یہ ہے کہ اس کی نیت میں ابتدا ہی سے کھوٹ تھا جبھی اس نے فرحانہ اور جنید خان کو ایک ساتھ اٹھوانے کے لیے سیاہ جیپ کا بندوبست کیا تھا۔ اور جہاں تک پارک کے کونے میں بم نصب کرانے کا سوال ہے تو......'' وہ چند لمحات کے لیے رکا' ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اس بارے میں وہ فون پر تمہیں واضح الفاظ میں بتا چکا ہے کہ وہ تمہاری جان کا دشمن ہے اور جلد از جلد تمہاری بدترین موت کا خواہاں ہے۔''

''اور اس نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے فرحانہ اور جنید خان کے تبادلے کا جو ڈراما کیا ہے اس سے وہ جو ثابت کرنا چاہتا ہے' اس کا بھی مجھے بہ خوبی اندازہ ہے۔''

''مثلاً کیا......؟'' ماجد نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''وہ مجھے نفسیاتی اور اعصابی طور پر توڑ ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی اس حرکت سے مجھے باور کرا گیا ہے کہ اگر وہ فرحانہ کو میری آنکھوں کے سامنے آزاد بھی

چھوڑ دے تو میں اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہوں اور نہ ہی فرحانہ کو حاصل کر سکتا ہوں لیکن تم بھی نوٹ کرلو ماجد ......'' اچانک میرا لہجہ زہریلا ہوگیا اور میں نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔

''میں شہزاد کا جو حشر کروں گا...... اسے دیکھ کر اس کی پچھلی اور آنے والی نسلیں کانوں کو ہاتھ لگائیں گی۔''

''ریلیکس مائی ڈیئر...... ریلیکس!'' ماجد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم غیر محسوس انداز میں شہزاد کی سازش کا شکار ہو رہے ہو۔''

''کیا مطلب......؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے خود ہی کہا ہے کہ شہزاد اپنی حرکتوں سے تمہیں اعصابی اور نفسیاتی طور پر توڑ پھوڑ کر رکھ دینا چاہتا ہے۔'' وہ بدستور پرسکون لہجے میں بولا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بڑی تیزی سے شہزاد کی خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اپنی سوچ پر قابو رکھو اسد! آگے بڑی کٹھن زندگی ہے۔ اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھو گے تو حالات سے نمٹ پاؤ گے۔''

ماجد کی باتوں میں وزن تھا۔ وہ میرا سچا خیر خواہ تھا اور میری بھلائی چاہتا تھا اسی لیے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''سوری ماجد! میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوگیا تھا۔'' میں نے حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''تم فکر نہیں کرو۔ یہ وقتی اشتعال ہے۔ میں بہت جلد خود کو کنٹرول کرلوں گا۔''

''انسان کو جذباتی بھی ہونا چاہیے اور مشتعل بھی۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''لیکن حدود میں رہتے ہوئے تاکہ اس سے اپنا نقصان نہ ہو۔ خیر......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے دوستانہ انداز میں مجھے دیکھا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''شہزاد نے جو کرنا تھا وہ کر چکا۔ اب ہماری باری ہے اور اس بار ہمیں بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا' ایک نئی حکمت عملی کے ساتھ۔ تمہارے ذہن میں کوئی آئیڈیا ہے؟''

اپنی بات کے اختتام پر اس نے اچانک ہی مجھ سے سوال کر ڈالا تھا' میں نے کہا۔

''فی الحال تو کوئی آئیڈیا نہیں ہے میرے پاس' البتہ اگر تم کسی طرح کہیں سے مجھے شہزاد کا پتا ٹھکانا معلوم کر دو تو میں کوئی گولڈن آئیڈیا دے سکتا ہوں۔''

''دل چھوٹا نہ کرو یار...... اس چالباز کا پتا ٹھکانا بھی نکل آئے گا۔'' ماجد نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''تم اپنے شاہ جی کو بہت ہلکا لے رہے ہو۔ وہ جب تک شہزاد کے پاس ہے' اس کی زندگی خراب کر کے رکھے گا اور جب واپس آئے گا تو اپنے ساتھ معلومات کا خزانہ بھی لے کر آئے گا پھر تمہارے بہت سے سوالات کے جوابات خود بخود سامنے آجائیں گے۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''لیکن میں شاہ جی کی واپسی تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھ سکتا۔''

''ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھنے کو کون کہہ رہا ہے یار۔'' وہ خوش مزاجی سے بولا۔ ''ابھی ہم ایک دو گھنٹے آرام کریں گے۔ شام سے پہلے سخی حسن کے قبرستان جائیں گے تاکہ فرحانہ کے باپ کی تدفین میں شرکت کرسکیں اس کے بعد سوچیں گے' آگے کیا کرنا ہے۔''

''میں نہیں جا رہا قبرستان......'' میں نے بددلی سے کہا۔

''کیوں...... کیا ہوگیا؟'' ماجد نے پوچھا۔ ''یہ تمہاری خواہش تھی کہ تم فرحانہ کے باپ کی تدفین کے موقع پر قبرستان میں موجود رہو گے۔''

''لیکن میری یہ خواہش فرحانہ کی بہ خیریت واپسی کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔'' میں نے ایک افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سوچا تھا آج سہ پہر سے پہلے فرحانہ کو صحیح سلامت اس کی ماں کے پاس پہنچاؤں گا۔ اس کے بعد قبرستان کا رخ کروں گا۔ میں انکل عبدالخالق کی روح کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا...... میں ان کی روح کو بتانا چاہتا تھا کہ میں جس مہم کے لیے گھر سے نکلا تھا اسے سر کر کے واپس آیا ہوں۔ اب اگر میں انکل خالق کی تدفین کے لیے قبرستان جاؤں گا تو......''

''خیر چھوڑو......'' اس نے مجھے بات مکمل نہیں کرنے دی اور میری دلی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے بے پروائی سے بولا۔ ''اگر تم قبرستان نہیں جانا چاہتے تو مت جاؤ۔ میرا مشورہ ہے کہ تھوڑی نیند لے لو......''

''مجھے نیند نہیں آرہی۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''لیکن مجھے آرہی ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''میں تو دو تین گھنٹے سونا چاہتا ہوں۔ تمہارے لیے میں چائے بنا دیتا ہوں تاکہ تم ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر اپنے دماغ کو فریش کرتے رہو۔''

''ہاں...... یہ آئیڈیا بہترین ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''تم ضرور نیند لے لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''کھانا چلے گا۔'' ماجد نے پوچھا۔ ''اگر تم کہو تو میں نیچے سے تمہارے کھانے کے لیے کچھ لا دیتا ہوں۔ تم نے دیکھا ہی ہے یہاں ہر چیز مل جاتی ہے۔''

کھانے کے بارے میں ماجد نے واپسی پر بھی مجھ سے پوچھا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ کچھ بھی کھانے کو من نہیں کر رہا تھا اس لیے میں نے صاف منع کر دیا تھا۔

''کھانا رات میں کھائیں گے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فی الحال چائے سے گزارا ہو جائے گا۔''

''او کے......'' ماجد یہ کہتے ہوئے کچن کی جانب بڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک مگ میں میرے لیے چائے لے کر آگیا۔ میں ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا اور ماجد بیڈ روم میں سونے کے لیے چلا گیا۔ میں چائے کی چسکیاں لینے کے ساتھ ساتھ ٹی وی کے مختلف چینلز تبدیل کر کے کوئی ڈھنگ کا پروگرام تلاش کرنے لگا۔

میری مرضی کا کوئی پروگرام تو نہیں مل سکا تاہم چائے ختم ہونے تک مجھے بھی نیند آنے لگی۔ میں نے جھانک کر بیڈ روم میں دیکھا تو ماجد بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے ٹی وی کو آف کیا اور صوفے پر دراز ہوگیا۔ پھر مجھے پتا نہیں چلا کب نیند کے مہربان بازوؤں نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو باہر اندھیرا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا تو شام یعنی رات کے سات بج رہے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی لمحے ماجد کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''اٹھ گئے تم......''

میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا وہ چائے کے مگ کے ساتھ کچن سے باہر آرہا تھا اور اس نے ایک سگریٹ بھی سلگا رکھی تھی۔ میں نے خفت آمیز انداز میں کہا۔

''پتا نہیں' میری آنکھ کیسے لگ گئی حالانکہ مجھے تو بالکل نیند نہیں آرہی تھی۔''

''میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔'' وہ میرے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہاری چائے میں نیند کی دوا ملا دی تھی۔ یہ ایک بے ضرر خواب آور دوا ہے۔ میں چاہتا تھا' تم تھوڑی نیند لے لو'

تا کہ تمہارے اعصاب کو سکون ملے۔ اگر تمہیں میری یہ حرکت بری لگی ہو تو آئی ایم ویری سوری۔"

"سوری کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کے خلوص اور محبت کے پیش نظر کہا۔ "تم نے جو بھی کیا' میری بھلائی کے لیے کیا۔"

"چلو اب جلدی سے فریش ہو جاؤ۔" میں زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم تیار ہو جاؤ تو باہر نکلیں گے۔"

میں پندرہ بیس منٹ میں ایک دم فریش ہو کر ماجد کے سامنے بیٹھ گیا۔ صوفے پر لیٹنے سے پہلے میں نے اپنا سیل فون چھوٹی میز پر رکھ دیا تھا۔ اب اٹھا کر دیکھا تو میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اس کی اسکرین پر دو درجن سے زیادہ مس کالز شو ہو رہی تھیں اور یہ سب کی سب میرے گھر کے نمبر سے آئی تھیں۔ سیل فون چونکہ سائیلنٹ موڈ پر تھا اس لیے مجھے ان کالز کا بالکل پتا نہیں چل سکا تھا ورنہ اگر اتنی بار گھنٹی بجتی تو میں نیند سے ضرور بیدار ہو جاتا۔

گھر سے فون آنے کا مطلب تھا کہ وہ کالز یا تو امی نے کی تھیں اور یا پھر شازیہ نے اور لگاتار اتنی بار کالز کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اس طرف خیریت نہیں تھی۔

میں نے کالز کا ٹائم چیک کیا تو ان میں ایک ایک' دو دو' چار چار سیکنڈ کا فرق تھا۔ گویا ایک ہی وقت میں متعدد بار مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ ادھر کوئی گڑبڑ ہے۔ اسی لمحے میرے ذہن میں شہزاد کے منحوس الفاظ اپنی بازگشت پیدا کرنے لگے۔

"بہت جلد میں تمہیں ایک ایسا تحفہ دوں گا کہ تم اپنے ناخنوں سے اپنی ہی شہ رگ ادھیڑ ڈالو گے..... مرنے کی خواہش کرو گے مگر مر نہیں سکو گے اور جینا..... جینا تو میں تمہارا ایسا عذاب ناک بنا دوں گا کہ....."

بے ساختہ میں نے اپنے گھر فون گھما دیا۔ دوسری جانب مکمل خاموشی تھی۔ میری سماعت قبرستان ایسے سکوت سے آشنا ہوئی تو میں بار بار لائن کاٹ کر فون ملاتا چلا گیا۔ ایک بھی بار لائن نہ مل سکی۔ اگر گھنٹی بجتی اور کال اٹینڈ نہ ہوتی تو میں سمجھتا کہ شازیہ اور امی فرحانہ کے گھر میں ہوں گی مگر یہ تو ایسا لگ رہا تھا کہ فون ڈیڈ پڑا ہے۔

فون اگر ڈیڈ تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ کسی نے اسے ڈیڈ کیا تھا..... کس نے.....؟ اور کیوں.....؟

اس سے پہلے کہ مجھے ان سوالات کے جوابات ملتے' سیل فون نے مخصوص تھرتھراہٹ کے ساتھ کسی کی کال کی آمد کا اعلان کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسکرین پر ایک اجنبی نمبر بھی ظاہر ہوا' میں نے فوراً کال اٹینڈ کر لی۔

"ہیلو.....!"

"آپ اسد بات کر رہے ہو؟" دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

"ہاں' میں اسد ہی ہوں۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ "مگر آپ کون ہیں اور میرا نمبر آپ کو کس نے دیا ہے؟"

"میں ڈاکٹر ریاض بات کر رہا ہوں۔" اس شخص نے بتایا۔ "یہ نمبر مجھے آپ کی بہن شازیہ نے اپنی آخری سانسوں میں....."

"کیا بکواس کر رہے ہو ڈاکٹر....." میں ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔

"شازیہ سے میری بات کراؤ....."

"سوری مسٹر اسد....." ڈاکٹر ریاض کی غم زدہ آواز نے میری سماعت کو چھید ڈالا۔ "شی از نو مور....."

مجھے یوں محسوس ہوا' کسی نے ماؤنٹ ایورسٹ کو میرے سر پر دے مارا ہو.....!

نقد جاں

محترم ایڈیٹر نئے افق'

السلام علیکم!

آپ کا سچی کہانیوں کا یہ سلسلہ بہت اچھا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ نئے لکھنے والوں کو بھرپور موقع دیتے ہیں۔ نقد جاں ایک بالکل سچی کہانی ہے۔ یہ کہانی ایک ایسی عورت کی ہے جس نے اپنی حکمت عملی سے اپنے شوہر کو جیتا۔ مجھے امید ہے کہ یہ تحریر ہزاروں خواتین کے لیے جو اپنے شوہروں کی نا پسندیدہ عادات سے نالاں رہتی ہیں' رہنما ثابت ہوگی۔

والسلام

خدیجہ احمد

پرویز گہری نیند میں غرق رنگین سپنوں کی وادیوں میں گھوم رہا تھا۔ اس نے دفعتاً نیند کے عالم میں محسوس کیا کہ اس کی بیوی رشیدہ اسے نیند سے بے دار کرنے کے لیے شانہ ہلا ہلا کر اس بری طرح جھنجوڑ رہی ہے جیسے اس کا شانہ بدن سے الگ کر دینا چاہتی ہو۔ اس کے رنگین سپنوں کی وادی کا سارا طلسم بکھر کر رہ گیا تھا اور نیند ٹوٹنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی آنکھیں کھولتا رشیدہ نے اس کا شانہ چھوڑ دیا اور پھر اس کے کانوں میں رشیدہ کی تیز و تند آواز گرم گرم سیسے کی طرح پگھلنے لگی۔ ایک ایک لفظ میں جیسے زہر بھرا ہوا تھا۔ "اکاؤنٹنٹ صاحب! سرتاج من' حضور والا۔ اس وقت نو بج کر چالیس منٹ ہو رہے ہیں آج کوئی چھٹی کا دن نہیں ہے جو جناب گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ نہ صرف دونوں بچے اسکول جا چکے ہیں بلکہ دنیا کے سارے مرد بھی اپنے اپنے کاموں پر جا چکے ہیں۔ کیا آپ دفتر کی چھٹی کے وقت دفتر میں قدم رنجہ فرمائیں گے؟" رشیدہ نے ایک ہی سانس میں رٹتے ہوئے سبق کی طرح اسے فرفر سنا دیا تھا۔

رشیدہ نے آج کوئی پہلی بار اسے اس طرح سے نہیں جگایا تھا اور نہ ہی یہ فقرے اور یہ جملے اس کے لیے نئے تھے۔ یہ تو روز کا معمول بن چکا تھا۔ وہ کوئی دو تین برس سے ان باتوں کو سنتا چلا آ رہا تھا۔ اب وہ ان باتوں کو دل پر نہیں لیتا تھا اور نہ ہی کوئی پروا کرتا تھا اس کان سے سنتا تھا دوسرے کان سے نکال دیتا تھا۔ شروع شروع میں وہ رشیدہ کی باتوں کو بالکل برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ ان دونوں میں تو تو میں میں ہوتی تھی۔ خوب جھگڑا ہوتا۔ بدمزگی ہو جاتی تھی۔ ہفتوں آپس میں بات چیت بند رہتی۔ گھر کا سارا نظام الٹ پلٹ ہو کر رہ جاتا تھا بڑی مشکل سے ان دونوں میں صلاح صفائی ہو پاتی تھی۔

بات یہ تھی کہ وہ اپنے دفتر نو بجے کے بجائے گیارہ بجے جاتا تھا رشیدہ کو اس کے دفتر دیر سے جانے پر بڑا غصہ آتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر ٹھیک وقت پر اپنے دفتر پہنچے اور اپنے شوہر کی غیر ذمہ داری اور تاخیر سے گھر سے دفتر جانے کے لیے نکلتے وقت چڑ جاتی تھی۔ شوہر اور بھی معاملات میں بے پروا اور غیر ذمہ دار تھا لیکن اس نے وہ تمام امور خود سنبھال لیے تھے۔

اب نہ تو وہ شوہر سے سودا سلف منگواتی یا گھر کا کوئی کام اس سے کرنے کے لیے کہتی تھی۔ وہ خود ہی یہ سارے

کام کر لیتی تھی۔ اب شوہر کی محتاج نہیں رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر بھی دوسرے مردوں کی طرح صاف ستھرے کپڑے پہن کر دفتر جائے۔ لوگ اس کی عمدہ جامہ زیبی سے متاثر ہوں اور وہ تمبا کو والا پان کھانا چھوڑ دے یا سارے دن میں صبح و شام اس وقت کھائے جب گھر پر موجود ہو۔ وہ باوجود کوشش کہ یہ عادت اس سے چھڑا نہ سکی تھی۔

اس کا شوہر آنکھ کھلتے ہی جو پان کھانا شروع کرتا تھا رات نیند آنے تک پان کھاتا رہتا تھا۔ وہ اس کے پان کھانے کی لت سے بری طرح عاجز آ چکی تھی۔ اس نے لاکھ جتن کر لیے۔ وہ شوہر کو اس لت سے نجات نہ دلا سکی بلکہ شوہر خود اس لت سے نجات پانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ شوہر کے دفتر تاخیر سے جانے پر اس لیے خوف زدہ تھی کہ کہیں اس کے شوہر کو دفتر سے نکال دیا نہ جائے اس کا شوہر شادی سے پہلے سے اس دفتر میں ملازمت کر رہا تھا۔ دس برسوں میں وہ کلرک سے ترقی کرتے کرتے اکاؤنٹنٹ بنا تھا۔ اس کے شوہر کو مشاہرہ بھی بہت اچھا ملتا تھا۔ نوکری چھوٹ جانے کی صورت میں دوبارہ ایسی نوکری اور ایسا مشاہرہ ملنا بہت ہی مشکل تھا۔

پرویز نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ اپنی غیر ذمہ داری پر قابو پا لے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ وہ اس کمپنی میں تب سے ملازمت کر رہا تھا جب سے اس کمپنی نے کام شروع کیا تھا۔ وہ کمپنی کے لیے ایک بہترین اکاؤنٹنٹ ثابت ہوا تھا۔ کمپنی کے مالکان، اعلیٰ عہدیداران اور دوسرے تمام ملازمین اس کی صلاحیت اور قابلیت کا لوہا مانتے تھے ہر کمپنی کے دو کھاتے ہوتے ہیں۔ وہ ان دونوں کھاتوں کا ماہر تھا کمپنی کے کھاتوں اور بلیک منی کی آمدنی تمام رازوں سے واقف بھی تھا۔ اس لیے کمپنی اس کے ہر قسم کے نخرے برداشت کرتی تھی۔ وہ اس کمپنی میں واحد شخص تھا جس سے کوئی بھی باز پرس کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے وہ دفتر روز دیر سے جاتا تھا۔

پرویز نے نیند سے بوجھل پلکیں اوپر اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھولیں تو اس نے رشیدہ کو خود پر جھکا ہوا پایا۔ رشیدہ کے چہرے پر تیزی تندی اور ناگواری چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں سے غصہ جھانک رہا تھا اس کا حلیہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ وہ بیوی نہیں کسی نوکرانی کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ روز ہی ایسے حلیے میں رہتی تھی۔

کل کی طرح آج بھی اس کی نظروں میں وہ لڑکیاں اور عورتیں گھوم گئیں جو صاف ستھرے کپڑے پہن کر دفتر آتی تھیں تقریباً تمام لڑکیاں اور عورتیں عمدہ جامہ زیب تھیں۔ عمدہ جامہ زیبی کی وجہ سے دل کش اور نظروں کو بہت بھلی لگتی تھیں۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی بیوی بھی نہ صرف اس طرح بن سنور کے رہے بلکہ اس کا گھر بھی صاف ستھرا ہو۔ شام کو وہ دفتر سے گھر آئے تو اس کی بیوی دفتر کی لڑکیوں اور عورتوں کے انداز میں سنگھار کیے اچھے کپڑے پہنے اور دل کش مسکراہٹ کے ساتھ اس کی منتظر ہو۔ گھر بھی گھر لگے اس پر کسی کباڑ خانے کا دھوکا نہ ہو۔ رشیدہ میں سلیقہ اور سگھڑ پن نام کو نہیں تھا۔ کوئی چیز اپنی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ ہر چیز الٹ پلٹ ہوتی تھی۔ نوکرانی کے کام کرنے کے باوجود گھر صاف ستھرا نہیں ہوتا تھا۔ وہ گھر کی بدتر حالت دیکھ کر اس پر غصہ ہوتا تو وہ سارا الزام بچوں پر تھوپ دیا کرتی تھی۔

ان دونوں میں محبت کی شادی ہوئی تھی۔ رشیدہ

اس کی والدہ کے گھر کے سامنے رہتی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب وہ اپنی والدہ کے ساتھ ناظم آباد میں رہتا تھا۔ دو برس تک ان دونوں میں زبردست معاشقہ چلتا رہا۔ رشیدہ کالج میں پڑھتی تھی اور وہ ان دنوں تعلیم سے فراغت پا کر ملازمت کر رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی کمزوری بن گئے تھے۔ ان کے لیے جدائی کا تصور سوہان روح تھا۔ اس کی امی نے رشیدہ کو اپنی بہو بنانے سے صاف انکار کر دیا اور خاندان کی ایک لڑکی کو پسند کر لیا تھا۔ جب اس نے یہ دھمکی دی کہ وہ رشیدہ سے شادی نہ ہونے کی صورت میں گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کہیں چلا جائے گا تب اس کی امی رشیدہ کو اپنی بہو بنانے پر راضی ہوئی تھیں۔ شادی کے بعد ساس اور بہو میں بالکل نہیں بنی۔ اس کی ماں کی نظر میں رشیدہ کاہل، پھوہڑ اور بدسلیقہ تھی۔ خوب صورت تھی خوب سیرت نہیں تھی۔ اس نے بہو اور ساس کے درمیان چپقلش سے تنگ آ کر گلشن اقبال میں ایک فلیٹ لے لیا۔ ان کی شادی کے آٹھ برسوں میں اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی ماں اپنی بہو کے بارے جو کچھ کہتی تھیں وہ غلط نہیں تھا۔ ان آٹھ برسوں میں محبت کا نشہ پوری طرح اتر چکا تھا۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر میز پر آیا تو دیکھا کہ میز پر صبح کا اخبار رکھا ہے۔ ناشتا موجود نہیں ہے۔ اس نے کچن کی طرف دیکھا تو رشیدہ حسب معمول آملیٹ بنانے میں مصروف نظر آئی۔ وہ اس کے لیے ناشتے میں روز دو انڈوں کا آملیٹ، ڈبل روٹی کے چار سلائس مکھن اور چائے دے دیتی تھی۔ وہ ترس جاتا تھا ناشتے میں کچھ اور بنے۔ رشیدہ نے جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ چھٹی والے دن کے سوا کسی اور دن پراٹھے نہیں بنیں گے۔ وہ بھی کسی کسی دن ورنہ حلوہ پوری بازار سے لے آتی تھی۔

وہ ان آٹھ برسوں میں اچھی طرح جان چکا تھا کہ رشیدہ کو گھریلو کاموں سے نفرت ہے۔ خصوصاً ان کاموں سے جو کچن سے تعلق رکھتے ہیں۔ کھانا زیادہ تر ہوٹلوں سے آتا تھا۔ اس کے بار بار ٹوکنے اور لڑنے جھگڑنے پر اسے کھانا پکانے کے کاموں کا عادی ہونا پڑا تھا۔ گو وہ مشینی انداز میں کام کرتی تھی اور کھانا پکاتی تھی لیکن وہ اچھا کھانا بالکل نہیں ہوتا تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ کھانا پکانے لگی تھی۔ جیسے بھی پکاتی تھی پکاتی تو تھی۔

پرویز نے اخبار پڑھتے پڑھتے غیر ارادی طور پر رشیدہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا جیسے وہ اسے آج پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ وہ چھبیس برس کی ہو چکی تھی۔

شادی سے پہلے جب ان دونوں میں محبت کا آغاز ہوا تھا اور جب وہ اس کی زندگی میں بہار بن کر آئی تھی۔ تب رشیدہ میں جو حسن، کشش اور دل کشی تھی آج وہ بات نظر نہیں آتی تھی۔ ان دنوں وہ بہت حسین ہوا کرتی تھی۔ اس کی آواز میں اسے جل ترنگ کی کھنک محسوس ہوتی تھی۔ بات کرتی تو پھول جھڑتے محسوس ہوتے تھے۔ ہنستی تھی تو اسے ایسا لگتا تھا کہ سات سر ایک ساتھ بج رہے ہیں لیکن آج یہی آواز ہتھوڑی کی ضربیں بن کر اس کے ذہن پر برستی۔ بات کرتی تو ایک ایک لفظ زہریلا ڈنگ بن کر اس کے دل میں چبھ جاتا تھا۔ ہنستی تھی تو اسے ہنسی بڑی زہر لگتی تھی۔ اب یہ حال تھا کہ اس کی طرف دیکھنے کی خواہش بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ زندگی گزارنے پر اس لیے مجبور تھا کہ اس نے اپنی پسند کی اور محبت کی شادی کی تھی۔ اسے ہر قیمت پر نبھانا تھا۔ اس کے علاوہ بچوں کی خاطر اس نے حالات سے

سمجھوتا کرلیا تھا۔

رشیدہ نے میز پر ناشتا لاکر رکھا تو اس نے اخبار اپنے سامنے سے ہٹایا۔ اس سے پہلے کہ وہ ناشتے پر کوئی تبصرہ کرتا رشیدہ بولی۔ ”آپ نے شیو بھی نہیں کیا؟ اب تو آپ شیو کیے بغیر بھی جانے لگے ہیں۔“

پرویز نے اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”شیو زیادہ بڑھا ہوا بھی نہیں ہے۔ دو دن پہلے ہی شیو کیا تھا۔ اب کل شیو کر کے جاؤں گا۔ روز روز شیو کرنا میرے لیے عذاب ہوتا ہے۔“

”شیو کتنا بڑھ گیا ہے۔ ذرا آئینے میں اپنی شکل تو دیکھیں۔“ رشیدہ نے کمرے سے آئینہ لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ”آپ اکاؤنٹنٹ نہیں ترقی پسند شاعر لگ رہے ہیں۔“

”تم تو جانتی ہو کہ میں شاعر بھی ہوں۔ کبھی کبھی شاعری کے موڈ میں آکر شعر بھی کہنے لگتا ہوں۔ دفتر میں بھی لوگ جانتے ہیں میری غزلیں اور نظمیں سن کر میرے دفتر والے میرے شعروں کی خوب داد دیتے ہیں۔ اکثر شعر سنانے کی فرمائش کرتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر میں اکاؤنٹنٹ نہ ہوتا تو ایک اچھا اور عظیم شاعر ضرور ہوتا تمہیں میری بات کا یقین نہ ہو تو زمان خان سے پوچھ لینا۔“

”شاید ہی کوئی شاعر شیو بڑھا کر گھر سے نکلتا ہوگا۔ آپ روز شیو بنا کر دفتر جایا کریں۔“

”مجھے دفتر جا کر کام کرنا ہوتا ہے۔ عشق نہیں لڑانا ہوتا۔ میرے دفتر شیو کر کے جانے یا نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ آج تک دفتر میں کسی نے میرے بغیر شیو کیے آنے پر اعتراض نہیں کیا تمہیں کیا اعتراض ہے بھلا......؟“

”شیو کر کے جانے سے انسان، انسان معلوم ہوتا ہے۔ بغیر شیو۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی مجنوں، رانجھا یا فرہاد دفتر نہیں بلکہ اپنی لیلیٰ، ہیر اور شیریں کی تلاش میں جارہا ہو۔“

”تم بے فکر رہو کہ دفتر میں جو حسین اور جوان لڑکیاں اور عورتیں ملازمت کرنے آتی ہیں۔ ان میں کوئی لیلیٰ، ہیر اور شیریں نہیں ہے۔ ایک بار محبت کر کے اس کا ایسا مزا چکھا ہے کہ دوسری محبت کا خطرہ مول لینا حماقت ہوگا۔ خدا مردوں کو عورتوں کی محبت سے بچائے۔ محبت کر کے آج تک پچھتا رہا ہوں۔“

”تو آپ سے کس نے کہا تھا کہ مجھ سے محبت کریں۔“ رشیدہ تڑخ کر بولی۔

”محبت میں نے کہاں کی تھی۔“ وہ کہنے لگا۔ ”یہ چکر تو تمہارا ہی چلایا ہوا تھا۔ تم نے ہی تو پہلا محبت نامہ لکھا تھا۔ ڈورے ڈالے تھے جب میں گھر میں ہوتا تھا تو حیلے بہانوں سے گھر آجاتی تھیں۔ تمہارے چھ سات محبت ناموں نے مجھے تم پر ترس کھانے پر مجبور کیا تھا۔ ورنہ میں تو ان خرافات کا قائل نہیں تھا۔“

”آپ نے مجھ پر ترس کھایا تھا محبت نہیں کی تھی۔“ وہ تنک کر کہنے لگی۔ ”میری محبت خرافات تھی۔ وہ کون تھا جو کھڑکی میں کھڑا میرے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ وہ کون تھا جس نے مجھے حاصل کرنے کے لیے ایک بے رحم ماں سے ٹکر لی تھی۔ وہ کون تھا جو پارک اور ہوٹلوں میں میرا انتظار کرتا رہتا تھا؟ گھر سے ہمیشہ ہمیشہ چلے جانے کی دھمکی ماں کو کس نے دی تھی؟“

”یہ سب کچھ میں نے تمہارے بہکاوے میں آکر کیا تھا۔ ورنہ میرا امزاج عاشقانہ نہیں تھا۔“

”کیا میں مردوں کو نہیں پہچانتی ہوں۔ وہ تو پیدا ہونے سے لے کر قبر میں پیر لٹکانے تک عورت سے

محبت کرنے کے چکر میں پڑے ہوتے ہیں۔ یہ عورت ہوتی ہے جو شادی کے بعد کسی دوسرے مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی ہے۔ مرد ہے کہ ہر عمر میں عشق کرنے کی سوچتا رہتا ہے چاہے وہ شادی شدہ اور بوڑھا ہی کیوں نہ ہو گیا ہو۔“

”تم مردوں پر الزام مت تھوپو۔ دنیا میں عورتیں مشہور ہیں کہ وہ بے وفا ہوتی ہیں۔ ہرجائی ہوتی ہیں۔ وہ وفا کرنا جانتی ہی نہیں۔ اب مجھے ناشتا کرنے دو۔ ناشتا بھی ٹھنڈا ہو رہا ہے اور دفتر کے لیے دیر ہو رہی ہے۔ جلدی سے چائے بنالاؤ۔“

رشیدہ پیر پٹختی کچن میں چلی گئی۔ جتنی دیر میں وہ چائے بنا کر لائی اتنی دیر میں اس نے ناشتا کرلیا۔ اس نے چائے پی تو وہ ٹھنڈی اور اچھی بھی نہیں تھی۔ اس نے دو ایک گھونٹ لے کر چائے چھوڑ دی اور گھر سے نکل گیا۔ رشیدہ کو اچھی چائے بنانا آتی نہیں تھی۔ اچھی چائے تو دفتر میں بنتی تھی۔ یہ چائے زماں خان بناتا تھا جو دفتر کا چپراسی تھا۔

پرویز دفتر پہنچا تو سوا گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے دفتر کے ہال سے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے ان لڑکیوں اور عورتوں کی طرف دیکھا جو اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ ان کو عمدہ جامہ زیبی اور سج دھج نے بڑا خوب صورت اور دل کش بنا دیا تھا۔ ان کی وجہ سے دفتر کا ماحول بھی خواب ناک لگ رہا تھا۔ فضا بڑی حسین لگ رہی تھی۔ اپنے کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھ کر وہ سوچنے لگا کہ آخر اس کے پاس کس چیز کی کمی ہے جو اس کی بیوی نوکرانیوں سے بھی بدتر حلیہ بنائے پھرتی ہے اور گھر کا خیال نہیں رکھتی، بچے صرف اسکول صاف ستھرے جاتے تھے۔ گھر میں رہتے تھے تو وہ لاوارث اور یتیم یسیر بچوں کی طرح نظر آتے تھے۔ وہ آج ماں کی بات نہ مان کر پچھتا رہا تھا۔ جب کبھی وہ کسی دوست کے گھر جاتا تو اس کے بیوی بچوں اور گھر کے صاف ستھرے ماحول کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک برچھی سی اتر جاتی تھی۔ وہ دل گرفتہ سا ہو جاتا تھا۔ وہ ان خیالوں میں غرق تھا کہ زمان خان اس کے لیے چائے لے کر آیا تو وہ چونک کر خیالوں سے نکل آیا۔ اس نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”میرے لیے پان لیتے آنا۔“

ایک روز حسب معمول ساڑھے گیارہ بجے دفتر پہنچا آج وہ بغیر ناشتا کیے چلا آیا تھا۔ ناشتے میں آملیٹ اور ڈبل روٹی کے سلائس دیکھ کر پرویز پھر بھڑک اٹھا تھا۔ خوب گرم ہوا تھا۔ اسے اتنی باتیں سنائی تھیں کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ رشیدہ جب کبھی رونے لگتی تو اس کا دل پسیج جاتا تھا۔ وہ اسے منانے کی کوشش کرتا تھا مگر آج اس نے منانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دفتر چلا آیا اس نے دل میں سوچ لیا تھا کہ آج رات بارہ بجے سے پہلے گھر نہیں جائے گا۔ تاکہ رشیدہ اور پریشان ہو۔ پھر اسے خیال آیا تھا کہ رشیدہ کو اس کی پروا کب ہوتی ہے۔ وہ جب کبھی دیر سے گھر پہنچتا تو رشیدہ اسے سوتی ملی تھی۔ اسے اپنا کھانا خود کچن سے لے کر کھانا پڑتا تھا۔

اس نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد اپنا کام شروع کرنے کی غرض سے دراز کھولا۔ زمان خان اسے چائے دے کر پان لانے کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس کی نظر ایک نیلے رنگ کے خوب صورت لفافے پر پڑی ساتھ ہی اس کے نتھنوں میں مسحور کن خوش بو کی بھینی بھینی مہک پہنچی۔ اس نے لفافہ اٹھایا تو وہ اچھی طرح سے بند کیا ہوا تھا۔ اس پر خوش خط الفاظ میں تحریر تھا۔

بشرف نگاہ جناب پرویز خالد حیرت' یہ لفافہ اس کے نام تھا۔ حیرت اسی کا تخلص تھا۔ یہ لفافہ ڈاک سے نہیں آیا تھا۔ کوئی دستی طور پر دے گیا تھا۔ اس نے بڑی حیرت سے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اسے پیپر کٹر سے چاک کیا اندر سے خط نکال کر پڑھنے لگا۔ مضمون یہ تھا۔

پرویز خالد صاحب!

آپ کو میرا خط پا کر بڑی حیرت ہوئی ہوگی۔ میں آپ کی حیرت دو چند کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے یہ خط نہ تو ڈاک سے بھیجا ہے اور نہ ہی کسی کے ذریعے سے میں نے خط خود ہی آپ کی میز کی دراز میں رکھا ہے۔ یہ خط رکھتے ہوئے کسی نے مجھے نہیں دیکھا اور نہ کوئی مجھے دیکھ سکتا ہے۔ یہ بات میں اس لیے عرض کر رہی ہوں کہ تاکہ آپ سراغرسانی کی زحمت سے بچ جائیں میں نہیں چاہتی کہ آپ میری کھوج میں اپنا اور دفتر کا قیمتی وقت برباد کریں۔ میں آپ کو خط لکھنے کے بارے میں کئی دنوں سے نہیں' ہفتوں سے نہیں بلکہ مہینوں سے سوچ رہی تھی۔ ہمت نہیں ہوتی تھی۔ حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایک بار نہیں! سیکڑوں بار ایسا ہوا کہ آپ کو خط لکھنے کے لیے کاغذ قلم اٹھایا۔ کاغذ پر آپ کا نام لکھا۔ میں نے کئی القاب لکھے میرے حضور' میرے سانوریا' میری زندگی' میری روح' میرے ساتھی پھر میں نے ان القاب کو کاٹ دیا۔ میں نے سوچا کہ پہلے خط میں کوئی القاب لکھنا مناسب نہیں ہوگا۔ آج مہینوں کے بعد آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ آپ کو آپ ہی کے نام سے مخاطب کر رہی ہوں۔ میں آج آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرا خط غور اور توجہ سے پڑھیں گے اور اس کا جواب بھی عنایت فرمائیں گے۔ اچھا تو اب سنیے۔

میرا دل آپ سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں بھی اس دفتر میں ایک مدت سے کام کر رہی ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے بخوبی واقف ہیں۔ روز ہی ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ باتیں بھی ہوتی ہیں۔ نوک جھونک بھی ہوتی ہے۔ گپیں بھی ہانکتے رہتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو اس روز ہی سے آپ کی تصویر میرے دل کے نہاں خانے میں نقش ہوگئی تھی۔

جس روز آپ نے اپنی ایک غزل سنائی تھی۔ اس غزل میں آپ نے لڑکی کے حسن و جمال کا نقشہ جس خوب صورتی سے کھینچا اس سے میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ آپ نے اس غزل میں میری آنکھوں' میرے چہرے میرے سراپا کی تصویر شعروں میں کھینچی ہے۔ میں نے آپ کو اس لمحے دیکھا تو دیکھتی رہ گئی تھی۔ گھر پہنچی تو ایسا لگا کہ میرا دل میرے پاس نہیں رہا ہے۔ میرا دل تو آپ ہی کے پاس رہ گیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ شادی شدہ ہیں آپ کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ میں محبت اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ میں آپ کی چاہت میں پاگل ہوگئی ہوں۔ مجھے آپ کی صرف آپ کی محبت کی ضرورت ہے۔ میرے دل کو جبھی قرار آ سکتا ہے جب آپ مجھے لکھیں گے مجھے تم سے محبت ہے۔ بولو میرے دوست میرے ساتھی مجھے تم سے محبت ہے محبت ہے نا......؟

آپ میرے خط کا جواب لکھ کر اپنی دراز میں رکھ دیں میں آپ کا یہ خط آپ کی میز کی دراز سے نکال لوں گی پھر دو دن کے بعد آپ میز کی اسی دراز سے میرا لکھا ہوا خط نکال لیجیے گا۔

صرف آپ کی اپنی

وہ خط پڑھ کر بڑی حیرت میں مبتلا ہوگیا تھا۔ دفتر کی کون سی لڑکی اور عورت ہوگی جو اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اس نے خواب و خیال میں نہیں سوچا تھا کہ کوئی لڑکی یا عورت اس سے محبت کر سکتی ہے۔ اس کی غزل نے اس مہ وش کو اتنا متاثر کیا کہ وہ اس کی ذات سے متاثر ہو کر اس کی چاہت میں پاگل ہوگئی۔ گویا محبت کا ایک طرفہ ٹریفک چل رہا ہے۔ کیا آج کے دور میں اس بات کا امکان ہے کہ ایک برسر روزگار عورت جو ایک طرح سے بڑی حقیقت پسند ہوتی ہے ایک شادی شدہ مرد سے محبت کر سکے۔ جب کہ وہ کوئی دولت مند شخص بھی نہیں ہے اور پھر وہ کوئی جوان بھی نہیں ہے۔ فلم کے کسی ہیرو کی طرح خوب صورت' وجیہہ اور اسمارٹ بھی نہیں ہے۔ آج کل کی ایک لڑکی اور عورت جو پڑھی لکھی اور سمجھ دار اور ملازم پیشہ اور حسین ہوتی ہے وہ اپنے ہاتھ میں ایک ترازو رکھتی ہے۔ ایک پلڑے میں مرد کو دوسرے پلڑے میں اس کی وہ خوبیاں رکھتی ہے جو مستقبل میں اس کے لیے سہارے کا باعث بن سکیں۔

اس نے خط لفافے میں تہہ کر کے رکھ دیا اور اس خط کو جیب میں رکھتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ یہ جو کوئی بھی ہے وہ کسی پاگل سے کم نہیں ہے اس کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا ہوگا۔ یا پھر وہ کوئی بدصورت اور بے کشش عورت ہوگی جو اسے اپنی محبت کے جال میں پھانس کر اس کا بسا بسایا گھر اجاڑنا چاہتی ہے۔ مگر اس کے دفتر میں ایسی کسی لڑکی یا عورت کا وجود بھی تو نہیں ہے۔ جو لڑکیاں اور عورتیں ہیں ان میں بہت حسین اور بے حد پر کشش بھی ہیں۔ جو بہت حسین نہیں ہیں ان میں کوئی بدصورت یا بے کشش بھی نہیں ہے جو ہیں وہ جوانی کے خمار سے خوب صورت دکھائی دیتی ہیں۔

اس کے ذہن کے ایک کونے میں ایک خیال اور بھی آیا کہ دفتر کے کسی فرد کی شرارت تو نہیں ہوگی۔ اس سے تفریح لینے اور مذاق کرنے والا جو کوئی فرد تھا۔ وہ عورت ہو یا مرد بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی کو اس کے ساتھ ایسا مذاق کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اس نے کبھی دفتر کے کسی فرد کا برا نہیں چاہا تھا۔ اس کے ہر ایک کے ساتھ بڑے خوش گوار تعلقات قائم تھے۔

زمان خان اس کے لیے پان لے کر آیا تو اس نے پوچھا۔ ”آج صبح میری غیر حاضری میں کوئی میرے کمرے میں تو نہیں آیا تھا؟“

”نہیں تو سر۔“ زمان خان نے متعجب ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”خیریت تو ہے' کوئی چیز اِدھر اُدھر تو نہیں ہوگئی ہے؟“

”اچھی طرح سے سوچ کر بتاؤ۔“ وہ بولا۔ ”کوئی چیز اِدھر اُدھر تو نہیں ہوئی ہے لیکن کوئی میز کی دراز میں یہ خط رکھ گیا ہے۔“ اس نے لفافہ زمان خان کی نظروں کے سامنے لہرایا۔

”یہ کیسا خط ہے سر؟“ زمان خان نے اس کی میز کے پاس آ کر پوچھا۔

”کوئی خاص خط نہیں ہے۔“ پرویز نے اسے سخت تاکید کی۔ ”اس کا ذکر کسی سے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ دفتر میں اس خط کا کوئی چرچا ہو۔ مجھے امید ہے تم اس کے بارے میں اپنی زبان بند رکھو گے۔“

زمان خان چلا گیا۔ اسے اس پر بڑا بھروسا اور اعتماد تھا۔ وہ اس کی ہر بات مانتا تھا بلکہ اس کا احسان بھی مانتا تھا۔ اسی نے زمان خان کو دفتر میں ملازمت

دلوائی تھی۔ اس کے ہاں دونوں بچوں کی ولادت کے موقع پر زمان خان اور اس کی بیوی نے گھر کا بڑا خیال رکھا تھا۔ زمان خان اکثر اس کے ہاں کسی نہ کسی کام سے آتا رہتا تھا وہ اس کی ہمیشہ مالی مدد کرتا رہتا تھا۔ اس لیے اسے اس پر بہت بھروسا تھا۔

وہ چند لمحوں کے بعد اپنے کام میں مصروف ہوگیا لیکن اس خط کا خیال وہ اپنے ذہن سے نکال نہیں سکا تھا۔ یہ خط اس کا مضمون اس کے ذہن میں جیسے چپک کر رہ گیا تھا۔ اس نے ایک گھنٹے کے عرصے میں اس خط کو کوئی دو تین بار پڑھا تھا۔ اس نے ایم ڈی اور فنانس منیجر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ہال میں میزوں پر بیٹھ کر کام کرتی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھا تھا۔ کوئی پچیس لڑکیاں اور عورتیں دفتر میں ملازم تھیں۔ ان میں دس عورتیں شادی شدہ تھیں۔ تین لڑکیوں کی منگنیاں ہوچکی تھیں۔ اس سال میں ان کی شادیاں ہونے والی تھیں۔ باقی لڑکیاں اور عورتیں جو تھیں ان کی کسی وجہ سے اب تک شادی کی بات چیت طے نہ ہوسکی تھی۔ وہ شادی کے لیے امیدوار تھیں۔ ان لڑکیوں میں کوئی بدصورت نہ تھی۔ عورتیں جو شباب کی آخری منزل پر تھیں۔ شاید ان کے ہاتھوں میں شادی کی لکیر نہ تھی۔ ان کی شادیاں نہ ہونا تعجب خیز تھا۔ اس لیے کہ وہ دل کش خدوخال کی پر کشش عورتیں تھیں۔

اس نے ان لڑکیوں اور عورتوں کی طرف دیکھا تھا۔ باری باری ان کا جائزہ لیا تھا اور ان کے بارے میں سوچا تھا کہ ان میں سے کون ہوگی جو اس کی محبت میں گرفتار ہوئی ہے۔ ان میں سے کوئی ایسی ہستی نظر نہیں آئی تھی جو اس پر اس طرح فریفتہ ہوجائے پھر بھی اس کا شک نفیسہ نغمہ اور ثوبیہ پر ہونے لگا تھا۔ وہ تینوں اس سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف تھیں اور اس سے شعر سنانے کے لیے کہتی رہتی تھیں اسے سب سے زیادہ شک نفیسہ پر تھا اس لیے کہ اسے شاعری کا بہت زیادہ شوق تھا۔ اسے قدیم شعرا میں میر تقی میر غالب، داغ اور مومن کے اشعار یاد تھے۔ موجودہ دور کے شعرا میں اسے فیض احمد، فراز، جوش اور سلیم احمد کو بہت پسند کرتی تھی۔ پروین شاکر کے تمام شعرا سے یاد تھے۔ وہ سب سے زیادہ متاثر پروین شاکر سے تھی۔ وہ اس کے کلام کو بھی نہ صرف خوب سراہتی تھی بلکہ کبھی کبھی تنقید بھی کردیا کرتی تھی اسے کبھی بھی نفیسہ کی تنقید ناگوار نہیں لگی تھی۔

پرویز نے کبھی بھی دفتر کی کسی لڑکی یا عورت کے بارے میں اپنے جذبات کا تجزیہ نہیں کیا تھا۔ اس طرح وہ نفیسہ کے سلسلے میں بھی کوئی تجزیہ نہیں کرسکا جب کہ وہ اس کے کلام کو بے حد پسند کرتی تھی۔ اس نے کبھی نفیسہ کے بارے میں سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی اور پھر نفیسہ نے کبھی اسے اپنے حسن و جمال سے متاثر نہیں کیا تھا۔ اسے اپنے دفتر میں لڑکیوں اور عورتوں سے روز ہی سابقہ پڑتا تھا۔ پھر بھی اس نے حسن کے خزانے کو للچائی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن آج نفیسہ کے دل و دماغ پر کسی بدلی کی طرح چھا گئی تھی۔

اس نے محسوس کیا کہ اسے ایک ایسی لڑکی ایسے ساتھی اور ایک ایسے دوست کی ضرورت ہے جو اسے گھر کی تلخیوں سے نجات دلا سکے۔ وہ بیوی اور بچوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اس دنیا میں اکیلا محسوس کرتا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ خط کا حوصلہ افزا جواب لکھے گا۔ انجان بن کر نفیسہ کو خط لکھتا رہے گا۔ وہ اس پر یہ کبھی ظاہر نہیں کرے گا کہ وہ اس کے راز سے اس کی ذات سے اور شخصیت سے واقف ہوچکا ہے۔

دفتر میں لنچ کی چھٹی ہوتی تھی تو وہ دفتر ہی میں اپنے لیے لنچ منگوالیتا تھا۔ کچھ مرد، لڑکیاں اور عورتیں اپنے اپنے گروپ بنا کر لنچ کیا کرتی تھیں۔ ان میں کچھ تو اپنا اپنا لنچ گھروں سے لے آتی تھیں۔ وہ کبھی کبھی عورتوں کے گروپ میں شامل ہوجاتا تھا۔ آج بھی وہ عورتوں کے اس گروپ میں شامل ہوگیا تھا جس میں نفیسہ بھی تھی۔

اس کے لیے نفیسہ نئی تو نہیں تھی۔ وہ دو تین برس سے اسے دیکھتا آرہا تھا لیکن آج اسے نے نفیسہ کو اس طرح سے دیکھا جیسے وہ اسے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ آج وہ اس کی قربت سے ایک عجیب اذیت میں مبتلا ہوگیا تھا۔ نفیسہ کی طرف ایک نظر دیکھتے ہوئے بھی آج اسے ایک جھجک سی محسوس ہو رہی تھی کہ کہیں نفیسہ، مردوں، لڑکیوں اور عورتوں کو اس کے دل کے حال نہ معلوم ہوجائے۔ وہ نہ جانے کیا سمجھیں پرویز کسی حیلے بہانے سے نفیسہ پر ایک سرسری نظر ڈال لیتا تھا۔ اس طرح اس کی نظر کی پیاس نہیں بجھ رہی تھی۔ اس کی حالت اس پیاسے کی سی ہو رہی تھی جو کنویں کے پاس کھڑا تھا لیکن وہاں کوئی بھی کوئی چیز نہیں تھی۔ جس سے وہ پانی پی سکے۔

کھانا کھاتے کھاتے سب کی نظریں بچا کر اس نے ایک دفعہ پھر نفیسہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے بالکل سامنے تو بیٹھی تھی۔ اس کی نظروں کی گرفت میں تھی۔ وہ خوب صورت تو نہیں تھی۔ البتہ پر کشش ضرور تھی۔ اس عمر میں اس کے نزدیک رومان میں کوئی جاذبیت نہیں رہی تھی۔ لیکن آج ایک خط نے اس کا دل کسی جوان لڑکے کے دل کی طرح امنگوں بھرا بنا دیا تھا۔ وہ نفیسہ کو اپنی آنکھوں اور اپنے دل میں جذب کرنے لگا تھا۔

اچانک نفیسہ نے اس کی طرف دیکھا یوں جیسے پرویز کی چوری پکڑلی تھی۔ احساس جرم کے تحت اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ نفیسہ نے اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے فرمائش کی۔

"حیرت صاحب! آج اپنا کوئی نیا پھڑکتا ہوا شعر سنایئے؟"

"نہ" نہ حیرت صاحب!" ثوبیہ ہاتھ لہرا کے بولی۔ "آپ اس کے فریب میں نہ آیئے۔ یہ آپ کو شعر سنانے کے لیے اس لیے کہہ رہی ہے کہ آپ کے چکن تکے پر ہاتھ صاف کرسکے۔ بڑی ہوشیار ہے یہ۔"

"میں کسی کی لات نہیں کھاتی ہوں۔ تمہیں کھانا ہو تو کھالو۔" نفیسہ نے ثوبیہ کی پشت پر دھپ جمائی۔

"پرویز صاحب اس کمینی کو ایک عدد لات تو دیجیے۔ یہ ندیدی بھی کیا یاد کرے گی۔"

"ہاں تو جناب حیرت۔" ابوبکر نے گجراتیوں کے لب و لہجے میں کہا۔ "آپ سے مس نفیسہ بانو نے کسی پھڑکتے دھڑکتے شعر کی فرمائش کی تھی۔ جلدی سے شعر سنائیں تاکہ کھانا ہضم ہو۔"

نفیسہ کی میز پر رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی تو وہ کرسی سے اٹھ کر اپنی میز کی طرف بڑھی۔ اس نے نفیسہ کو ان سب کی پروا کیے بغیر دیکھا۔ اس کی چال زیادہ دل کش اور حرکات زیادہ دل فریب معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ نفیسہ کی محبت میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اپنے کمرے میں آیا تو اسے خود پر سخت حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنی جلدی نفیسہ پر کیسے مر مٹا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ نفیسہ اس کی کمزوری بن گئی ہے۔ اس نے اسی وقت کاغذ قلم اٹھا کر نفیسہ کے نام ایک خط لکھا۔

"میں تمہیں کس نام سے مخاطب کروں؟ تم نے اپنا نام ہی نہیں لکھا۔ تمہیں کیا القاب لکھوں کس لقب سے نوازوں یہ فیصلہ نہیں کرسکا اور نہ ہی کوئی ایسا لقب یاد آرہا ہے۔ جس سے تمہیں نوازوں اس لیے یہ جگہ خالی چھوڑ دی ہے۔ آخر تم ہو کون؟ آخر اس پردہ داری سے کیا حاصل؟ جب تم نے میرے دل کے دروازے پر دستک دے ہی دی ہے تو تمہیں اپنا نام بتا دینا چاہیے۔ میرے دل میں تمہیں دیکھنے کی بڑی خواہش ہورہی ہے۔ تمہارا نام جاننے کے لیے بے تاب ہورہا ہوں۔ تمہارا خط پا کر میرا دل میرا رواں رواں کتنا خوش ہورہا ہے۔ میں بتا نہیں سکتا۔ تم اتنے عرصے سے مجھ سے محبت کررہی ہو۔ مجھ سے اتنا پیار ہوگیا ہے ایک ایسے شخص پر اتنا بھروسا جو شادی شدہ ہے۔ مجھ سے اتنی محبت اتنی امید اتنا بھروسا آخر کیسے ہوگیا؟ مجھے ایسے لگ رہا ہے جیسے یہ سب کچھ سپنا ہو۔ کوئی سنہرا سنہرا اور میٹھا میٹھا سا سپنا میں کسی گھنی چھاؤں میں کھڑا ہوں جیسے کوئی فکر ہی نہ ہو۔ تم نے میری طرف اپنا محبت بھرا ہاتھ بڑھایا ہے تو اسے کھینچ نہ لینا۔ میں نے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

تمہارا صرف تمہارا

پ؟؟؟؟

پرویز نے یہ خط لکھ کر لفافے میں بند کیا اور اپنی میز کی دراز میں اسی جگہ رکھ دیا جس جگہ اسے آج خط ملا تھا۔ اس نے زمان خان کو بلا کر کہا۔ "تم دفتر میں سب سے پہلے آتے ہو۔ کل مجھے صرف اتنا بتانا کہ میری غیر موجودگی میں میرے کمرے میں کون داخل ہوا تھا۔ اگر تم کسی کو اندر جاتے یا نکلتے دیکھو تو انجان بنے رہنا۔ اس سے کچھ مت کہنا۔ صرف مجھے اس کا نام بتا دینا۔"

دوسرے دن اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر سب سے پہلے میز کی دراز کھول کر دیکھی۔ میز کی دراز میں خط موجود نہیں تھا۔ گویا نفیسہ نے اسے نکال لیا تھا۔ زمان خان اس کمرے میں آیا تو اس نے پوچھا۔

"تم نے پتا چلایا میرے کمرے میں کون گیا تھا؟"

"میں صبح ہی سے آپ کے کمرے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔" زمان خان نے جواب دیا۔ "میں نے کسی کو کمرے میں جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ ہی پہلے شخص ہیں کمرے میں داخل ہونے والے۔"

"دفتر کے اسٹاف میں سب سے پہلے کون آیا تھا؟"

"پہلی بس مردوں کی آئی تھی۔ دوسری بس عورتوں اور لڑکیوں کی تھی۔ دفتر میں دونوں ہی بسوں کے لوگ ایک ساتھ آگے پیچھے داخل ہوئے تھے۔ لہٰذا اسٹاف میں سے کوئی پہلے نہیں آیا۔"

"ان لوگوں کے آنے کے بعد تم کسی کام سے باہر تو نہیں چلے گئے تھے؟"

"میں صرف پانچ منٹ کے لیے ایم ڈی صاحب کے کمرے میں گیا تھا۔ اس کے بعد سے باہر یعنی آپ کے کمرے کے سامنے کھڑا ہوں۔"

زمان خان کے جانے کے بعد وہ سوچنے لگا نفیسہ کتنی ہوشیار اور چالاک ہے کتنی پراسرار ہے اس نے موقع پاتے ہی اس کے کمرے میں آکر اس کا خط نکال لیا۔ وہ دفتر میں تحقیقات کرتا تو اسے پتا چل جاتا کہ اس کے کمرے میں کون داخل ہوا تھا لیکن اس کا اس طرح سے دفتر میں پوچھ گچھ کرنا مناسب نہیں تھا۔ دفتر والوں کو شک وشبہے کا موقع مل جاتا۔

دونوں میں خط وکتابت بڑی باقاعدگی سے شروع ہوگئی تھی۔ آگ دونوں طرف ہی لگی ہوئی تھی۔ وہ تو خط کا جواب فوراً ہی دے دیتا تھا جب کہ نفیسہ کی

طرف سے جواب دو ایک دن تاخیر سے ملتا اس خط و کتابت کو پندرہ دن ہوگئے لیکن نفیسہ نے خط میں اپنا نام نہیں لکھا اور نہ ہی وہ کھل کر سامنے آئی تھی۔ اس کے خط اس کی میز کی دراز سے پراسرار طریقے سے غائب ہوجاتے اور پراسرار طریقے سے نفیسہ کے خط بھی میز کی دراز میں پائے جاتے تھے۔

زمان خان نے بے حد کوشش کی خط رکھنے اور نکالنے والے کو رنگے ہاتھ پکڑے لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہا تھا۔

اب اس میں شک وشبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی کہ یہ محبت نامے نفیسہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس روز سے اسے نفیسہ کے محبت نامے ملنے شروع ہوئے تھے اس روز سے یہ بات محسوس کرنے لگا تھا کہ نفیسہ نہ صرف بہت خوش نظر آنے لگی ہے بلکہ اس سے روز بروز بے تکلف بھی ہونے لگی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ نفیسہ اس سے واقعی محبت کرنے لگی ہے۔ وہ کھل کر سامنے کیوں نہیں آرہی ہے۔ یہ ایک معمہ تھا۔ ایک روز اسے نفیسہ کا خط ملا اس کا مضمون یہ تھا۔

"میرے خوابوں کے شہزادے!

میں آج تم سے کسی اور موضوع پر بات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں تم سے محبت کرتی رہوں اور تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو تمہیں میری خاطر میری چند گزارشات ماننا پڑیں گی۔ یہ جو تم دو دو گھنٹے دفتر دیر سے آتے ہو اور وقت کی پابندی نہیں کرتے میرے لیے سوہان روح بن جاتا ہے۔ میرا دل تمہارے انتظار میں بری طرح دھڑکتا رہتا ہے میں تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھی رہتی ہوں۔ مجھ سے کوئی کام نہیں ہو پاتا میں دو تین مرتبہ ایم ڈی صاحب کی ڈانٹ سن چکی ہوں۔ تم جانتے ہو وہ کیسے سخت اور اصول پسند آدمی ہیں۔ وہ میری اس غیر ذمہ داری سے تنگ آکر مجھے کہیں نوکری سے نکال نہ دیں۔ مجھے نوکری چلے جانے کی کوئی فکر نہیں ہوگی۔ غم ہوگا تو تمہاری جدائی کا۔ کیا میں تمہاری جدائی سہہ سکوں گی؟ نہیں، ہرگز نہیں میں تو تمہیں اپنی نظروں سے ایک پل کے لیے اوجھل ہونے نہیں دینا چاہتی ہوں۔ خدا کے لیے تم دفتر ٹھیک نو بجے پہنچ جایا کرو تاکہ میرے دل کی کلی کھل جائے۔ کل سے بلکہ پہلے وعدہ کرو کہ تم روزانہ شیو کر کے صاف ستھرے اور اچھے کپڑے پہن کر آؤ گے اور پان کھانا بھی چھوڑ دو گے میں تمہیں ایک شہزادے کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔

تمہارا گزشتہ خط خاصا طویل تھا۔ تم نے اس خط میں اپنی بیوی کی شکایت کا دفتر کھول دیا ہے۔ تمہاری بیوی رشیدہ پھوہڑ، بدمزاج، غیر ذمہ دار نکمی بیوی ہے۔ اسے نہ تو اپنا خیال ہے اور نہ اپنے شوہر کا اور نہ ہی گھر اور بچوں کا خیال رہتا ہے۔ کھانا بھی پکانا نہیں آتا۔ اسی لیے تم اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتے ہو اور مجھ سے دوسری شادی کے خواہش مند ہو۔ یہ سن کر خوشی سے میری جو حالت ہوئی ہے وہ میں بیان نہیں کرسکتی ہوں۔ میں خود بھی یہ چاہتی ہوں کہ ہم دونوں ایک خوش گوار ازدواجی زندگی گزاریں۔ پُر مسرت زندگی کے لیے ایک عورت کا خوب سیرت اور خوب صورت ہونا بے حد ضروری ہے۔ میں خوب صورت بھی ہوں اور خوب سیرت بھی میں چاہتی ہوں کہ لندن سے میرے بھائی جان کے آنے کا انتظار کرو۔ وہ دو مہینے کے بعد آرہے ہیں۔ اس عرصے میں، میں چائنیز اور فرانسیسی کھانوں کا کورس بھی کرلوں گی تاکہ تمہیں گھر

میں انواع واقسام کے کھانے پکا کر کھلا سکوں۔ تمہیں میرے نام اور میری شخصیت پر سے پردہ اٹھنے کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

اور ہاں تم نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ تم اپنی بیوی کو بھڑکیلے لباس میں دیکھنا چاہتے ہو۔ تمہیں ہلکا میک اپ بھی پسند ہے۔ اچھا کیا تم نے مجھے اپنی پسند کے بارے میں بتایا۔ اب میں تمہاری خواہش کا احترام کیا کروں گی۔

تمہاری صرف تمہاری

؟؟؟

نفیسہ کا خط پڑھنے کے بعد اس نے دل میں مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ کل سے ایک نیا انسان، نیا آدمی بن کر دفتر آیا کرے گا۔ جیسے شادی سے پہلے آتا تھا۔ اس نے جو ارادہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ وہ دوسرے دن صبح آٹھ بجے بستر سے اٹھا تو بیوی بچوں نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔ اس نے خوب اچھی طرح شیو کیا سفاری سوٹ نکال کر پہنا۔ اس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو اس کا جی خوش ہوگیا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ ہزاروں میں ایک ہے۔ آج بھی اس پر جوانی جیسے ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ وہ ٹھیک نو بجے دفتر پہنچا تو دفتر والوں کو یقین نہیں آیا۔ آج اس نے پان بھی نہیں کھایا تھا۔ تین دن تک وہ دفتر نو بجے آنے لگا تو دفتر والوں نے کہا تھا۔ ”بھئی حیرت صاحب نے واقعی حیرت میں مبتلا کر دیا ہے۔“

بیوی نے کہا تھا۔ ”اب سورج مغرب سے طلوع ہونے لگا ہے۔“

چوتھے روز اس نے نفیسہ کو دیکھا تو اس کا دل خوشی سے جیسے جھوم اٹھا۔ اب اس بات میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں رہا تھا اسے خط لکھنے والی اور بے انتہا محبت کرنے والی لڑکی نفیسہ ہی ہے۔ آج نفیسہ دفتر آئی تو پہلی بار ایک نئے رنگ روپ میں آئی تھی۔ اس نے خوش نما رنگ کا تنگ وچست لباس پہنا ہوا تھا وہ بڑی غضب کی لگ رہی تھی۔ ہلکے اور نفیس میک اپ نے اس کی شخصیت میں ایک عجیب سا نکھار پیدا کر دیا تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنے آپ کو نئے رنگ میں ڈھال لیا تھا۔ پرویز نے نفیسہ کی بات مان لی تھی اور نفیسہ نے پرویز کی خواہش اور اس کے جذبات کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ محبت نے ایک دوسرے کو بدل دیا تھا۔ زندگی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی تھی۔ اس نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ اب اسے نفیسہ سے شادی کرنے میں دیر نہیں کرنا چاہیے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ نفیسہ کے بغیر یہ زندگی نہیں گزار سکے گا۔ لہٰذا اسے چاہیے کہ رشیدہ کو طلاق دے کر اس کی ماں کے پاس بھیج دے۔ اسے نفیسہ کے خط کا انتظار تھا۔ وہ اس کے خط کے ملنے کے بعد ہی رشیدہ کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھا سکتا تھا۔

نفیسہ کا خط ملنے پر اس نے نفیسہ کو لکھا تھا کہ اب جب کہ میں نے اپنے آپ کو پوری طرح ایک نئے رنگ اور سانچے میں ڈھال لیا ہے جس کی تم خواہش مند (اس نے دانستہ نفیسہ پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی کہ اسے معلوم ہوچکا ہے کہ اسے خط لکھنے والی کون ہے اور تمہارا راز اب مجھ پر آشکارا ہوچکا ہے)۔ میں چاہتا ہوں کہ اب ہم دونوں اپنا گھر بسا لیں۔ اب مجھ میں انتظار کی تاب نہیں رہی۔ اس کے اس خط کے جواب میں نفیسہ نے اسے لکھا تھا وہ ایک مہینہ اور صبر کرے۔ ایک مہینے کے گزرتے دیر ہی کتنی لگتی ہے پھر ہم دونوں کسی جگہ مل کر مستقبل کا

پروگرام بنائیں گے۔

ایک روز وہ دفتر پہنچا تو پتا چلا کہ آج نفیسہ دفتر نہیں آئی۔ تشویش کی بات نہیں تھی۔ لیکن اس کے دل پر جیسے قیامت سی گزر گئی۔ اب وہ ایک دن کے لیے بھی نفیسہ کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے کسی سے پوچھنا مناسب بھی نہیں سمجھا کہ آج وہ کیوں نہیں آئی ہے۔ کوئی گیارہ بجے جب چائے کا دور شروع ہوتا تھا زمان خان نے آکر اسے بتایا کہ لوگ اس کا ہال میں انتظار کر رہے ہیں۔ چائے وہیں پی جائے گی۔

وہ ہال میں آیا تو اس نے تین میزوں کے گرد دفتر کے مرد لڑکیوں اور عورتوں کی بھیڑ دیکھی۔ وہ ایک میز پر جا کھڑا ہوا۔ میز پر مٹھائی اور سموسے رکھے تھے۔ دفتر کے لوگ مٹھائی کھا رہے تھے۔ وہ بھی مٹھائی کھانے لگا۔ اس نے مٹھائی کھاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ مٹھائی کس خوشی میں ہے؟ آج مرغا کون بنا ہے؟ کس کی ترقی ہوئی ہے؟“

”ترقی نہیں ہوئی، منگنی ہوئی ہے۔“ بیگم آغا نے اسحاق کی طرف اشارہ کیا جو دفتر میں کیشیئر تھا۔ وہ تیسری میز پر دلہا کی طرح شرمایا ہوا کھڑا تھا۔ ”منگنی کی خوشی کی مٹھائی ہے۔“

”اس نے نہ تو ہمیں منگنی میں بلایا اور نہ ہی دفتر میں کوئی ہوا لگنے دی۔“ ارشد نے کہا۔ ”اس پر جرمانہ بھی ہونا چاہیے کل دوپہر اس سے مرغ پلاؤ منگوا کر کھائیں گے۔“

”جرمانہ تو نہ صرف اسحاق پر بلکہ نفیسہ پر بھی ہونا چاہیے۔“ بیگم آغا بولیں۔

”نفیسہ پر کس لیے۔“ پرویز نے چونک کر پوچھا۔

”اس لیے کہ نفیسہ نے مجھے اندھیرے میں رکھا۔“ بیگم آغا کہنے لگیں۔ ”ایک روز میں کسی کام سے نفیسہ کے ہاں گئی تو اس کی والدہ اپنی بیٹی کی شادی نہ ہونے کا رونا رونے لگیں اور مجھ سے کہنے لگیں کہ اس کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ بتائیں۔ آخر دفتر میں بھی اتنے سارے کنوارے مرد کام کرتے ہیں۔ کیا ان میں سے کسی ایک سے نفیسہ کی شادی نہیں ہوسکتی۔ پھر میں نے انہیں ایک نسخہ بتایا اور انہیں سمجھایا کہ آج کل لوگ کوئی چیز بھی خریدتے ہیں تو پہلے اس کی پیکنگ دیکھتے ہیں۔ پیکنگ ہی سب سے پہلے متاثر کرتی ہے۔ آج کل کے مرد اور لڑکے ان لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں جو ٹپ ٹاپ میں ہوتی ہیں۔ انہیں میری بات سمجھ میں آگئی۔ اس کے تیسرے ہی دن سے نفیسہ بالکل مختلف لڑکی بن کر آنے لگی۔ نتیجہ جلد ہی نکل آیا۔ کل ہی نفیسہ اور اسحاق کی منگنی بھی ہوگئی۔“

پرویز پر جیسے بجلی سی آگری۔ اس کا سر بری طرح چکرانے لگا۔ اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ اسے ایسا لگا کہ کوئی بھونچال آگیا ہے۔ ہر چیز ڈول رہی ہے۔ کانپ رہی ہے۔ اسے لگا کہ اس کی ٹانگیں اس کا وزن سہار نہ سکیں گی۔ اس نے بہ دقت تمام خود پر قابو پاتے ہوئے کرسیوں کی طرف بڑھا جو ایک جگہ رکھی تھیں میزیں خالی کرنے کے لیے اس نے کرسی پر اپنے آپ کو دھم سے گرا دیا۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ سب ناشتا کرنے اور گپیں ہانکنے میں مصروف تھے۔ ادھر اسے اپنے سینے میں کوئی برچھی سی اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے نفیسہ سے اس دغا بازی کی امید نہ تھی۔ محبت اس سے کی تھی اور شادی اسحاق سے کرنے والی تھی۔ محبت کے نام پر اسے فریب دے دیا تھا۔ بے وقوف بنایا تھا۔ اس کا دماغ یہ سب کچھ سوچ سوچ کر ماؤف ہو رہا تھا۔ آج

اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ نفیسہ اسے اپنی بیوی کو طلاق دینے سے کس لیے روک رہی تھی۔

وہ خرابی طبیعت کا بہانہ کر کے اپنے گھر چلا آیا۔ دروازے پر دستک دی تو رشیدہ نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ اسے اچانک اور غیر متوقع گھر پر دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس نے پرویز کے بشرے سے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کے شوہر کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر بیٹھ گیا تو رشیدہ نے اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہو کر بڑی محبت اور فکر مندی سے اس کی پیشانی، گلے اور ہاتھ کو چھو کر دیکھا اور پوچھا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ خیریت تو ہے، آپ آج اتنی جلدی واپس کیسے آ گئے؟"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے سر میں بڑا سخت درد ہو رہا ہے۔" اس نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

رشیدہ نے فرش پر بیٹھ کر اس کے پیر سے جوتے اور موزے نکالے پھر اس کے شانے پکڑ کے اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ وہ کمرے سے نکل گئی تو پرویز آنکھیں بند کر کے اس بے وفا نفیسہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کا دل اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ وہ نفیسہ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ رشیدہ نے بڑی آہستگی سے اس کا شانہ ہلایا۔ "یہ گولی کھا کر چائے پی لیجیے۔"

اس نے آنکھیں کھول کر رشیدہ کی طرف دیکھا۔ رشیدہ ایک ہاتھ میں گولی اور دوسرے ہاتھ میں چائے لیے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ پہلی سی محبت جھانک رہی تھی۔ جو اس نے شادی سے پہلے اور شادی کے بعد ابتدائی سالوں میں دیکھی تھی۔ اس کے چہرے پر چاہت کا کیسا عجیب سا نور چھلک رہا تھا۔ اس نور میں اس نے اپنے وجود کو ڈوبتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ اس کی نظروں کی گرفت میں وہ رشیدہ نہیں تھی۔ جو نوکرانیوں کا سا حلیہ بنائے رہتی تھی۔ وہ سوتی ساڑھی اور سفید بلاؤز میں ملبوس کھڑی بہت سگھڑ اور سلیقے کی لگ رہی تھی۔ چوٹی بھی گندھی ہوئی تھی۔ سادگی کا پیکر بنی ہوئی بہت دل کش دکھائی دے رہی تھی۔ برسوں کے بعد اس نے رشیدہ کا یہ روپ دیکھا تھا۔ اس نے رشیدہ کے ہاتھ سے گولی اور چائے کی پیالی لی۔ رشیدہ بولی۔

"میں بچوں کو لینے اسکول جا رہی ہوں۔ دس پندرہ منٹ میں آ جاؤں گی۔" اس نے گولی چائے کے گھونٹ کے ساتھ حلق میں اتاری۔ چائے پی کر اس نے پیالی تپائی پر رکھ دی۔ رشیدہ چادر اوڑھ کر گھر سے باہر جا چکی تھی۔ اس کا سر شدت غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اب اس کے دل کے کسی کونے میں نفیسہ کے لیے نفرت جنم لینے لگی تھی۔ وہ زیر لب بڑبڑانے لگا بے وفا ذلیل، ہرجائی، سچ ہے عورت تیرا نام مکاری ہے۔

اس نے چند لمحوں کے بعد آنکھیں کھولیں تو اس کی نظریں غیر ارادی طور پر کمرے میں بھٹکنے لگیں۔ کمرہ بے حد صاف ستھرا اور بے حد سلیقہ سے سجا ہوا تھا۔ وہ ایک دم اچھل پڑا۔ آج اسے اچانک محسوس ہوا تھا کہ اس کے گھر میں بھی غیر محسوس انداز میں تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ اب اس کا گھر پہلے جیسا نہیں رہا۔ رشیدہ بدل چکی ہے گھر کا ماحول بدل چکا ہے۔ ایک ایک چیز میں تبدیلی آ چکی ہے کھانے بھی اچھے لگنے لگے ہیں۔ وہ نفیسہ کی محبت میں ایسا کھو گیا اور اتنی دور چلا گیا تھا کہ اسے یہ سب کچھ دیکھنے اور محسوس کرنے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ رشیدہ اس کا پہلے سے بہت زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔

اس نے بستر سے نکل کر گھر کا جائزہ لیا تو اسے اپنا گھر آئینے کی طرح چمکتا اور صاف وشفاف لگا تھا۔ اگر اس کا دل غم سے بوجھل نہ ہوتا تو بڑی خوشی ہوتی۔ اس نے سوچا کہ اسے کپڑے تبدیل کر کے کچھ دیر کے لیے سو جانا چاہیے۔ وہ الماری کی طرف بڑھا۔ الماری کھولی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے بے خیالی میں رشیدہ کی الماری کھول دی تھی۔ وہ الماری بند کرنے لگا تو معاً اس کی نظر ایک لیٹر پیڈ پر پڑی جو کپڑوں کے نیچے دبا ہوا تھا۔ لیٹر پیڈ میں سے ایک لفافہ جھانک رہا تھا۔ نیلے رنگ کا لفافہ۔ لفافہ دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔ اس نے دوسرے لمحے لیٹر پیڈ نکال کر دیکھا۔ اس میں ایک کاغذ پر خط لکھا تھا۔ وہ خط پڑھنے لگا۔

جانِ پرویز!

تمہارا خط ملا میں نے بہت سوچا تمہاری باتوں پر غور کیا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں تم سے اب کوئی تعلق نہ رکھوں میں اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کا گلہ گھونٹ رہی ہوں۔ میں ایک عورت ہو کر ایک عوت کا گھر اجاڑنا نہیں چاہتی۔ میں اتنی ظالم بھی نہیں ہوں کہ معصوم بچوں کا مستقبل تباہ کر دوں۔ لہٰذا آج سے تمہارے اور میرے راستے جدا جدا۔ اب تم نہ تو مجھے کوئی خط لکھنا اور نہ میں تمہیں کوئی خط لکھوں گی۔ تم یہ سوچ کر صبر کر لینا کہ تمہیں چاہنے والی مر گئی۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

وہ جو کبھی تمہاری اپنی تھی

؟؟؟

خط پڑھ کر اس پر سکتہ سا چھا گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ حرکت رشیدہ کی ہے۔ رشیدہ نے اپنی لکھائی بہت بدل لی تھی۔ اسے شک بھی نہ ہو سکا تھا۔ اف میرے خدایا! اس نے پلنگ پر بیٹھ کر اپنا سر پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ سے خط اور لیٹر پیڈ چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ اب تو وہ رشیدہ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

جس وقت وہ فرش پر سے خط اور لیٹر پیڈ اٹھا رہا تھا رشیدہ کمرے میں داخل ہوئی اور ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس نے سیدھے ہو کر رشیدہ کو دیکھا۔ رشیدہ دل فریب انداز سے مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چاہت، سپردگی اور والہانہ پن تھا۔ وہ اس کے قریب آئی تو اس نے خجالت سے پوچھا۔ "یہ سارا چکر اور کھیل کس لیے تھا۔"

رشیدہ نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ "آپ کو ایک اچھا اور ذمہ دار آدمی بنانے کے لیے۔"

"تم نے اس کھیل میں کیا پایا؟" اس نے رشیدہ کو بازوؤں میں بھر لیا۔ "کیا تمہیں شوہر کی بے وفائی سے دکھ نہیں پہنچا؟"

"میں نے بہت کچھ پایا کہ میں اچھی عورت اور بیوی بن گئی۔ اچھی ماں بن گئی۔" وہ اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ "آپ کی بے وفائی کی ذمے دار بھی دراصل میں ہی ہوں۔ مجھے معاف کر دیجیے۔"

چند لمحوں کے بعد اس نے پوچھا۔ "تمہارے خط میری میز کی دراز میں کون رکھتا تھا اور میرے خط دراز سے نکال کر تم تک کون پہنچاتا تھا؟ کیا دفتر کی کوئی لڑکی یا عورت......؟"

"زمان بھائی......!" رشیدہ نے جواب دیا۔

❖

محبت کی سیڑھی

جناب عمران احمد،
السلام علیکم!
ایک نئی تفتیشی کہانی محبت کی سیڑھی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ میری دیگر کہانیوں سے خاصی مختلف لگے گی۔ اس میں آپ کو روایتی دیہی معاشرے کی جھلک اور محبت کے انوکھے رنگ ملیں گے۔ امید ہے آپ کو اور قارئین کو یہ کہانی پسند آئے گی۔

والسلام
ریاض بٹ

رات کے اندھیرے میں جو جرائم ہوتے ہیں۔ وہ عموماً دن کے اجالے میں ظاہر ہوتے ہیں اور تھانے تک پہنچتے ہیں۔ وہ واردات بھی ایک صبح ہم تک پہنچی تھی۔

تھانے کی حدود میں واقع ایک گاؤں سے اطلاع آئی کہ رات کو چور ایک گھر سے جہیز کا سارا سامان لے گئے ہیں۔ میں نے جلدی جلدی ضروری تیاری کی اور ایک کانسٹیبل اور ایک سپاہی کو ساتھ لے کر واردات والے گھر پہنچ گیا۔ آگے کچھ بتانے سے پہلے ذرا مکان اور مکینوں کے متعلق وضاحت کردوں۔ یہ مکان تقریباً دس مرلے پر بنا ہوا تھا۔ مین دروازہ مشرق کے رخ پر تھا اس سے آگے لمبا سا برآمدہ تھا۔ برآمدے کے بائیں طرف قطار میں تین کمرے تھے۔ کمرے بڑے تھے دائیں طرف کھلا صحن تھا اور صحن میں ایک جامن اور ایک بیری اور ایک نیم کا پیڑ تھا۔ گھر کے مالک کا نام عرفان اور مالکہ کا نام کنیز فاطمہ تھا۔ ان کی دو اولادیں تھیں پرویز اور صبیحہ۔ پرویز روزگار کے سلسلے میں کسی مغربی ملک میں گیا ہوا تھا۔ جبکہ صبیحہ دس جماعتیں پاس کرکے آج کل گھر میں ہی رہتی تھی۔ جہیز کا سامان صبیحہ کے لیے تھا۔ اگلے مہینے پرویز نے آنا تھا اور صبیحہ کی شادی ہونی تھی۔ صبیحہ کی منگنی اس کے ماموں زاد سے بچپن میں ہی کردی گئی تھی۔

ظاہر ہے یہ باتیں مجھے عرفان اور کنیز فاطمہ نے بتائی تھیں۔ ان میں کچھ باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ لیکن کہانی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ساری باتیں یہاں ہی بیان کردی ہیں۔

صبیحہ کا کمرا آخر میں تھا۔ اس کا ایک دروازہ پچھلی طرف کھلتا تھا۔ جہیز کا سامان اسی کمرے میں تھا۔ ہم اسی وقت اس کمرے میں تھے۔ عرفان اور اس کا بھائی کامران ہمارے ساتھ تھے۔ عرفان کی حالت بہت بری تھی۔ (تھانے میں دونوں بھائی آئے تھے) کامران نے اسے سنبھالا ہوا تھا۔

کمرے میں ایک پلنگ ایک بڑی سی میز اور دو کرسیاں تھیں۔ اس وقت کمرے کی حالت یہ تھی کہ بڑے بڑے دو صندوق کھلے پڑے تھے۔

ان کے تالے ٹوٹے ہوئے پاس پڑے تھے۔ صندوق بالکل خالی تھے۔ زیور اور قیمتی ملبوسات ان میں تھے۔ بارہ تولے زیور اور بیس کے قریب ریشمی جوڑے تھے۔ عرفان نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ زیور کے ساتھ ایک صندوق میں تقریباً چالیس ہزار روپیہ بھی تھا۔ یہ چالیس ہزار روپیہ آج کل کے حساب

سے بہت بڑی رقم تھی۔ کمرے کا فرش پکا تھا۔ اس لیے کسی قسم کے کھرے ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس کمرے میں ہم نے ضروری کارروائی مکمل کرلی تھی۔ کانسٹیبل اور سپاہی کو میں نے باہر کھڑی گاڑی میں بھیج دیا اور خود دونوں بھائیوں کے ساتھ پہلے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ یہاں یہ بھی بتادوں کہ ایک کمرے میں کنیز فاطمہ محلے کی چند عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے جو باتیں معلوم کرنی تھیں۔ وہ ہم نے کرلی تھیں۔

چور کمرے میں کس طرح داخل ہوئے تھے۔ اس کے متعلق میں نے ایک نظریہ قائم کیا تھا جو میں ابھی آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ مناسب موقع پر سب کچھ آپ کو پتا چل جائے گا۔ البتہ ایک بات میں آپ کو بتا دوں کہ صبیحہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے کلوروفارم زیادہ مقدار میں سنگھا دیا گیا تھا۔ اس کے متعلق پتا چلا تھا کہ وہ صبح سات بجے اٹھتی تھی۔ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرکے نہیں سوتی تھی۔ آج صبح جب وہ آٹھ بجے تک کمرے سے باہر نہ آئی تو والدین کو تشویش ہوئی۔ (پچھلا دروازہ بند ہوتا تھا) کنیز فاطمہ نے پہلے تو اس کو آوازیں دیں۔ جب اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

پھر...... کمرے کی حالت اور صبیحہ کو بے ہوش دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ چیخ سن کر عرفان بھی دوڑ آیا۔ یہاں بات ذرا مختصر کرتا ہوں تھوڑی دور عرفان کا بھائی کامران رہتا تھا۔ وہ اتفاقاً گھر میں تھا۔ وہ بھی شادی شدہ تھا۔ دونوں میاں بیوی افراتفری میں عرفان کے ساتھ آگئے۔ کیونکہ عرفان صبیحہ کے کمرے کی حالت دیکھ کر سیدھا کامران کے گھر گیا تھا۔ اس دوران محلے کی کچھ عورتیں بھی آگئی تھیں۔ صبیحہ کو درمیان والے کمرے میں منتقل کردیا گیا تھا۔ پڑوس میں ایک لیڈی ڈاکٹر رہتی تھی۔ اس کو بلالیا گیا تھا۔

''ہاں بھئی عرفان بھائی' آپ کی کچھ باتیں مجھے الجھا رہی ہیں۔'' میں نے عرفان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون سی باتیں تھانے دار صاحب؟'' عرفان نے مجھے خالی خالی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا تھا اس کا ذہن کہیں اور ہے۔

''جب آپ نے صبیحہ کے کمرے کی حالت دیکھی تو بجائے آپ صبیحہ کے لیے کچھ کرتے آپ دوڑے دوڑے اپنے بھائی کے پاس چلے گئے تھے۔ اس کی وجہ بتا سکتے ہیں۔'' میں نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب آپ کچھ شک نہ کریں۔ بھائی صاحب کا دماغ ماؤف ہوگیا تھا۔ جب میرے پاس پہنچے تھے۔ تو ان کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے اور میری بیوی نے بڑی مشکل سے انہیں بات کرنے کے لیے تیار کیا تھا۔ عرفان کے بجائے اس کے بھائی کامران نے جواب دیا۔

''دیکھیں کامران صاحب یہ بات مجھے ہضم نہیں ہورہی۔ اس کی کوئی وجہ ضرور ہے؟ نفسیاتی نقطہ نگاہ سے بھی یہ بات عجیب سی لگتی ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''دراصل تھانے دار صاحب......!'' کامران نے ایک لمحہ کے لیے بھائی کی طرف دیکھا۔ پھر گویا ہوا۔ ''یہ ہماری عزت کا معاملہ ہے۔''

''جس طرح ڈاکٹر سے کوئی مرض چھپایا جائے تو

علاج ممکن نہیں ہوتا۔ اس طرح تھانے دار سے کوئی بات چھپانا گویا جرم پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس کوئی الہ دین کا چراغ نہیں ہوتا۔ آپ کچھ بتائیں گے تو معاملہ آگے چلے گا۔

پھر جو کچھ انہوں نے بتایا۔ اس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ صبیحہ کی منگنی اس کے ماموں زاد سے ہوگئی تھی۔ تقریباً دو سال پہلے گاؤں کے ایک لڑکے کے ساتھ صبیحہ کا چکر چل پڑا تھا۔ لڑکے کا نام نوید تھا۔ دونوں میں عہد و پیمان ہوئے تھے۔ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی گئی تھیں۔ عرفان اور اس کی بیوی تک بات اس وقت پہنچی تھی۔ جب نوید کے والدین صبیحہ کا رشتہ مانگنے آئے تھے ظاہر ہے۔ انہیں رشتہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے کافی منت سماجت کی تھی۔ اپنے بیٹے کی زندگی کا واسطہ دیا تھا۔ وہ جاتے جاتے یہ بھی کہہ گئے تھے کہ نوید ہمارا لاڈلا بیٹا ہے۔ اگر اس کو کچھ ہوگیا تو...... اس کے آگے انہوں نے بات نہیں کی تھی۔ لیکن آگے وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اسے سمجھنے کے لیے کسی ارسطو کے دماغ کی ضرورت نہیں تھی۔ اب میرے لیے وہاں بیٹھنا وقت کے زیاں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہم تھانے واپس آگئے۔

اے ایس آئی رانا تنویر میرے کمرے میں میرا منتظر تھا۔ جب اسے ساری بات پتا چلی تو وہ سگریٹ کا کش لے کر دھواں اگلتے ہوئے بولا۔

''سر' معاملہ سیدھا سادا لگتا ہے۔''

''بظاہر۔'' میں نے میز پر پڑے کاغذات کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب سر۔'' اس نے حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

جو نظریہ تم نے قائم کیا ہے۔ (میرے اندازے کے مطابق) معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔

''چلیں سر جو کچھ ہوگا سامنے آہی جائے گا'' اس نے بنا سگریٹ سلگائے ہوئے کہا۔

''سر میں نوید کو چیک کروں؟''

''بالکل مجھے اس کے متعلق پوری رپورٹ چاہیے۔''

وہ چلا گیا اور میں ضروری کاغذات نمٹانے میں مصروف ہوگیا۔

میں صبیحہ کا انٹرویو بھی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ شروع میں اپنے جس نظریے کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق کمرے کا پچھلا دروازہ کھولنا خود صبیحہ کا کارنامہ ہو سکتا تھا اور اب جو کہانی میرے علم میں آئی تھی۔ اس نے تو اس بات کے امکان کو مزید بڑھا دیا تھا۔

قارئین آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ گھریلو عام سی لڑکی اس طرح کا کام کیسے کر سکتی ہے۔ آپ کی حیرت بجا سہی۔ لیکن ہم پولیس والوں کے لیے ایسی باتیں عجیب اور انہونی نہیں ہوتیں۔ کہتے ہیں محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ اس بات کے متعلق ٹیپو سلطان سے کسی نے پوچھا تھا تو اس نے کہا تھا کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہونا چاہیے۔ بہرطور میں محبت اور جنگ کے فلسفے پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ ورنہ آپ ہی کہیں گے کہ یہ تھانے دار سٹھیا گیا ہے۔ ویسے بھی سیانے کہہ گئے ہیں کہ جس چیز یا بات کے متعلق زیادہ تجربہ یا علم نہ ہو اس پر بحث نہیں کرنی چاہیے۔

آپ آگے کی کہانی سنیے۔ اس دن اس کیس کے سلسلے میں مزید کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

اگلے دن تقریباً دس بجے اے ایس آئی میرے کمرے میں داخل ہوا اس نے مجھے رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔

''سر نوید کی حالت تو بہت بری ہے۔''

''کیوں بھئی کیا ہوا ہے اسے۔'' میں نے کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وہ قصبے میں موجود ایک ٹیلے پر رہتا ہے اور ہر وقت بھنگ اور چرس کے نشے میں دھت رہتا ہے۔ اس سے کوئی بات معلوم کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔''

''اوہ ویری سیڈ۔'' میں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں سر' نوید کے والدین سے بات کرنا ضروری ہوگیا ہے۔'' رانا تنویر نے سگریٹ کی ڈبیا سے نیا سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ شخص سگریٹ کے دھوئیں میں اپنے پھیپھڑے پھونک دے گا۔

''تم ایسا کرو کہ نوید کے والد کو تھانے بلوالو۔''

''ٹھیک ہے سر' میں ابھی کسی سپاہی کو بھیجتا ہوں۔ اس کا گھر تو مجھے پتا چل چکا ہے۔''

تقریباً ایک گھنٹے بعد ایک باریش شخص ہمارے سامنے تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے لگایا کہ وہ اپنی زندگی کی ساٹھ بہاریں اور خزائیں دیکھ چکا ہے۔ اس عمر میں بھی اس کی صحت قابل رشک تھی۔ اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ لیکن لگتا یوں تھا جیسے قبل از وقت سفید ہوگئے ہوں۔

ہم نے اسے بٹھایا اور اس سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کیا۔

''بزرگو آپ کو پتا چل چکا ہوگا کہ آپ کو کس سلسلے میں زحمت دی گئی ہے۔''

''تھانے دار صاحب' جو واردات ہوئی ہے اس سلسلے میں پہلا شک تو ہم پر ہی کیا جائے گا۔'' اس نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

''پھر ہمارا شک کیسے رفع کریں گے۔'' رانا تنویر نے اس بار اسے مخاطب کیا۔

''میں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں صبیحہ کے والدین کو دھمکی ضرور دی تھی لیکن غصے میں انسان ایسی باتیں کر ہی جاتا ہے۔ مگر اس کو عملی جامہ تو نہیں پہنایا جا سکتا۔'' اس نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ کے بیٹے کی حالت دیکھ کر شک پکا ہو جاتا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے نظریں نہیں چرائیں۔ بلکہ بڑے جوش سے بولا۔ ''آپ مجھے حوالات میں بند کر دیں۔ اور اس وقت تک بند رکھیں جب تک آپ کا اطمینان نہ ہو جائے۔'' مجھے وہ بے داغ لگا۔ لیکن پوری طرح ہمارا شک رفع نہیں ہوا تھا۔ ہم نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اطمینان سے سوچ لے۔ تین دن بعد ہم اسے بلائیں گے۔ اس کے بعد ہم نے اپنے مخبروں سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔

مخبروں کی طرف سے ابھی کوئی رپورٹ نہیں آئی تھی کہ ایک ایک اور اطلاع آگئی دو راہگیروں نے اطلاع دی کہ جنگل میں ایک لاش پڑی ہے۔ اس جنگل کا ذکر میری تفتیشی کہانی ''زرگزیدہ'' میں آچکا ہے۔

یہ سہ پہر کی بات تھی۔ میں نے دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور جائے واردات پر پہنچ گیا۔

یہ جگہ عام راستے سے ہٹ کر تھی۔ عام راستے سے

اس کا فاصلہ پچاس ساٹھ گز ضرور رہا ہوگا۔ جگہ نشیب میں تھی۔ عام طور پر کسی کی نظر نہیں پڑسکتی تھی۔

یہ لاش بھی اس طرح نظروں میں آئی تھی کہ ایک راہگیر کو پیشاب آیا تھا اور وہ نشیب میں اتر گیا تھا۔

لاش دائیں پہلو کے بل پڑی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا کمانی دار چاقو دستے تک اس کے سینے میں پیوست تھا۔ جگہ کچی تھی کئی روز سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ کھروں کے نشان واضح تھے۔ دو کھرے تو راہگیروں کے تھے ایک یقیناً مقتول کا تھا۔ اس کے علاوہ ایک کھرا اور تھا۔ جو واپس جنگل کی جنوب کی طرف چلا گیا تھا۔ میں نے سپاہی کو کہہ کر ان کی تصویر بنالیں ساتھ ہی لاش کی تصویریں بھی بنوالیں۔

پھر میں اور سپاہی سردار واپس تھانے آگئے۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بجھوادی۔ ایک سپاہی لاش کے ساتھ گیا تھا۔ جو دونوں راہگیر ہمارے ساتھ آئے تھے ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں جانے کی اجازت دے دی۔

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا ہوں۔ مجھے جائے واردات سے ایک سونے کی انگوٹھی ملی تھی۔ جو میں نے جیب میں ڈال لی تھی۔ اب ہم نے آرام سے نہیں بیٹھنا تھا۔ فوری حل طلب مسئلہ تو لاش اور انگوٹھی کی شناخت کا تھا۔

میں نے اور اے ایس آئی رانا نے مقتول کی تصویروں کے آٹھ دس پرنٹ بنوا کر قریبی تھانوں میں بجھوا دیے۔ صبیحہ کے باپ کو بلوا کر انگوٹھی کی شناخت بھی کروالی۔ اس نے بتایا کہ جہیز کے زیور میں یہ انگوٹھی موجود تھی۔

فی الحال ہم اسے انگوٹھی نہیں دے سکتے تھے۔

ان کاموں کو نمٹاتے نمٹاتے رات کے گیارہ بج گئے۔ میں اور رانا آرام کرنے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اگلی صبح جب میں اپنے کمرے میں بیٹھ چکا تو مجھے بتایا گیا کہ صبح سے چار بندے میرے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

میں نے اطلاع لانے والے سپاہی سے کہا۔

”انہیں بھیج دو۔“ چند لمحوں بعد وہ بندے میرے سامنے تھے۔

ان کے حلیوں سے لگتا تھا کہ وہ کافی دور سے پیدل آئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ دس میل دور ایک گاؤں سے آئے ہیں۔ یہ گاؤں ہمارے تھانے کی حدود میں نہیں آتا تھا۔ ان چاروں میں ایک مقتول کا والد تھا۔ مقتول کا نام انہوں نے سلیم بتایا۔

وہ دراصل اپنے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانے گاؤں کے متعلقہ تھانے میں گئے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہی ہماری بھیجی ہوئی تصویر اس تھانے میں پہنچی تھی۔

میں نے انہیں بٹھایا اور سلیم (مقتول) کے باپ سے پوچھا۔

”سلیم کب لاپتا ہوا تھا؟“

”جناب اتوار کے دن۔“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

اتوار کی رات واردات ہوئی تھی اور لاش کی حالت دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس بندے کو سوموار کو قتل کیا گیا ہے۔ اصل بات تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے بتانی تھی۔

مقتول کے باپ سے کافی باتیں ہوئیں۔ لیکن کام کی کوئی بات معلوم نہ ہوسکی۔ نہ ہی وہ اس بات کا جواب دے سکا کہ اس کا بیٹا جنگل میں کیا کررہا تھا۔

ان سے ہم نے دوپہر کے بعد آنے کا کہا امید یہی تھی کہ لاش پوسٹ مارٹم کے بعد دوپہر تک آجاتی۔

کچھ دیر کے بعد رانا تنویر آگیا۔ اس نے بتایا۔

سر مخبروں کی رپورٹ کے مطابق صبیحہ اور نوید میں شیریں فرہاد والی محبت ہے۔ صبیحہ کے متعلق یہ بھی پتا چلا ہے کہ اسے بھولنے کی بیماری ہے لیکن اپنی محبت وہ بھولی نہیں ہے۔ ایک مخبر عورت نے جس کا صبیحہ کے گھر میں آنا جانا ہے یہاں تک بتایا کہ صبیحہ نے کہا ہے وہ زہر کھالے گی لیکن نوید کے علاوہ کسی کی دلہن نہیں بنے گی۔

”رانا صاحب یہاں تک بات ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی ایک واردات اور ہوگئی ہے۔“ پھر میں نے اسے نئی واردات کے متعلق بتایا۔

”سر، مجھے رستے میں ہی سب کچھ پتا چل گیا تھا۔ بظاہر لگتا یہی ہے کہ چوری سلیم نے کی ہے۔ جنگل میں اسے راہزنوں نے لوٹ کر قتل کردیا ہے“

”لیکن رانا صاحب اس سارے سیٹ اپ میں سلیم کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں بنتا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

”سر فی الحال کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ اگر نوید کچھ صحیح ہوتا تو؟“

”بھئی دماغ کی چولیں ہلائے دے رہا ہے۔ یہ کیس بھی۔ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی کہاں تک پہنچ گئی ہے لیکن ابھی تک کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا۔“

ہم اسی قسم کی باتیں کررہے تھے لیکن کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ اس دوران ہم نے چائے پی لی تھی۔

لاش سہ پہر کو پوسٹ مارٹم کے بعد آئی۔ مقتول کا والد اور اس کے گاؤں کے لوگ آئے بیٹھے تھے وہ لاش لے کر چلے گئے اور میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔

رپورٹ کے مطابق مقتول کو صبح پانچ اور چھ بجے کے درمیان قتل کیا گیا تھا۔ یہ سوموار کی صبح تھی۔ قتل کا باعث وہی کمانی دار چاقو ہی تھا۔ جو لاش کے سینے میں دستے تک پیوست تھا۔ معائنے کے دوران میں نے چاقو نکال لیا تھا اور اسے بھی لاش کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ ظاہر ہے اب چاقو بھی لاش کے ساتھ واپس آگیا تھا اور اخبار میں لپٹا ہوا میرے سامنے پڑا تھا۔

میں نے اسے اخبار سے نکالا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا اور بڑا خوب صورت تھا۔

مجھے اطلاع مل چکی تھی کہ مقتول کے تھانے کا اے ایس آئی آیا بیٹھا ہے وہ رانا تنویر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ سلیم کے قتل کی تفتیش اب دو تھانوں نے کرنی تھی۔

میں آپ کو قانونی پیچیدگیوں میں نہیں الجھانا چاہتا۔ نہ ابھی یہ بتاؤں گا کہ اس تھانے نے کیا کیا تھا۔ صرف کہانی سناؤں گا۔ تاکہ نہ تو آپ کا ذہن الجھے اور نہ پرچے کے قیمتی صفحات ضائع ہوں۔

میں نے چاقو کا اچھی طرح جائزہ لے کر اسے دوبارہ دراز میں رکھ دیا۔ کچھ دیر کے بعد رانا تنویر نے آکر مجھے بتایا کہ وہ اے ایس آئی کے ساتھ تفتیش کے لیے جانا چاہتا ہے۔ سلیم کے گاؤں۔

میں نے اخبار میں لپٹا چاقو اس کے حوالے کرتے ہوئے جانے کی اجازت دے دی۔ اسے پتا تھا کہ چاقو کا کیا کرنا ہے۔ اب اسے کل ہی آنا تھا۔

میں نے سپاہی کو بھیج کر نوید اور صبیحہ کے والد کو

بلایا۔ میں نے سپاہی کو تاکید کردی تھی کہ دونوں کو کانسٹیبل سلطان محمود کی بیرک میں بٹھانا ہے اور پھر باری باری میرے پاس بھیجنا ہے۔ کانسٹیبل سلطان محمود کے متعلق بتادوں کہ وہ مجھ سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گیا ہوا تھا۔ اس کی بیوی بیمار تھی۔

پہلے میرے پاس نوید کے والد کو لایا گیا۔ حالانکہ اس پر یا اس کے بیٹے پر مجھے شک زیادہ نہیں تھا لیکن میں اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ مجھے کسی سراغ کی تلاش تھی۔

"تھانے دار صاحب آپ مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں۔ میں پہلے ہی بیٹے کی وجہ سے کافی پریشان ہوں۔" اس نے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی شکایتی لہجے میں احتجاج کیا۔

"بزرگو اتنی بڑی واردات ہوگئی ہے۔ ہم متعلقہ بندوں سے پوچھ گچھ نہیں کریں گے تو......!" میں نے خشک لہجے میں کہتے ہوئے فقرہ دانستہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"جناب میرے بیٹے کی حالت تو آپ نے دیکھی ہوگی یا آپ کو بتائی گئی ہوگی۔ مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کا اے ایس آئی اور دو سپاہی اس ٹیلے کے کئی چکر لگا چکے ہیں جہاں وہ بدبخت رہتا ہے۔" وہ کافی باخبر لگتا تھا۔

"اس بات کو آپ چھوڑیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں یا کیا نہیں کر رہے۔ آپ یہ بتادیں کہ سلیم کا آپ کے یا آپ کے بیٹے کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ ہے۔"

"کون سلیم، تھانے دار صاحب۔" اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ "یہ میں نے نوٹ کیا کہ اس کی حیرت میں اداکاری نہیں تھی۔ پھر میں نے سلیم کے متعلق اسے بتادیا۔

"نہیں جناب میں نے یہ نام پہلی بار سنا ہے۔"

"اچھا اس بات کو چھوڑیں آپ اپنے بیٹے کو گھر کیوں نہیں لے آتے۔" میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

وہ ایک دکھی باپ لگتا تھا۔

"تھانے دار صاحب میں نے دو تین بار کوشش کی تھی لیکن وہ گھر کا نام سنتے ہی طیش میں آجاتا ہے اور اول فول بکنے لگتا ہے۔ چاروناچار ہم نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر آنکھوں سے بہتے موتیوں کو اس میں جذب کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے رخصت کردیا۔

کچھ دیر کے بعد صبیحہ کا باپ میرے سامنے موجود تھا۔ سپاہی نے میرے کان میں آکر بتا دیا تھا کہ دونوں نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی تھی۔

ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ دونوں کی اپنی اپنی مجبوریاں تھیں۔

بہرحال دونوں دکھی تھے اولاد نے انہیں اس مقام تک پہنچادیا تھا۔ میں نے پہلے تو صبیحہ کے باپ کو تسلی دلاسہ دیا پھر جب میں نے اس سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مضطرب ہو۔ کوئی بات بتانا چاہتا ہوں لیکن بات بتانے کے لیے یا تو اس کے پاس الفاظ نہ ہوں یا وہ بتاتے ہوئے ہچکچا رہا ہو۔

"دیکھیں بزرگوار جو بات آپ کے دل میں ہے اسے اگل دیں۔" میں نے لہجے کو حتیٰ الامکان نرم رکھتے ہوئے کہا۔

"تھانے دار صاحب میں تو عجیب الجھن میں پھنس گیا ہوں۔ پہلے ہی جہیز کی چوری کی وجہ سے دماغ ماؤف ہے اب پرویز......!" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پرویز کو کیا ہوگیا ہے۔" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ خط پڑھ لیں۔" اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔

میں نے لفافے سے خط نکال کر اپنے سامنے میز پر پھیلایا۔ جوں جوں میں یہ خط پڑھتا جاتا تھا میری آنکھیں پھیلتی جاتی تھیں۔

خط پڑھ کر اس کیس کا ایک رخ حل ہوتا نظر آرہا تھا۔ میں نے خط دوبارہ لفافے میں ڈال کر سائڈ پر رکھ دیا اور صبیحہ کے باپ سے کہا۔

"یہ خط فی الحال میرے پاس رہنے دیں۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ نے جہیز کی چوری کے متعلق اپنے بیٹے کو خط لکھ دیا ہے یا نہیں؟"

"تھانے دار صاحب میں نے ابھی اسے خط نہیں لکھا میں اسے پردیس میں پریشان کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن اب!" اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"بالکل اب اسے خط لکھ کر بتادیں۔"

"تھانے دار صاحب......اب میں کیا کروں۔ لڑکے والوں نے منگنی توڑنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ دراصل وہ یعنی صبیحہ کی ممانی ذرا لالچی طبیعت کی مالک ہے اور اس کا بیٹا اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔

"یہ آپ کا گھریلو معاملہ ہے۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ جو بھی فیصلہ کرنا ہے سوچ سمجھ کر کریں۔"

"میں تو اس سلسلے میں مجبور ہوں۔"

"خیر جو ہوگا ان شاءاللہ آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔"

پھر میں نے اسے رخصت کردیا اور خط کو اپنی میز کی دراز میں رکھ لیا۔

قارئین خط کے مضمون کے متعلق میں ابھی نہیں بتاؤں گا۔ آگے اس کا ذکر آئے گا۔ اب مجھے رانا تنویر کا انتظار تھا۔ مجھے اس کی ذہانت پر پورا بھروسا تھا' اعتماد تھا کہ وہ اس کیس کے دوسرے رخ سے بھی پردے اٹھا کے آئے گا۔

اگلے دن رانا تنویر سے ملاقات دن کے تقریباً تین بجے ہوئی۔ پہلے ہم نے چائے پی۔ پھر اس کیس کے متعلق بات چل پڑی۔

"سر چاقو کی شناخت ہوگئی ہے۔"

"کس کا ہے چاقو؟" میں نے اچھلتے ہوئے کہا۔

"قوی کا......یہ سربستہ ب کا بدمعاش ہے اور آج کل روپوش ہے۔"

"روپوش ہے۔" میں نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر سوری تقریباً ایک ہفتے سے اس کے متعلق رپورٹ ہے کہ وہ منظر سے غائب ہے۔ میں اس کی طرف توجہ دینے ہی والا تھا کہ یہ چرخہ چل پڑا۔

"خیر اب اسے ہر صورت میں تلاش کرو۔" میں نے اس بار ذرا نرم لہجے میں کہا۔

اس بات سے تو آپ لاعلم نہیں ہوں گے کہ علاقے کے بستہ ب بدمعاشوں کو ہم نے پابند کیا ہوتا تھا کہ وہ تھانے میں اطلاع دیے بغیر کہیں نہ جائیں اور ہر دوسرے دن تھانے میں حاضری ضرور لگوائیں۔ یہ ہمارے دور کی بات ہے۔ آج کل کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

"سلیم کے متعلق فی الحال زیادہ کچھ پتا نہیں چل سکا اور نہ ہی اس سارے سیٹ اپ میں اس کا کردار

واضح ہو رہا ہے۔" رانا تنویر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

البتہ اس نے سگریٹ کا کش لینے کے لیے توقف کیا۔ پھر دوبارہ گویا ہوا۔

"سر سلیم (مقتول) کے متعلق ایک اطلاع یہ ملی ہے کہ وہ مختلف آوازوں کی نقل بڑی مہارت سے کرتا تھا۔"

"ویری گڈ پھر تو مسئلہ ہی حل ہوگیا۔" میں نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا۔

"کون سا مسئلہ سر۔" اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"پہلے تم یہ خط پڑھ لو۔" میں نے صبیحہ کے باپ کے لائے ہوئے خط کو میز کی دراز سے نکالتے ہوئے اس کے سامنے رکھ دیا۔

خط پڑھ کر اس کی آنکھوں میں بھی دبا دبا جوش ظاہر ہونے لگا۔

کیس کی کڑیاں ملنی شروع ہوگئی تھیں۔ صرف دو تین کڑیاں ڈھونڈنی تھیں۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کردوں کہ میں نے صبیحہ کے باپ سے صبیحہ کی طبیعت کے متعلق پوچھا تھا۔ اس نے کہا تھا اب کافی بہتر ہے۔

شام ہو چکی تھی۔ ہم نے تھانے کا انتظام ایک سینئر کانسٹیبل کے حوالے کیا اور خود صبیحہ کے گھر جا پہنچے۔ ہم سادہ کپڑوں میں تھے۔ صبیحہ کے باپ نے ہمیں کمرے میں بٹھایا اور ہماری خاطر تواضع کے لیے جانے لگا۔ تو میں نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کسی قسم کا تکلف نہ کریں۔ صبیحہ کو ہمارے پاس بھیج دیں اور آپ ذرا باہر ہی رہیں۔

ہمیں پانچ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ پھر ہمارے سامنے ایک ایسی لڑکی آئی جو واقعی چاند کا ٹکڑا تھی۔ عمر اس کی بیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ بڑی بڑی آنکھیں، گول چہرہ اور پھولوں سے نازک ہونٹ ہم نے پہلے اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اس کا ذہن اپنے قبضے میں کیا۔ پھر میں نے اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں تمہارے جہیز کی چوری کا بہت دکھ ہے۔ ہم اسی سلسلے میں یہ ساری تگ و دو کر رہے ہیں۔ تم ہم سے کوئی بات نہ چھپاؤ۔"

"تھانے دار صاحب اچھا ہی ہوا یہ جہیز چوری ہوگیا۔" اس نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب۔" میں نے اسے گھورا۔

"آپ قانون کے محافظ ہیں۔ آپ کوئی ایسا قانون نہیں بنوا سکتے کہ بچوں کی منگنی بچپن میں نہ کی جائے۔ اس سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے تمہیں ماموں زاد پسند نہیں ہے۔" رانا تنویر نے اچانک اس سے سوال کردیا۔

"میری ممانی اول درجے کی کینہ پرور اور لالچی ہے ماموں جان کو اس نے موم کی ناک بنایا ہوا ہے۔ اب یہی بات دیکھیں کہ چونکہ میرا جہیز چوری ہوگیا ہے اس لیے انہوں نے منگنی توڑنے کی دھمکی دے دی ہے۔ اس سے پہلے تو وہ مجھے اپنی بہو بنانے کے لیے مری جا رہی تھی۔" صبیحہ نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ باتیں تو ہمیں معلوم ہو چکی تھیں ہم تو اسے کسی اور بات کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ اس لیے میں نے اصل بات اگلوانے کے لیے اس کی ذات پر حملہ کردیا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ جہیز کی چوری میں تمہاری مرضی اور منشا شامل ہے تو تم اس بابت کیا کہو گی۔"

اچانک اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ غصے سے لال سرخ ہوگیا۔ چند لمحے وہ اپنی مٹھیاں بھینچتی رہی۔ پھر جوش بھرے لہجے میں بولی۔

"تھانے دار صاحب میرے جیسی لڑکیاں دقیانوسی رسموں، رواجوں اور جھوٹی اناؤں پر ساری عمر کڑھ تو سکتی ہیں لیکن اتنا بڑا اقدام نہیں اٹھا سکتیں۔ یہی حال نوید کا ہے۔ ہم دونوں بزدل ہیں۔ تھانے دار صاحب!" اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

لگتا تھا وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔

ہم نے اسے رونے دیا۔ جس اسٹیج پر ہم اسے لانا چاہتے تھے۔ وہ اس اسٹیج پر آ گئی تھی۔ پرویز کے خط نے ہم پر بہت کچھ واضح کردیا تھا۔ سلیم مر چکا تھا یعنی قتل ہو چکا تھا۔ اب واردات کے متعلق صرف صبیحہ ہی بتا سکتی تھی۔

جب اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا تو میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میں نے تمہارے سر پر ہاتھ رکھ کر تمہیں اپنی بہن بنا لیا ہے۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ صرف اتنا بتا دو کہ واقعہ کس طرح ہوا تھا۔

"اس رات میں بے خبر سو رہی تھی اچانک پچھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دستک دوبارہ ہوئی میں ڈر گئی ابھی میں بھاگ کر امی ابو کے کمرے کی طرف جانے ہی والی تھی کہ باہر سے آواز آئی۔

"میں ہوں تمہارا نوید ذرا دروازہ کھولو، تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میں کل ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے جا رہا ہوں۔" میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ نوید میرا محبوب ہے۔ میں اسے سمجھانا چاہتی تھی کہ وہ اپنے ارادے کو بدل دے لیکن تھانے دار صاحب وہ تو کوئی اور تھا۔ میرے لیے بالکل اجنبی اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ جس نے اپنی شکل کالی چادر میں چھپائی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ کچھ سوچتی سمجھتی اجنبی نے میری ناک پر کوئی چیز رکھ دی۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

اب ہمارا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ ہم اسے تسلی دلاسے دے کر واپس تھانے آ گئے۔

قارئین آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ سلیم تھا۔ آوازوں کا نقال دوسرا آدمی کون تھا۔ اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ لیکن ہمارا شک بستہ ب بدمعاش قومی پر تھا۔ اس کا اصل نام تو عبدالقیوم تھا لیکن اپنے حلقہ احباب میں قومی کہلاتا تھا۔ اب قومی کا ہاتھ لگنا بہت ضروری ہوگیا تھا۔ وہ بنتا تو بہت کائیاں تھا لیکن اپنا چاقو لاش کے سینے میں چھوڑنا حماقت ہی تھی۔ چاقو کی شناخت ایک مخبر نے کی تھی۔ وہی مخبر اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ دوسری صبح ابھی مجھے اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ میری میز پر رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

ریسیور اٹھانے پر پتا چلا کہ سلیم (مقتول) کے گاؤں کے متعلقہ تھانے سے فون ہے۔

"ہاں جی گھمن صاحب کیا حال چال ہے۔"

"خدا کے فضل و کرم اور آپ کی دعاؤں سے یہ بندہ ناچیز بالکل ٹھیک ٹھاک ہے آپ اپنی سنائیں۔ خالد صاحب۔"

"یہاں بھی سب خیریت ہے کہیے کیسے یاد کیا؟"

"ٹیلی فون پر اتنی لمبی چوڑی بات نہیں ہوسکتی۔

آپ اپنے اے ایس آئی کو بھیج دیں۔ دوسری طرف سے گھمن صاحب نے جواب دیا۔

''میں خود آرہا ہوں۔ آپ انتظار کریں۔'' میں نے اتنا کہتے ہوئے ریسیور کریڈل کردیا۔ دراصل میں خود بھی خط لے کر وہاں جانا چاہتا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں اور سپاہی سردار چلنے کے لیے تیار ہوگئے۔ جانے سے پہلے میں نے اے ایس آئی رانا تنویر کو کچھ ضروری ہدایات دے دی تھیں۔

جب ہم وہاں پہنچے تو گھمن صاحب نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا۔

اور ہمارے منع کرنے کے باوجود پرتکلف چائے سے ہماری خاطر مدارات کی۔ پھر وہ بولا۔

''اپنے سپاہی کو ادھر ہی رہنے دیں۔ آیئے میں آپ کو قاتل سے ملواؤں۔''

''قاتل سے؟'' میں نے اچھلتے ہوئے کہا۔

پھر وہ مجھے حوالات کی طرف لے گیا۔ وہاں قومی سے ملاقات ہوگئی۔

''اوہ آخر تم شکنجے میں آ ہی گئے۔'' میں نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی کافی خاطر مدارات ہوئی ہے۔

''آیئے اب آپ کو اس کے کرتوتوں سے آگاہ کروں۔'' وہ مجھے دوبارہ اپنے دفتر لے گیا پھر اس نے مجھے ساری صورت حال سے آگاہ کردیا۔

میں نے پرویز کی طرف سے بھیجا ہوا خط اس کی طرف بڑھادیا۔

لیجیے قارئین آپ کو بھی خط کے مضمون سے آگاہ کردوں۔

محترم ابا جان!

السلام علیکم۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ صبیحہ کا کیا حال ہے؟ امی کے گھٹنوں کا درد ختم ہوا ہے یا نہیں؟ چند دنوں بعد میں دوائیں بھیجوں گا یہ باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ آج میں آپ کو اپنے ایک راز سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا راز یہ ہے کہ یہاں آنے سے پہلے میں ایک جواری تھا۔ میں اپنے علاقے سے دور جوا کھیلتا تھا۔ اس لیے آپ اس بات سے لاعلم رہے آگے سلیم کے گاؤں اور وہاں موجود ایک جوئے کے اڈے کا ذکر تھا۔ ایک دفعہ ایک جوان میرے آگے کافی رقم ہار گیا۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ابھی جانا نہیں میں ابھی آتا ہوں۔ کچھ دیر کے بعد وہ دوبارہ آگیا۔ اس بار وہ زیور لے کر آیا تھا۔ میں نے زیور پر کبھی جوا نہیں کھیلا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ زیور واپس لے جاؤ لیکن وہ نہیں مانا آخر مجھے زیور پر جوا کھیلنا پڑا۔ وہ زیور بھی ہار گیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ زیور اس کی بہن کا تھا۔ لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ اس وقت تک میں نے زیور بیچ دیا تھا اور پیسے اڑا چکا تھا۔ ایک دن وہ جوان (جس کا نام سلیم تھا) مجھے ملا اور بولا۔ مجھے زیور دے دو میں تمہیں پیسے دوں گا۔ صرف چار ماہ میں میری بہن کی شادی سر پر ہے مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں۔ پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کردیا۔ غلطی اس کی تھی۔ وہی زیور لے کر آیا تھا۔ اور مجھے کھیلنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ اس وقت پاگل ہوگیا تھا۔ مجھے دھمکی دی تھی اگر میں نہ کھیلتا تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ جاتے جاتے وہ مجھے دھمکی

دے گیا کہ اگر اس کی بہن کی شادی نہ ہوئی تو...... ابا جان نہ جانے مجھے یہ کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ سلیم ضرور کوئی حرکت کرے گا۔ آپ زیور اور باقی جہیز کو کڑی نگرانی میں رکھیے گا۔ شادی تک تو میں آ بھی جاؤں گا مجھے معاف کردیجیے گا۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوگیا ہوں۔ آگے کچھ ذاتی باتیں لکھی تھیں جن کا ذکر ضروری نہیں ہے۔

اب ان باتوں کا ذکر ہوجائے۔ جو گھمن صاحب نے بتائی تھیں۔ جب اے ایس آئی رانا تنویر یہاں آیا تھا تو اس نے گھمن صاحب کو عبدالقیوم عرف قومی کا حلیہ بتادیا تھا ہمارے تھانے کا مخبر بھی میری ہدایت پر اس کی مدد کو یہاں موجود تھا۔ اسٹیشن پر وہ اور ایک سپاہی (اس تھانے کا) گھوم رہے تھے کہ اندھے کے ہاتھ بیر لگنے والی بات ہوگئی۔ قومی انہیں وہاں نظر آ گیا۔ دراصل مخبر کو اطلاع مل چکی تھی کہ قومی یہاں آیا ہے۔ اسٹیشن کے باہر دو تین سپاہی اور بھی موجود تھے۔ انہوں نے مل کر قومی کو قابو کیا اور اسے لے کر تھانے آ گئے۔

قومی نے بتایا کہ سلیم اس کا دوست تھا۔ اس نے اپنے متعلق قومی کو بتایا ہوا تھا۔ بہن کے زیور کے متعلق بھی بتایا تھا ادھر قومی کو پتا چل چکا تھا کہ پرویز کی بہن صبیحہ کی شادی ہونے والی ہے۔ صبیحہ کے گھر کام کرنے والی ایک عورت اس کی داشتہ تھی۔ ساری معلومات اس نے مہیا کی تھی۔ سلیم اور قومی نے مل کر جہیز کی چوری کا منصوبہ بنایا۔

واردات کے متعلق آپ کے علم میں آچکا ہے۔ دونوں نے واردات کے بعد جنگل سے گزرنا تھا۔ جب دونوں جنگل سے گزر رہے تھے تو قومی کی نیت خراب ہوگئی۔ حالانکہ چالیس ہزار روپے سلیم نے اسے دیے تھے۔ اسے صرف زیور سے غرض تھی۔ لیکن لالچ نے قومی کی آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی باندھ دی اور اس نے سلیم کو قابو کر کے اس کے سینے میں اپنا چاقو اتار دیا۔ وہ پورا استاد اور سلیم کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور تھا۔ اس نے حماقت یہ کی کہ اپنا چاقو لاش کے سینے میں ہی رہنے دیا۔

چھینا جھپٹی میں ایک انگوٹھی جائے واردات پر گر گئی تھی۔ جو ہمارے ہاتھ لگی تھی۔

اب آخر میں جاتے جاتے صبیحہ کے متعلق بات ہوجائے صبیحہ کے ماموں اور ممانی نے منگنی (اس دوران) منگنی توڑ دی تھی۔

تقریباً دو ماہ بعد نوید اور صبیحہ کی شادی ہوگئی۔

صبیحہ نے مجھے اور رانا کو بھی مدعو کیا تھا۔ ہم شادی میں شریک ہوئے تھے۔ نوید کو دیکھ کر رانا نے کہا تھا۔

''سر یہ تو پہچانا نہیں جا رہا۔ واقعی پیار انسان کو انسان بنادیتا ہے۔''

اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ بات بالکل سچ ہے جوڑے آسمان پر بنتے ہیں اور اس طرح بھی ملاپ ہوتا ہے اور اس قسم کے واقعات سیڑھی بن جاتے ہیں۔

قسط نمبر 12

گردش

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن، زر، زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر چکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کر دی ہے۔

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری، بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی دلکش و دلچسپ سلسلے وار کہانی

سلمان میرے نزدیک آ رہا تھا اور میں اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ آخر یہ شخص اس کوٹھی میں رہتا ہے تو آج تک میں نے اسے دیکھا کیوں نہیں، پھر خیال آیا کہ اتنی وسیع و عریض کوٹھی ہے میں تو اس کے سارے حصوں سے واقف بھی نہیں ہوں۔ میری آمد و رفت بہت محدود حصوں تک ہے اور بلا ضرورت کسی کو یہاں کہیں آنے جانے کی اجازت بھی نہیں ہے، تو رہتا ہوگا یہ بھی کسی حصے میں۔

میری نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں، میں نے دیکھا کہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی، وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں، لیکن ان میں کسی چیتے کی آنکھوں جیسی چمک تھی، ایسی چمک جیسے اپنے شکار کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آتی ہے۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا تو جواباً میں بھی دوستانہ انداز میں مسکرانے لگا، وہ مختصر اور منحنی جسم کا مالک تھا، میرے نزدیک آیا اور بولا۔

”تم میرے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“

”ہاں آج سے پہلے میں نے تمہیں یہاں دیکھا جو نہیں ہے، اس لیے تمہارے متعلق پوچھ رہا تھا۔“ میں نے نارمل انداز میں کہا۔

”تو پتا چل گیا کہ میں کون ہوں۔“ اس نے بدستور میری آنکھوں میں دیکھتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں!“ میں نے مختصر جواب دیا۔

اس نے اچانک میرا ہاتھ تھام لیا اور گارڈ سے دور ہٹتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ دوسری جانب لے کر چل دیا۔

مجھے اس کی یہ بات بڑی عجیب سی لگی، لیکن میں نے کچھ کہا نہیں۔ تھوڑا دور ہٹ کر وہ رک گیا اور میرے چہرے کی جانب غور سے دیکھنے لگا، اس کے لبوں پر دوسرے کو چڑانے والی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس کی تیز آنکھیں کسی نیزے کی انی کی مانند مجھے اپنے دماغ میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

میرا دل چاہا کہ اس کے مختصر اور منحنی وجود پر ایک زور کی پھونک مار دوں تا کہ وہ اڑتا ہوا دور جا گرے۔ یہ میری جانب اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے.....! وہ مجھ سے قد اور جسامت دونوں میں بہت چھوٹا تھا، لیکن اس کی عمر یقیناً مجھ سے زیادہ ہی تھی۔

اچانک اس نے میرا بازو سختی سے تھام لیا کہ اس کی لمبی اور پتلی انگلیاں مجھے اپنے بازو میں گڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنی جانب قدرے جھکایا اور تیز سرگوشی میں پوچھا۔

”فلیٹ تم نے کس کے لیے کرائے پر حاصل کیا ہے......؟“ اس کے لبوں پر وہی خبیث سی مسکراہٹ اب بھی موجود تھی۔

اس کا یہ غیر متوقع سوال سن کر میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ فوری طور پر میرے دماغ نے جیسے کام کرنا ہی بند کر دیا، مگر پھر میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا کہ جو ایسے نازک موقعوں پر اپنے حواس چھوڑ دے وہ شہروز ہی نہیں، اور فوراً ہی میرے دماغ میں راکھی کا جملہ گونجنے لگا، اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں ہر شخص کی نگرانی کی جاتی ہے، میں بھی کسی کی نگرانی کر رہی ہوں اور کوئی میری، لیکن یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہوتی کہ کون کس کی نگرانی کر رہا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں اس کوٹھی میں، میں بھی آزاد نہیں ہوں۔ یہ ”چھوٹی دنیا“ میری نگرانی پر مامور ہے۔

اس کے سوال کا جواب دینے سے پیشتر میں نے بھی ڈرامائی انداز میں اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں اور اپنے لبوں پر ایک پراسراری مسکراہٹ سجاتے ہوئے پہلے تو نرمی سے اس کے ہاتھ کی گرفت سے اپنا بازو چھڑایا اور سیدھا کھڑے ہو کر اپنا کالر جھٹکا اور از راہ تفنن کہا۔

”آئی سی...... تو میری نگرانی پر یہ ”چھوٹی دنیا“ مامور ہے۔“

”شٹ اپ!“ اپنے دیئے جانے والے خطاب کو سن کر وہ تلملا گیا۔

”یو شٹ اپ!“ میں نے غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ ”تم کون ہوتے ہو مجھ سے یہ سوال کرنے والے...... میں کوئی فلیٹ خریدوں یا کرائے پر لوں یہ میرا معاملہ ہے، تمہیں مجھ سے یہ سوال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

میرے اس طرح کے ردعمل سے وہ بھونچکا سا رہ گیا اور لمحہ بھر کو میں نے اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار دیکھے، پھر بولا۔

”کیا تمہیں اس بات کا علم تھا کہ تمہاری نگرانی کی جا رہی ہے۔“

”ہاں ظاہر ہے۔“ میں نے بے پروا لہجے میں کہا۔ ”یہاں سب ہی کی نگرانی ہوتی ہے، تمہاری بھی ہوتی ہوگی اور میں اپنے بارے میں یہ بات جانتا تھا اور میں نے کرائے پر فلیٹ لے کر کوئی چوری کا کام تو کیا نہیں ہے کہ میں ڈر جاؤں یا جھوٹ بولوں، تم یہ بات نواب صاحب کے علم میں لانا چاہتے ہو تو شوق سے لے آؤ، بلکہ تمہیں تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے، میں یہ بات نواب صاحب کو خود ہی بتا دوں گا۔“

وہ چند لمحوں تک میرے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے میرے جھوٹ سچ کا جائزہ لیتا رہا پھر بولا۔

”چلو یہ بات میرے علم میں آ ہی گئی ہے تو مجھے بھی بتا دو کہ تم نے وہ فلیٹ کیوں لیا ہے۔“

”تم کیا کرو گے جان کر......!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بس ایسے ہی اپنی جان کاری کے لیے پوچھ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

"یار میں جوان آدمی ہوں اور جوان آدمی کی بہت سی ضروریات ہوتی ہیں یہاں اس کوٹھی میں تو میں اپنی راتیں رنگین نہیں بنا سکتا۔ بس اسی لیے...... ویسے تم کہاں سمجھو گے ان معاملوں کو تم تو ویسے ہی چھوٹی دنیا ہو......!" میں نے اسے چڑانے کے لیے کہا۔

"یہ تم مجھے بار بار چھوٹی دنیا چھوٹی دنیا کیوں کہہ رہے ہو ابھی تم مجھ سے واقف نہیں ہو اس لیے کہہ رہے ہو ورنہ تو میں......!" اس نے غصے سے اچھلتے ہوئے کہا۔

"تو میری چھوٹی دنیا ذرا سیر تو کراؤ اپنی "بڑی سی دنیا" کی۔" میں نے اس کے دونوں گالوں کو اپنے ہاتھوں کی انگلیوں میں دبوچ کر تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

"کرائیں گے سیر......" اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ میرے ہاتھ پر مار کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا اور وہاں سے جانے لگا۔

"یار ذرا جلدی سیر کرانا...... میں آج کل ویسے بھی بہت بور ہو رہا ہوں۔" میں نے پیچھے سے آواز لگائی اور قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

وہ میرے سامنے سے چلتا ہوا غائب ہو گیا۔ اس کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد میرے چہرے پر فکر و تردد کی لکیریں نمایاں ہو گئیں اور میں ناشتہ کر کے دوبارہ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

سب سے پہلے میں نے سرمئی کے نیوز چینل کا نمبر اپنے ذہن میں محفوظ کیا اور پھر سرمئی کی آنے والی کال اپنے موبائل سے ڈیلیٹ کر دی اور بیٹھ کر سوچنے لگا پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میرا سرمئی سے اس کے نیوز چینل پر جا کر ملنا فی الحال مناسب نہیں ہے یہ تو قدرت نے میری مدد کر دی اور مجھے سلمان سے ملوا دیا اور اس احمق نے بھی اپنا رعب مجھ پر بٹھانے کے لیے خود اپنا پول میرے آگے کھول دیا اور مجھے ایک بہترین بہانہ بھی سوجھ لیا۔

مجھے اب فون کر کے سرمئی کو یہ بتانا ہے کہ میں اس سے ملاقات کے لیے نہیں آ سکتا۔ بلکہ میں یہ کہہ دوں گا کہ وہ خود آنٹی کو اس فلیٹ میں پہنچا دے لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ فلیٹ کی چابی تو میرے پاس ہے بس کسی طرح وہ چابی مجھے سرمئی کے حوالے کرنی ہے اور اس کا طریقہ بھی آسان تھا میں اس سے کہیں بھی ملاقات کر سکتا ہوں کسی شاپنگ سینٹر میں یا راہ چلتے ہوئے۔

میں نے چار بجنے کا انتظار کیا اس نے بتایا تھا کہ وہ چار بجے فری ہوتی ہے چار بجے وہ میرا انتظار کرے گی اور چار بجے بجائے میرے میرا فون اس کے پاس آئے گا۔

چار بج گئے تو میں نے اسی نمبر پر کال کی جس سے سرمئی کا فون میرے پاس آیا تھا وہ نمبر شاید براہ راست اس کے روم ہی کا تھا فون اسی نے اٹھایا میں نے اس کی آواز پہچان لی اور اپنا نام بتاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔

"آپ کو آج آنا تھا میرے پاس اور آپ فون کر رہے ہیں۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"آئی ایم رئیلی سوری میں آپ سے ملنے کے لیے ایک شدید مجبوری کی وجہ سے نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا۔

"اوہ! چلیں کوئی بات نہیں آپ کل آ جائیں۔" اس نے کہا۔

"نہیں میں کل بھی نہیں آ سکوں گا...... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مجھ سے فلیٹ کی چابی کسی طرح سے لے لیں اور آنٹی کو وہاں شفٹ کر دیں۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی کیا آپ مجھے کھل کر بتانا پسند کریں گے کہ آخر آپ کو ایسی کیا مجبوری ہے کہ آپ مجھ سے مل نہیں سکتے تو میں آپ سے فلیٹ کی چابی کس طرح سے حاصل کر سکوں گی۔" اس نے حسب عادت تیز لہجے میں کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ میری خاموشی کو چند لمحے گزرے تو وہ بولی۔

"ہیلو...... ہیلو مسٹر شمروز آر یو ہیئر......!"

"یا...... آئی ایم ہیئر...... بات یہ ہے محترمہ...... بس میرا آپ سے ملنا بہت ضروری ہے لیکن میری بڑی مجبوری ہے کہ میں فی الحال آپ سے نہیں مل سکتا بس یوں سمجھ لیں کہ میری نگرانی ہو رہی ہے۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہہ ہی ڈالا۔

"آپ کی نگرانی ہو رہی ہے......!" اس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔

"پلیز مجھے بتائیں کہ آپ ہیں کون......؟ کہاں ہیں؟ اور کون آپ کی نگرانی کر رہا ہے اور کیوں......؟" اس نے ایک ہی سانس میں ڈھیر سارے سوالات کر ڈالے۔

"میں آپ کو آپ کے تمام سوالوں کے جوابات ضرور دوں گا۔ بلکہ میں تو خود آپ کو بہت کچھ بتانا چاہتا ہوں لیکن اس وقت یہ ممکن نہیں ہے بہت سی باتیں ایسی ہیں جو میں آپ کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ اب آپ یہ سوچیں گی کہ آپ اور میں ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی ہیں پھر میں آپ کو وہ سب باتیں کیوں بتانا چاہوں گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ میری ذات تو آپ کے لیے اجنبی ہے لیکن آپ کی ذات میرے لیے اجنبی نہیں ہے کیونکہ میں آپ کے بارے میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ آپ ایک جرنلسٹ ہیں اور اپنے اس حوالے سے اور کچھ اپنے حوالے سے آپ کو بہت کچھ بتانا ہے ہم دونوں ہی مظلوم ہیں۔ ہم دونوں پر ظلم کرنے والا ایک ہی شخص ہے اور وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے اور میری بدقسمتی یہ ہے کہ میرے حالات نے انجانے میں مجھے اس ظالم شخص کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ڈالا ہے میں اس کا ایک عام سا کارندہ بن کر رہ گیا ہوں اور اس کے اشارے پر میں غلط قسم کے کام کر رہا ہوں اور پھر اپنے پاس اور اپنے ساتھ رکھنے کے باوجود اس شخص نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا اور میری نگرانی پر کچھ لوگوں کو مامور کر رکھا ہے اور یہ اہم بات بھی اتفاق سے آج اس وقت میرے علم میں آئی ہے جب میں آپ سے ملنے کے ارادے سے نکلنے والا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح اللہ نے میری مدد کی ہے ورنہ ہو سکتا ہے کہ میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاتا امید ہے میں نے کافی حد تک آپ کو بات سمجھا دی ہے۔" میں اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گیا اور جتنی دیر میں بولتا رہا وہ بڑی خاموشی اور توجہ سے میری بات سنتی رہی پھر بولی۔

"ہاں میں آپ کی بات کافی حد تک سمجھ چکی ہوں اور میرا خیال ہے کہ آپ کو بہت زیادہ محتاط رہنا پڑے گا رہی بات آنٹی کو فلیٹ پر پہنچانے والی تو ان کی تو آپ اب بالکل بھی فکر نہ کریں۔ وہ میرے پاس بالکل محفوظ ہیں۔ ویسے ابھی تک تو میری ان سے تفصیلی بات نہیں ہوئی ہے بلکہ میں اتنی زیادہ مصروف رہی ہوں کہ ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا ہے آپ بھی سوچیں اور میں بھی سوچتی ہوں کہ ہم کسی محفوظ طریقے سے ایک دوسرے سے ملاقات کر سکتے ہیں اور یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ آپ کی پوری بات تفصیل سے سننے کے بعد اگر میں نے بھی آپ کو مظلوم سمجھا تو اپنی ہر ممکن کوشش کروں گی کہ جس طرح بھی ہو آپ کی مدد کی جائے۔" اس

نے کہا تو اچانک میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا اور میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

''ارے ہاں سرمئی صاحبہ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے' بات ہے تو معیوب سی' لیکن اگر آپ اس کے لیے تیار ہوں تو ہم تفصیلی ملاقات کر سکتے ہیں۔''

''وہ کیا......؟''اس نے لفظ معیوب کو لے کر سخت اور تیز لہجے میں کہا۔

''مجھے اس بات کا اس طرح پتا چلا کہ میری نگرانی ہو رہی ہے۔'' باس کے ایک آدمی نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم نے کرائے پر فلیٹ کیوں لیا ہے' کیونکہ یہ بات میں نے کسی کو بھی نہیں بتائی تھی کہ میں باہر کیوں اور کس مقصد کے لیے جا رہا ہوں' اس کا مطلب یہی ہے کہ ''باس'' کا کوئی آدمی میرا پیچھا کر رہا تھا اور اس نے یہ معلوم کر لیا کہ میں نے ایک فلیٹ کرائے پر لیا ہے' تو جب اس نے مجھ سے یہی بات پوچھی تو اس کا سبب میں نے یہ بتایا کہ میں نے اپنی راتیں رنگین کرنے کے لیے وہ فلیٹ حاصل کیا ہے آپ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں۔'' میں نے رک کر اس سے پوچھا تو اس نے صرف ''ہوں'' کرنے پر ہی اکتفا کیا' تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اس فلیٹ پر آجائیں۔''

''آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے' آپ کے اس بے ہودہ مقصد کے لیے حاصل کیے گئے فلیٹ پر میں آپ سے ملنے کے لیے آؤں گی...... نو......نیور......'' اس نے بھڑک کر صاف انکار کر دیا۔

''آئی ایم سوری محترمہ......! میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا ہرگز نہیں تھا' آپ ایسا کریں کہ ایک نقاب والا برقع یا چادر میں منہ چھپا کر وہاں آجائیں اور چاہیں تو اپنے ساتھی وہ کیا نام بتایا تھا ان کا آپ نے کہ وہ بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔'' میں نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''حشام......!''اس نے کہا۔

''جی......حشام صاحب کو بھی وہاں بلالیں۔ آپ ان کے ساتھ وہاں آجائیں' میں اس کا ردعمل جاننے کے لیے خاموش ہو گیا۔ مجھے فون پر ذرا بھنبھناہٹ سنائی دی' وہ شاید اپنے ساتھ بیٹھے حشام سے کوئی مشورہ کر رہی تھی۔ پھر بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے میں حشام کے ساتھ آجاؤں گی' اب آپ مجھے ٹائم بتائیں اور اس فلیٹ کا ایڈریس بھی بتائیں۔'' اس نے اپنی رضامندی ظاہر کی تو میں خوش ہو گیا اور کہا۔

''میرے خیال میں آج رات آٹھ بجے کا ٹائم ٹھیک رہے گا' پھر میں نے اسے فلیٹ کا ایڈریس بتانے کے بعد کہا کہ میں آٹھ بجے سے پہلے فلیٹ پر موجود رہوں گا' میں آج ہی آپ سے اس لیے بھی ملاقات کرنا چاہ رہا تھا کہ میرا ''باس'' فی الحال موجود نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل یا پرسوں وہ آجائے پھر شاید آپ سے ملاقات کرنا مزید مشکل ہو سکتا ہے۔''

''او کے! جیسا اپنی سہولت سے آپ بہتر سمجھیں' بس ایک آخری بات اور......!'' اس نے آمادگی ظاہر کر کے تنبیہہ کے انداز میں آخری فقرہ ادا کیا۔

''جی فرمائیے۔'' میں نے کہا۔

''کیا میں آپ پر پورے طریقے سے یقین کر لوں کہ آپ میرے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی دھوکا نہیں کر رہے' کسی خاص آدمی کے اشارے پر مجھے ٹریپ کرنے کی کوشش نہیں کر رہے' ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ میں اور حشام جرنلزم کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کے پاس آنے سے پہلے ہم حشام کے والد طلال واحدی صاحب

کے علم میں یہ بات ضرور لائیں گے کہ ہم آپ کے کچھ خاص انفارمیشن ایک خاص آدمی کے بارے میں لینے جا رہے ہیں۔''

''جی بالکل...... مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور میرے بارے میں صرف اتنا جان لیں کہ جس کو اس کی تقدیر نے ہی بار بار دھوکے دیئے ہیں جس کا سب کچھ لوٹ لیا گیا ہو وہ کیا کسی کو دھوکا دے گا۔'' یہ بات کہتے ہوئے میرا لہجہ بھیگ گیا۔

''آئی ایم سوری شہروز صاحب ہماری فیلڈ ہی ایسی ہے کہ ہم ہر کسی پر اتنی آسانی سے بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں بھی کچھ لوگوں سے خطرہ ہوتا ہے بہت سے نقاب پوش چہرے ایسے ہیں جنہیں ہماری ذات سے خطرہ ہوتا ہے' امید ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔'' اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''بس یوں سمجھ لیں کہ میرا ''باس'' بھی ایک ایسا ہی غلیظ ترین انسان ہے جس نے اپنے مکروہ اور سیاہ چہرے پر سفید براق نقاب چڑھا رکھا ہے۔'' میں نے کہا۔

''بس بس میں سمجھ گئی' انشاءاللہ ہماری یہ ملاقات بہت سودمند ثابت ہوگی اور ہم مل کر اس معاشرے کی کچھ گندگی کو تو ضرور صاف کر سکیں گے اور کچھ مظلوموں کو انصاف دلا سکیں گے۔'' اس نے کہا۔

''انشاءاللہ!'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

پھر میں نے فوراً ہی اس کال کو اپنے موبائل فون سے ڈیلیٹ کر دیا' اب میں کافی حد تک مطمئن تھا' سرمئی کی مدد کے سہارے میں نواب سے بدلہ لے سکتا تھا' شاید اس مظلوم آنٹی کے لیے بھی کچھ کر سکتا تھا' اس آنٹی کی بیٹی اب نہ جانے کہاں ہوگی' اس نے بڑی ہمت کی کہ اپنی بیٹی ایک ایسی عورت کے حوالے کر کے آ گئی جس کا ماضی رات کی سیاہی سے پر تھا اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی اس عورت نے آنٹی کی بیٹی کو کیا بتایا ہے۔

میں نے ایک بات اور سوچی اور وہ یہ کہ نواب کا مزید اعتماد حاصل کروں گا' اس کے اور بھی زیادہ نزدیک ہونے کی کوشش کروں گا' تاکہ وہ مجھ پر بھرپور اعتماد کرنے لگے اور اس کے لیے میں نے سوچا کہ جب نواب آئے گا تو میں فلیٹ والی بات خود اسے بتا دوں گا' اور کس غرض کے لیے حاصل کیا ہے وہ بھی بتا دوں گا' تاکہ اگر ''چھوٹی دنیا'' نواب کو میرے بارے میں بتائے تو میری کہی ہوئی بات اور اس کی بات الگ الگ نہ ہو۔

پھر میں نے نواب کا وہ خاص نمبر ملایا' جو فون اس کے پاس رہتا تھا' اور یہ نمبر اس نے اپنے خاص خاص بندوں ہی کو دیا ہوا تھا۔

کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد نواب صاحب نے فون ریسیو کیا' اس کی آواز خاصی تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔

''ہاں بولو شہروز......!''اس نے کہا۔

''السلام علیکم نواب صاحب!'' میں نے اپنے لہجے میں سوگواری پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں کہو کیا بات ہے۔'' اس خبیث نے میری سلامتی کی دعا کو قبول نہ کرتے ہوئے بے دلی سے کہا۔

''مجھے آپ کی صاحب زادی کی جواں مرگی کا دلی افسوس ہے' میں سمجھ سکتا ہوں کہ ایک باپ کی حیثیت سے اس وقت آپ کتنے شدید صدمے سے دوچار ہوں گے' بیٹیاں ہوتی ہی اتنی پیاری ہیں کہ ان کی جدائی تو اس وقت بھی بہت تکلیف دہ ہوتی ہے جب انہیں اپنے ہاتھوں کسی اور کو سونپنا پڑتا ہے' لیکن آپ نے تو اپنے ہاتھوں اپنی صاحب زادی کو منوں مٹی کے

تلے سلادیا ہے‘ میں آپ کے اس دکھ اور غم میں برابر کا شریک ہوں۔ مجھے جب اس المناک خبر کا پتا چلا تو میں جب ہی آپ سے بات کرنا چاہتا تھا‘ لیکن یہ سوچ کر بات نہیں کی کہ آپ کتنے لوگوں کے ساتھ مصروف ہوں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے‘ ٹھیک ہے......!‘‘ اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا‘ اسے شاید میری اتنی لمبی چوڑی لفاظی بالکل بھی اچھی نہیں لگی اور میں نے یہ بات جانتے ہوئے کہ اسے بیٹی ذات سے کتنی نفرت ہے‘ جان بوجھ کر اس قسم کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

’’وہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو ہے۔‘‘ اس نے میری بات درمیان میں کاٹ کر کہا۔

’’جی ہاں یہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے‘ آج یہاں بھی قرآن خوانی کروائی گئی ہے‘ اور خیراتی اداروں میں کھانا اور کپڑے تقسیم کروائے گئے ہیں اور میڈیا والوں کو بھی بلوالیا تھا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’چلو ٹھیک ہوگیا۔‘‘ اس نے خوش ہوکر کہا اور زیادہ خوشی شاید اسے میڈیا والوں کے بارے میں سن کر ہوئی تھی۔

’’اب آپ کب تشریف لارہے ہیں‘ میرا خیال ہے کہ ابھی تو آپ کا قیام کچھ دنوں تک وہیں حویلی میں ہوگا۔ کیونکہ نوابزادی آپ کی زوجہ محترمہ بھی غم سے نڈھال ہوں گی اور اس وقت انہیں سب سے زیادہ آپ کی ضرورت ہوگی۔‘‘ میں نے حد درجہ مؤدب لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

’’میں بس دو تین دنوں میں واپس آرہا ہوں۔ وہاں بھی بہت سے لوگوں سے ملاقات کرنی ہے‘ ادھر میری دوسری بیٹی ہے اپنی ماں کی دلجوئی کے لیے‘ اب سب ٹھیک ہے‘ بابا اللہ کی مرضی کے آگے کوئی کیا کرسکتا ہے۔‘‘ اس نے نارمل لہجے میں کہا۔

’’آپ ٹھیک کہتے ہیں‘ صبر تو بہرحال کرنا ہی پڑتا ہے‘ اب اجازت دیں‘ اتنا وقت دینے کا بہت بہت شکریہ......‘‘ میں نے اپنا چاپلوسانہ انداز برقرار رکھا۔

جواباً اس نے کچھ نہیں کہا اور فون بند کردیا۔ الو کا پٹھا...... میرے لبوں سے خود بخود اس کے لیے گالی پھسل پڑی‘ تو تو اپنی بیٹی کی موت پر اللہ کا شکر ادا کررہا ہوگا‘ تو کیا جانے ایک بیٹی کا پیار اور باپ کی شفقت کس چڑیا کا نام ہے‘ تو تو عورت کو اپنے پاؤں کی جوتی اور عیاشی کا سامان سمجھتا ہے‘ تو یہاں آ نواب سطوت الاسلام تیرے لیے پھندا میں تیار کررہا ہوں۔‘‘

میں نے دانتوں کو پیستے ہوئے کہا اور فون بیڈ پر پھینک کر بیڈ پر چت لیٹ گیا‘ میرے دونوں ہاتھ سر کے نیچے تھے اور نگاہیں چھت پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ذہن میں بہت سارے خیالات گڈمڈ ہورہے تھے‘ نواب کے بارے میں آنٹی کے بارے میں‘ اپنے والدین اور بہن بھائی کے بارے میں اور سرمئی کے بارے میں۔

سرمئی یقیناً ایک بہت اچھی اور باکردار لڑکی تھی۔ اس کی حد سے زیادہ احتیاط پسندی مجھے اچھی لگی‘ آج اس دور میں جب اپنا سایہ بھی دشمنی کرنے سے باز نہیں آتا تو انسان کو اتنی ہی احتیاط کرنی چاہیے‘ یہ حشام شاید اس کا دوست ہے‘ شاید قابل اعتبار بھی ہوگا جب ہی وہ ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتی ہے‘ میں یہ ساری باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کسی نے بجایا تو میں نے لیٹے لیٹے ہی کہا۔ ’’آجاؤ۔‘‘ تو اندر دروازہ کھول کر آنے والے شخص کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

وہ ’چھوٹی دنیا‘ تھا۔

’’ارے چھوٹی دنیا تم......!‘‘ میں اسے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

’’چلیے تشریف لے چلیے‘ سوئم کی فاتحہ ہوچکی ہے کھانا لگ گیا ہے‘ آ کر تناول فرمالیجیے۔‘‘ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

’’کیا کرلیجیے......؟‘‘ مجھے تناول کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا‘ اردو میری مادری زبان نہیں تھی اس لیے حیرت سے اس سے پوچھا۔

’’تمہاری سمجھ میں یہ مہذب اردو آ بھی کیسے سکتی ہے‘ تمہیں تو مجھے صاف صاف یہ کہنا چاہیے تھا کہ آیئے اور آ کر کھانا ٹھونس لیجیے۔‘‘ میں نے آگے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے نزدیک بیڈ پر بٹھایا اور کہا۔

’’یار ہماری آج تو ملاقات ہوئی ہے اور تم مجھ سے شروع ہی سے ناراض لگتے ہو‘ مجھے بتاؤ تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے‘ بھئی دیکھوناں‘ ہم ایک ہی جگہ رہتے ہیں‘ ایک ہی باس کے لیے کام کرتے ہیں۔ تمہاری الگ اہمیت ہے اور میری الگ...... اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے‘ بلکہ مجھے تو تمہارا اس طرح اپنے کمرے میں آنا اور مجھے کھانے کے لیے بلانا بہت دوستانہ انداز لگا ہے۔ اور میں بہت خوش بھی ہوں اگر تم چاہتے تو خود نہ آتے اور کسی ملازم کو بھیج دیتے......!‘‘ میں نے اس کا ہاتھ تھامے تھامے بہت دوستانہ اور سلجھے ہوئے انداز میں ایک میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور یہ سب میں اس لیے کررہا تھا کیونکہ میں اس چھوٹی دنیا سے بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔

’’مجھے اس بات پر غصہ آرہا ہے کہ تم میرے بارے میں جانے بغیر میرا مذاق اڑا رہے ہو اور میری جسمانی ہیئت کو دیکھتے ہوئے چھوٹی دنیا چھوٹی دنیا کہہ رہے ہو۔‘‘ اس نے شکوہ کناں انداز میں کہا۔

’’ارے یار میں تو مذاق میں کہہ رہا تھا‘ اگر تمہیں برا لگا ہے تو یہ لو میں کان پکڑ کر تم سے معذرت کرتا ہوں آئندہ اب تمہیں چھوٹی دنیا نہیں کہوں گا...... چھوٹی دنیا......‘‘ میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا اور کان پکڑلیے۔

’’تم نے پھر کہا......!‘‘ اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

’’یار تم مذاق بھی نہیں سمجھتے‘ اچھا چلو ایک بار پھر معذرت...... آؤ یہ لڑائی جھگڑا ختم کرتے ہیں اور دوستی کا ہاتھ ملاتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا اور اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا جسے ذرا پس وپیش اور ذرا سی جھجک کے بعد اس نے تھام لیا پھر چند لمحے میرا ہاتھ تھامے رہا اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

’’سچ سچ بتادو کہ وہ فلیٹ تم نے کرائے پر کیوں لیا ہے......؟‘‘ ذرا دیر کو وہ مجھے ایک سیدھا سادا سا انسان دکھائی دیا تھا لیکن یہ بات پوچھتے ہوئے وہ دوبارہ اپنی پرانی جون میں آگیا اور مجھے اس کی چھوٹی آنکھوں میں وہی پرانی شاطرانہ چمک دکھائی دی۔

’’یار بتایا تو تھا کہ بوریت سے گھبرا کر اپنی راتیں رنگین کرنے کے لیے لیا ہے‘ کیونکہ یہاں اس کوٹھی میں تو ایسا کچھ ممکن ہی نہیں ہے۔ یہاں شراب اور شباب کی آزادی جو نہیں ہے آدمی کب تک صبر کرے یار......‘‘ میں نے بے ہودہ انداز میں اپنی ایک آنکھ میچ کر کہا تو وہ بھی مسکرانے لگا۔

’’ارے ہاں ایک بات بتاؤں......!‘‘ میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ’’لیکن دیکھو کسی سے اس بات کا ذکر مت کرنا۔‘‘ میں نے التجائیہ انداز میں کہا تو وہ چوکنا ہوکر میری بات سننے لگا۔

’’میں نے اپنے ایک پرانے دوست سے رابطہ کیا ہے‘ اس کے تعلقات ہیں کچھ ’’پریوں‘‘ سے...... وہ آج ایک حسین پری کو فلیٹ پر لے کر آرہا ہے...... بڑے دنوں کے بعد آج جوانی کا مزہ آئے گا‘ سنا ہے

بڑی آفت اور قاتلہ ہے......!'' میں نے بے ہودہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو یہاں زندگی روکھی پھیکی ہی گزر رہی ہے۔ یار تم بڑے سیانے ہو تم نے اس بات کا بڑا اچھا حل سوچا ہے' مجھے تو اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔'' اس نے کہا۔

''کوئی بات نہیں ہے جانی...... آج سے ہم دوست ہیں ناں...... تیرا یہ دوست تیری راتیں بھی رنگین بنا دے گا' بس جب ٹائم ہو اور موڈ ہو تو بس ایک اشارہ کرنا...... دیکھنا کیسی کیسی حسین پریاں بلکہ پریوں کی شہزادی کو تیری خدمت میں حاضر کر دوں گا۔'' میں نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''تو آج رات جا رہا ہے موج مستی کرنے......'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''ہاں یار......!'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کچھ تو لحاظ کر لے...... سوئم کا کھانا کھا کر موج مستی کرنے جا رہا ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جب ہی تو کہہ رہا ہوں کہ کسی سے ذکر مت کرنا' اگر یہ بات نواب صاحب کو پتا چلی تو انہیں بہت برا لگے گا۔'' میں نے رازدارانہ انداز میں جھک کر کہا۔

''چلو ٹھیک ہے جو یار کا راز وہ ہمارا راز......!'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ''لیکن اپنا بھی خیال رکھنا۔''

''کیوں نہیں یار...... تم بے فکر رہو۔'' میں نے کہا۔

''اچھا چلو آؤ کھانا کھا لو......!'' سلمان نے کہا تو ہم دونوں ایک ساتھ باہر آ گئے۔

کھانا کھا کر میں دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ چھوٹی دنیا کو پٹانے کے بعد میں بہت خوش تھا' میں نے باہر جانے اور خاص طور پر فلیٹ میں جانے کا راستہ ہموار کر لیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے چھوٹی دنیا کو 'بڑی دنیا' کی سیر کرانے کے لیے بھی کبھی کبھی 'خاص' انتظام کرنا پڑے گا۔ وہ خیر میرے لیے اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا' ایسی بہت سی جگہوں کے بارے میں مجھے معلوم تھا جہاں ایسی چیزیں باآسانی دستیاب ہیں۔

کھانے میں چونکہ کوٹھی میں موجود سارے لوگ ہی شامل تھے' اس لیے بہت سے نئے چہرے میرے سامنے آئے' چھ نئی لڑکیاں تھیں جو خاصی حسین اور جوان تھیں' دو وہ تھیں جنہیں ایک مرتبہ میں نے نواب کے بیڈروم میں دیکھا تھا' اس کے علاوہ پندرہ گارڈز تھے اور دس بارہ آدمی تھے' ان لوگوں میں راحیلہ بھی تھی' جو دو تین مرتبہ نگاہوں کے ٹکرانے پر دھیمے سے مسکرائی تھی۔

وہاں سے فارغ ہوتے ہوئے ساڑھے چھ بج گئے تھے۔ اس لیے میں تیار ہو کر اور ڈھیر ساری خوشبو اپنے اوپر انڈیل کر گلشن اقبال جانے کے لیے تیار ہو گیا' باہر آیا تو سلمان سے ٹکراؤ ہو گیا اور میں نے اسے بتایا کہ میں ''جا رہا ہوں'' یہ کہتے ہوئے میں ایک آنکھ میچ کر معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ اب مجھے اس بات کی اتنی کوئی فکر نہیں تھی کہ سلمان میرے پیچھے اپنے بندے بھیجتا ہے یا نہیں' بلکہ میں چاہ رہا تھا کہ وہ آج بھی میرے پیچھے بندے بھیجے اور وہ جا کر اس کو ساری رپورٹ دیں کہ ایک لڑکی اور ایک لڑکا میرے فلیٹ میں ملاقات کے لیے آ رہا ہے۔ لڑکا میرا دوست ہے جو لڑکی لے کر آ رہا ہے۔

میں بہت خوش گوار موڈ میں اور اطمینان سے گلشن اقبال فلیٹ کی جانب روانہ ہوا اور شدید ٹریفک جام کے باعث تقریباً ایک گھنٹے میں اپنے مطلوبہ فلیٹ پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

......☆☆☆......

جیسے ہی میں گھر آئی تو اماں پریشانی کے عالم میں ٹہلتی ہوئی دکھائی دیں' آنٹی کے چہرے پر بھی فکرمندی کے آثار تھے۔

''کیا بات ہے سب خیریت تو ہے۔'' میں نے تیزی سے اماں کے قریب جا کر پوچھا۔

''بیٹا شمسو کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے' اس کا سانس رک رک کر آ رہا ہے دوا بھی کھلائی تھی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا' بخار بھی اس وقت کافی تیز ہے۔'' اماں نے روہانسی ہو کر کہا۔

''کمال کرتی ہیں اماں آپ بھی...... آپ ایک کال نہیں کر سکتی تھیں مجھے......!'' میں نے غصے سے کہا اور تیزی سے بابا کے کمرے کی جانب بھاگی۔

''فون تو بہت دیر سے کر رہی تھی لیکن تمہارا موا فون بھی عجیب ہے مل ہی نہیں رہا تھا۔ بس ایک ہی آواز آ رہی تھی کہ اس وقت آپ کا رابطہ ممکن نہیں ہے۔'' اماں نے میرے پیچھے پیچھے آتے ہوئے کہا۔

''تو اماں حشام کے فون پر مجھ سے بات کر لیتیں' یا کم از کم پیغام دے دیتیں' اس کے علاوہ میں نے اپنے چینل کا نمبر بھی آپ کے پاس لکھوایا ہوا ہے' اور پھر سب کچھ چھوڑیں' اگر بابا کی زیادہ طبیعت خراب ہو رہی تھی تو آپ میرے آنے کا انتظار کیوں کر رہی تھیں' گھر میں ملازم ہے' گیٹ پر چوکیدار ہے' کسی کے ساتھ ہسپتال چلی جاتیں......!'' میں مسلسل بولتے ہوئے بابا کے کمرے میں آ گئی' میرے پیچھے پیچھے اماں اور آنٹی دونوں ہی چلی آئیں۔

بابا آنکھیں موندے بے سدھ لیٹے تھے۔ میں نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو پیشانی تیز بخار کی وجہ سے جل رہی تھی' سانس بھی مشکل سے کھینچ کھینچ کر لے رہے تھے' میں نے فوراً ڈاکٹر ذیشان کو کال کی' وہ ابھی ہاسپٹل میں تھے اور نکلنے ہی والے تھے' میں نے بابا کی ساری کیفیت انہیں فون پر بتائی اور کہا کہ یا تو آپ گھر آ جائیں اور اگر ضروری ہو تو میں بابا کو آپ کے ہاسپٹل لے کر آ جاتی ہوں تو ڈاکٹر ذیشان نے کہا کہ میں ڈاکٹر ساجد کو آپ کے گھر بھیج دیتا ہوں۔ وہ آ کر چیک کر لیں گے اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو انہیں ہاسپٹل میں شفٹ کر دیں گے' میں نے ان کا بہت شکریہ ادا کیا اور فون بند کر دیا۔

بابا کی پہلی تشخیص کے مطابق اس کے پھیپھڑوں پر بہت سارا بلغم تھا' ڈاکٹر نے انہیں دوسری چیزوں کے علاوہ سگریٹ کا پرہیز بھی بتایا تھا اور میں سمجھ گئی کہ بابا نے اماں سے بھی نگاہ بچا کر سگریٹ کی بدپرہیزی ضرور کی ہو گی' اسی لیے میں نے کہا۔

''بابا آپ نے اماں سے چھپ کر سگریٹ پی ہے ناں......!''

بابا کی بند پلکوں میں ہلکی سی تھرتھراہٹ ہوئی پھر انہوں نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں اور ہلکے سے مسکرائے اور نحیف اور محبت بھرے لہجے میں بولے۔

''میری بٹیا تو کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہے' میں ٹھیک ہوں۔ بس یہ بخار کم بخت پتا نہیں کیوں ہو گیا' اچھا بھلا ٹھیک ہو رہا تھا۔''

''بابا...... میرے اچھے بابا' آپ کو بالکل ٹھیک رہنا ہے' میرے لیے اپنی سرمئی بٹیا کے لیے' اگر آپ کو اللہ نہ کرے کچھ ہو گیا تو...... امی کے بعد میں آپ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی کھو دینے کا حوصلہ نہیں رکھتی' آپ کو میری قسم ہے بابا جو آپ نے اپنا خیال نہیں رکھا اور کوئی بدپرہیزی کی......!'' میں بابا کے سینے پر سر رکھ کر سسک پڑی' تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا اور بولے۔

''حوصلہ تو کرنا پڑے گا بٹیا...... ہر شخص اللہ کے گھر سے ایک مقررہ وقت جو لے کر آتا ہے اور اپنا وقت پورا ہو جانے پر اسے جانا ہی پڑتا ہے۔''

''ہاں تو پھر میں یہ دعا کروں گی کہ سب سے پہلے میرا ہی وقت پورا ہو جائے۔'' میں نے بابا کی بات سن کر ایک جھٹکے سے ان کے سینے سے سر اٹھایا اور بری طرح روتے ہوئے کہا۔

''اللہ نہ کرے......!'' ان تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا' اللہ تمہیں خوشیوں بھری طویل عمر عطا فرمائے...... تاکہ روز قیامت میں بے جی کے آگے سرخرو ہو سکوں کہ میں نے ان کی امانت کی حفاظت پوری طرح کی تھی۔'' بابا نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

''اور ہاں' اگر آپ لوگ میری خوشیوں بھری طویل زندگی چاہتے ہیں تو آپ دونوں کو ہمیشہ میرے ساتھ رہنا ہوگا۔'' میں نے ہمیشہ کی طرح روٹھے روٹھے لہجے میں کہا۔

''پگلی نہ ہو تو......!'' بابا نے کہا اور مسکرانے لگے۔

''یہ ہوئی ناں بات......!'' میں نے بابا کے مسکرانے پر خوشی سے چہک کر کہا۔ ''بس ابھی ڈاکٹر ساجد آنے والے ہیں۔ وہ آپ کو چیک کریں گے اور اگر ضروری سمجھیں گے تو ہاسپٹل میں شفٹ کر دیں گے۔''

''ارے نہیں بیٹا میں گھر میں ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ ہاسپٹل میں داخلے سے مجھے ڈر لگتا ہے' بندہ وہاں سے مر کر ہی نکلتا ہے۔'' بابا نے کہا۔

''ارے واہ! یہ کس نے کہا آپ سے...... ہاسپٹل میں اس لیے رکھتے ہیں کہ وہاں ایک تو ہر وقت ڈاکٹر موجود ہوتے ہیں' اس کے علاوہ بیماری میں اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو ہر طرح کی سہولیات بھی موجود ہوتی ہیں۔'' میں نے بابا کا ہاتھ تھام کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ایک بات اور بتاؤں تمہیں۔'' اماں نے بابا کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ انجکشن سے بھی ڈرتے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ انجکشن کا کورس کروالیں۔ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے' لیکن انہوں نے صاف منع کر دیا اور دوائیں اور سیرپ لے لیے۔''

''اچھا جی......! یہ چیٹنگ...... اب میں موجود ہوں ناں اس لیے دیکھتی ہوں کہ بابا انجکشن لگوانے سے کیسے انکار کرتے ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں بابا کے پاس بیٹھی اسی طرح کی باتیں کر رہی تھی کہ اچانک میری نگاہ آنٹی پر پڑی جو ہیں ایک کرسی پر بیٹھی تھیں اور ایک ٹک مسلسل میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ میں بات کرتے کرتے چپ ہو گئی اور ان کی جانب دیکھنے لگی' پھر میرے دیکھنے پر وہ گڑبڑا گئیں اور مسکرانے لگیں تو میں نے پوچھا۔

''آپ اتنے غور سے میری جانب کیا دیکھ رہی ہیں......!''

''کچھ بھی نہیں!'' انہوں نے اس طرح کہا جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہوں۔

''نہیں کچھ تو ہے' آپ یہ سوچ رہی ہیں ناں کہ اتنی بڑی ہو کر میں کیسے بچوں کی طرح بی ہیو کر رہی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ تم ان دونوں سے کتنی زیادہ محبت کرتی ہو' حالانکہ یہ تمہارے سگے ماں باپ بھی نہیں ہیں۔ یہ انہوں نے ہی بتایا تھا' پھر تم اپنی سگی

ماں سے بھی کتنی زیادہ محبت کرتی ہوں گی۔'' انہوں نے بھیگے بھیگے سے لہجے میں کہا۔

''سگی کا تو پتا نہیں......!'' میرا لہجہ خود بخود عجیب سا ہو گیا۔ ''البتہ میں امی سے بہت محبت کرتی تھی اور امی کے دنیا سے جانے کے غم کو سہنے میں اماں اور بابا نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ ان فیکٹ میں تو پلی بڑھی ہی ان کے ہاتھوں میں ہوں تو کیا مجھے ان سے محبت نہیں ہوگی' کتنی عجیب بات ہے ناں آنٹی اللہ تعالیٰ کا نظام قدرت بھی کیسا ہے کہ اس نے انہیں اولاد نہیں دی اور مجھے میرے سگے ماں باپ سے جدا کر دیا اور پھر ہمیں ایک دوسرے کے لیے تسکین بنا کر ملا بھی دیا۔ اب نہ میرے دل میں اپنے ماں باپ کی جدائی کا دکھ ہے اور نہ اماں بابا کو اپنی اولاد نہ ہونے کا قلق ہے' میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا بابا......!'' میں نے بابا سے پوچھا تو وہ مسکرانے لگے اور اسی وقت ڈور بیل بجنے کی آواز سنائی دی۔ ڈاکٹر ساجد آئے تھے انہوں نے بابا کے چیک اپ کے بعد بتایا کہ ان کے بلڈ کے کچھ ٹیسٹ لینے ہوں گے' میں بلڈ لے جاتا ہوں تاکہ دوا تجویز کی جا سکے۔

پھر میں نے بڑی مشکلوں سے سرنج کے ذریعے بابا کا بلڈ نکلوایا' اس کے علاوہ ڈاکٹر نے بخار کم کرنے کے لیے بھی انجکشن دیا' ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں اماں اور آنٹی بابا کے پاس ہی موجود رہے۔ اماں نے کہا کہ تم جا کر سو جاؤ میں یہیں موجود ہوں۔ لیکن میں جانے کو تیار نہیں تھی' لیکن تھوڑی دیر بعد بخار ہلکا ہونے لگا تو میں اپنے کمرے میں آ گئی' صبح کے ساڑھے تین بج گئے تھے' میں بیڈ پر گرتے ہی نیند کی گہری وادیوں میں اتر گئی۔

اگلا سارا دن میرا بابا کے لیے بھاگ دوڑ میں لگ گیا۔ بلڈ ٹیسٹ کی رپورٹ میں بھی آیا تھا کہ ان کے پھیپھڑے کافی خراب ہو گئے ہیں اور اس کا سبب بے تحاشا سگریٹ نوشی تھا۔

میں نے بڑوں کے انداز میں بابا کو ڈانٹ پلائی اور انہیں انجکشن لگوانے کے لیے راضی کر لیا۔ دن بھر کی تھکن کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گئی' بابا کی جانب سے بھی اطمینان ہو گیا تھا ان کی طبیعت اب کافی بہتر تھی' آج میں اپنے نیوز چینل پر بھی نہیں گئی تھی۔ اس وقت حشام کا فون آیا تو اسے اپنے نہ آنے کا سبب تفصیل سے بتایا۔

''تمہیں ممی بہت یاد کر رہی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ارے ابھی تو آئی تھی...... ویسے خیریت ہے وہ کیوں مجھے یاد کر رہی ہیں۔ کہیں تمہارے لیے کوئی لڑکی تو نہیں دیکھ لی' ہو سکتا ہے مجھے مشورے کے لیے بلا رہی ہوں۔'' میں نے اسے چھیڑا۔

''ایمان سے بڑی کٹھور ہو...... ویسے تمہارا خیال ٹھیک بھی ہو سکتا ہے کہ میرے لیے لڑکی پسند کرنے کے لیے وہ تمہارا مشورہ ضرور چاہیں گی' ویسے تم بتاؤ میرے لیے کیسی لڑکی ہونی چاہیے۔'' اس نے کہا۔

''ایسی جو تمہیں ٹھیک کر دے......!'' میں نے جھٹ کہا۔

''ارے ہاں ایک لڑکی ہے میری نگاہ میں...... یار میں اسے بہت پسند کرتا ہوں بلکہ محبت کرتا ہوں لیکن امی سے کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔'' اس نے کہا۔

''کون ہے وہ......؟'' میں نے اپنے دھڑ دھڑ کرتے ہوئے دل کو سنبھال کر کہا۔

''ہے کوئی...... لیکن تمہیں کیوں بتاؤں۔'' اس نے مجھے چڑانے کے لیے کہا۔

''کیا اسے معلوم ہے کہ تم اسے پسند کرتے ہو'' میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"ہاں معلوم ہے...... بلکہ وہ یہ بات بہت اچھی طرح سے جانتی ہے کہ وہ میری جانِ تمنا ہے۔ بہت حسین ہے پریوں کے دیس کی شہزادی کی طرح...... شاید اسی لیے مغرور بھی ہے ایک تو حسین ہے دوسرے اسے اس بات کا بھی اچھی طرح سے احساس ہے کہ مجھ جیسا ہینڈسم اس کا دیوانہ ہے۔" اس نے محبت کے نشے میں چور لہجے میں کہا۔

اور نہ جانے کیوں کسی اور لڑکی کے لیے اس کے دل کے جذبات اور احساسات کا اندازہ کر کے مجھے بہت برا لگا اور میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"تو جاؤ اپنی اسی جانِ تمنا اور جانِ غزل کو فون کرو اور اپنا دل بہلاؤ میرا سر کیوں کھا رہے ہو ویسے ہی سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔"

"تمہیں جلن ہو رہی ہے ناں......!" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بھاڑ میں جاؤ۔" کہہ کر میں نے فون بند کر دیا لیکن فوراً ہی دوبارہ بیل بجی تو میں نے فون پر نمبر دیکھا حشام ہی کی کال تھی۔

"کیا ہے......؟" میں نے پھاڑ کھا جانے والے لہجے میں کہا۔

"ارے بات تو سنو...... میں تو......!"

"خبردار جو اَب کال کی...... آ کر تمہارا سر توڑ دوں گی۔ ایڈیٹ۔" میں نے غصے سے کہا اور فون ہی آف کر کے رکھ دیا۔

مجھے بہت زیادہ غصہ آ رہا تھا اس انجان لڑکی کی شکل سے بنا دیکھے ہی نفرت ہو رہی تھی۔ پھر خود بخود میری آنکھیں بھر آئیں...... اور لاکھ روکنے کے باوجود دو موٹے موٹے آنسو میری آنکھوں سے نکل کر گالوں پر لڑھک آئے۔

میں نے انگلیوں کی پور سے اپنے آنسو صاف کیے اور خود ہی چونک پڑی...... اچانک میرے اوپر ایک اہم انکشاف ہوا...... اور وہ یہ کہ میں حشام کی زندگی میں کسی اور لڑکی کو برداشت نہیں کر سکتی ابھی اس نے صرف بات کی ہے تو میرا یہ حال ہو رہا ہے اگر کوئی لڑکی اس کی زندگی میں شامل ہو گئی تو میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔"

لیکن کیوں......؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

میں تو حشام کی صرف دوست ہوں...... شادی وہ چاہے کسی سے بھی کرے۔ پھر میرے اندر سے جواب آیا کہ حشام صرف میرا دوست نہیں ہے اس کی اہمیت میری زندگی میں ایک دوست سے بھی بڑھ کر ہے۔ لیکن کیا......؟ میں جھنجلا اٹھی تو ایک سرگوشی سنائی دی۔

"تم حشام کو چاہنے لگی ہو اس سے محبت کرنے لگی ہو......!"

محبت کے اس گدگداتے جذبے نے میرے لیے حشام ہی کا کیوں انتخاب کیا؟ میں نے اپنے اندر کی آواز سے سوال کیا۔

"اس لیے کہ یہ دنیا خوب سے خوب تر سے بھری ہوئی ہے۔ ایسے میں اگر میری نگاہ ساری دنیا کا چکر کاٹ کر صرف اسی کی جانب آئی ہے اور اسی پر مرمٹی ہے تو وہ سب سے الگ تر ہے اور یہ بات سچ سے زیادہ سچی اور پانی سے زیادہ گیلی ہے۔ پتا ہے کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیروں میں بھی راستے مل جاتے ہیں۔ اور ان لوگوں میں سے ایک حشام بھی ہے......!"

میں نے اپنے اندر کی آواز کو بڑی خاموشی سے سنا اور تسلیم کیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے سچ کہہ رہی ہے۔

میرا دل چاہا میں چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتا دوں کہ میں نے اپنے لیے جیون ساتھی چن لیا ہے زندگی کی حسین شاہراہوں پر میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے والا شخص صرف اور صرف حشام ہی ہو گا اور کوئی نہیں۔

پھر مجھے حشام کے الفاظ یاد آئے وہ تو کسی اور کو...... میں نے سہم کر سوچا۔

میں اس کا سر پھاڑ دوں گی اسے جان سے مار دوں گی اگر اس نے کسی اور لڑکی کی جانب دیکھا بھی...... کیا ہوا جو میرا رنگ سانولا ہے بھاڑ میں جائیں دنیا کی ساری گوری لڑکیاں...... میں نے طیش میں آ کر سوچا...... میرے اندر کی یہ جنگ جاری تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں سمجھ گئی کہ اماں ہوں گی اور حسب عادت گرم دودھ کا گلاس لائی ہوں گی۔

"آ جائیے اماں!" میں نے کہا۔

لیکن اماں کے بجائے آنٹی ہاتھ میں دودھ کا گلاس لے کر آ رہی تھیں۔ وہ سیدھی میرے پاس آئیں اور گلاس میری جانب بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"لو بیٹا یہ پی لو...... میں نے ہلکا گرم کیا ہے تم زیادہ گرم نہیں پیتیں ناں۔"

"ارے آنٹی آپ نے کیوں تکلیف کی...... اتنی رات ہو گئی ہے آپ ابھی تک سوئیں نہیں۔" میں نے ان کے ہاتھ سے گلاس لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"تم بھی تو ابھی تک جاگ رہی ہو۔" انہوں نے کھڑے کھڑے کہا۔

"میری تو عادت ہے بے وقت سوتی ہوں اور بے وقت جاگتی ہوں...... دراصل میری جاب ہی ایسی ہے...... ارے آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھیں ناں۔" میں نے انہیں کھڑے دیکھ کر بیڈ کی جانب اشارہ کیا تو وہ ذرا سا کونے پر ٹک کر بیٹھ گئیں اور اشارہ کیا کہ میں دودھ پی لوں۔ اور ان کا دل رکھنے کے لیے میں نے دودھ کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا میں نے اس وقت بھی محسوس کیا کہ وہ بہت محبت پاش نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی ہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ میری جانب دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایسا کیا ہوتا ہے کہ میں عجیب سا فیل کرنے لگتی ہوں لیکن اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میری جانب دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے۔

آج رات مجھ پر کیسی کیسی محبتوں کا اظہار ہو رہا تھا مجھے محبت کی سمجھ آنے لگی تھی میں نے ان کی نگاہوں سے گھبرا کر کہا۔

"آنٹی مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے لیکن یاد نہیں آتا کیا آپ کو لگتا ہے کہ ہم کبھی کہیں پہلے ملے ہیں۔"

"شاید کبھی ملے ہوں......!" انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔"

"کتنی عجیب بات ہے ناں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں اتنی عجیب بھی نہیں ہے۔ دنیا میں بہت سے چہرے ایسے ہوتے ہیں جو ایک بار دیکھ لینے کے بعد ہمیشہ کے لیے نگاہوں میں بس جاتے ہیں۔ پھر چاہے ملے ہوئے صدیاں ہی کیوں نہ بیت جائیں وہ چہرے نگاہوں میں ہی رہتے ہیں۔ جیسے تمہارا چہرہ میری نگاہوں میں اور میرا چہرہ تمہاری نگاہوں میں...... شاید اسی لیے ہم ایک دوسرے کے

لیے اجنبی ہوتے ہوئے بھی اجنبی نہیں ہیں۔" انہوں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

"آپ کا انداز گفتگو بہت خوب صورت ہے آنٹی...... لگتا ہے آپ مطالعہ بھی کرتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"ضروری نہیں ہے کہ زندگی کو سمجھنے کے لیے آپ کتابوں کا ہی سہارا لیں۔ ہماری زندگی میں آنے والے بہت سے واقعات اور حالات آپ کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ آپ وہ کر گزرتے ہیں جس کے بارے میں آپ نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا ہے' اور آپ کی زندگی یکسر تبدیل ہو جاتی ہے۔ اب یہ اپنے اپنے حالات پر منحصر ہے کسی کی بن جاتی ہے کسی کی بگڑ جاتی ہے۔" انہوں نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا' پھر خیال آیا کہ آج موقع لگا ہے تو ان سے وہ حالات جاننے کی کوشش کرتی ہوں جس کے سبب انہیں کسی کے ڈر سے اپنا گھر چھوڑ کر یوں آدھی رات کو نکلنا پڑا۔ اس لیے کہا۔

"آنٹی ایک بات پوچھوں' اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو......"

"نہیں میری جان میں بھلا تمہاری بات کو کیسے مائنڈ کر سکتی ہوں تم پوچھو......" اتنے محبت بھرے لہجے میں انہوں نے یہ کہا کہ میں سب کچھ بھول گئی اور کچھ کہہ نہ سکی' میری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے دوبارہ کہا۔

"کیا پوچھنا چاہتی تھیں بیٹا پوچھونا...... تم چپ کیوں ہو گئیں۔"

"آنٹی آپ اتنے پیار سے بات کرتی ہیں کہ میں کچھ بول ہی نہیں پاتی...... آپ کے لب و لہجے میں اتنا پیار ٹپکتا ہے تو دل میں کتنا چھپا ہو گا۔"

"بھئی تم ہو ہی اتنی پیاری کہ تم پر خود بخود پیار آ جاتا ہے۔"

"سچ کہہ رہی ہیں......" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"تو اور کیا جھوٹ۔" انہوں نے کہا اور ہنس پڑیں۔ پھر بولیں۔ "ارے لو میں تو تمہیں دودھ کا گلاس دینے کے لیے آئی تھی' تم سے بیکار کی باتیں کرنے بیٹھ گئی۔ تمہیں صبح اپنی جاب پر بھی جانا ہے۔ اب تم سو جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"لیکن آنٹی آپ سے وہ بات کرنی تو رہ گئی جو میں کرنا چاہ رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"بعد میں کر لینا' میں بھاگی تھوڑی جا رہی ہوں۔ یہیں ہوں تمہارے پاس...... اچھا چلو اب سو جاؤ۔" انہوں نے آگے بڑھ کر میرے کندھوں پر زور دیتے ہوئے مجھے لیٹا دیا اور نرم گرم کمبل میرے پیروں پر ڈال دیا' کمرے میں اے سی کی وجہ سے کافی ٹھنڈک ہو رہی تھی' اور میری عادت تھی کہ آدھا جسم کمبل سے ڈھانک کر سوتی تھی۔

مجھے لٹانے کے بعد وہ سوئچ بورڈ کی جانب بڑھیں اور لائٹ آف کر کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ آج میں بہت خوش اور مطمئن تھی' آج میں نے اپنے اندر کی محبت کا سراغ پالیا تھا۔ یہ وہ روشنی ہے' جس کی ٹھنڈک انسان کے رگ و پے میں اتر کر اسے مسرور کر دیتی ہے' میں نے اپنا دایاں ہاتھ گال کے نیچے رکھا اور آنکھیں موند لیں' اور پھر حشام کی صورت آنکھوں میں بسائے میں نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

دوسرے دن صبح دیر سے آنکھ کھلی' میں نے جیسے ہی گھڑی میں ٹائم دیکھا صبح کے دس بج رہے تھے'

تو میں ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور آنکھیں ملتی ہوئی اماں کے پاس پہنچی اور کہا کہ مجھے اٹھایا کیوں نہیں اتنی دیر ہو گئی' تو اماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹا میں نے تو دو تین مرتبہ ارادہ کیا کہ تمہیں جگا دوں لیکن یہ تمہاری آنٹی جو ہیں ناں انہوں نے منع کر دیا۔ کہ میں تمہیں ابھی نہ جگاؤں بقول' ان کے کہ تم رات کو خاصی دیر سے سوئی ہو' غالباً صبح کے چار بج گئے تھے۔"

"تو کیا ہوا اماں...... میری تو یہ عادت ہے' مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا' میں تو اسی طرح کم سونے کی عادی ہوں' آپ کو آنٹی کی بات نہیں ماننی چاہیے تھی۔" میرے لہجے میں غصے کی وجہ سے ناگواری اتر آئی۔

"بیٹے میں نے تو آپ کی محبت میں......" آنٹی آدھی بات کہہ کر رک گئیں۔

"آپ تو دو تین دنوں سے آئی ہیں' میں آپ کو تھوڑی کچھ کہہ رہی ہوں۔ اماں میری عادت بھی جانتی ہیں اور میری جاب کے اوقات بھی...... اب لیٹ پہنچوں گی اور رمضانی صاحب کی باتیں بھی سنوں گی۔" اور ہاں آنٹی آج میں شہروز سے آپ کے سلسلے میں بات بھی کروں گی۔" میں نے چلتے چلتے مڑ کر کہا اور اپنے کمرے میں آ گئی' جلدی جلدی غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور بنا چائے اور ناشتے کے نیوز چینل کے آفس پہنچ گئی۔

حشام حسب معمول اپنے ٹائم پر آفس پہنچ چکا تھا' بہت فریش دکھائی دے رہا تھا' جب کہ میرا موڈ تھوڑا سا آف تھا۔

میں جاتے ہی رمضانی صاحب کے روم میں چلی گئی' اپنے شو کے بارے میں ان کے ساتھ تبادلہ خیال کیا' کچھ ان کی طنز بھری باتیں سنیں اور اپنے روم میں آ گئی' میں نے ابھی تک چائے بھی نہیں پی تھی۔

اپنے روم میں آ کر میں حشام کو یکسر نظر انداز کر کے بڑبڑاتی رہی' دوسری چیزوں کو زور زور سے پٹخ کر اپنا غصہ نکالتی رہی۔

"کیا بات ہے آج دشمنوں کا موڈ بہت آف ہے' کیا ابھی تک ناراض ہو......؟" حشام نے بغور میرے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے مسکراہٹوں کی برسات کرتے ہوئے کہا۔

"دشمنوں کا نہیں میرا موڈ آف ہے۔ اتنی ڈھیر ساری باتیں سنا دیں لے کر...... پتا نہیں صبح ہی صبح ان کی بیگم ان کو ناشتے میں ہری مرچوں اور کریلے کا جوس پلا کر بھیجتی ہیں۔ آج ذرا سا لیٹ ہو گئی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ پارلیمنٹ ٹوٹ گئی ہے' صدر اور وزیراعظم نے استعفیٰ دے دیا ہے' ملک میں فوجی حکومت آ گئی ہے' ریما اور میرا نے برقع پہننا شروع کر دیا ہے یا کترینا کیف نے اسلام قبول کر لیا ہے' کون سی بریکنگ نیوز آن ہے ٹی وی پر...... ایک تو میں نے صبح کی چائے بھی ابھی تک نہیں پی ہے' سر درد سے پھٹ رہا ہے' اوپر سے کریلا وہ بھی نیم چڑھا جیسا باس ملا ہے...... تم فٹافٹ چائے منگواؤ......" میں ایک ہی سانس میں بے تکان اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی آخر میں سانس لینے کو رکی اور چائے کے لیے کہہ دیا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم نے بھی میری طرح ناشتہ نہیں کیا ہو گا......"

"رمضانی صاحب کو جانے دو...... آج واقعی وہ کریلے اور مرچوں کا جوس پی کر آئے ہیں سب کو اپنے روم میں بلا بلا کر ڈانٹ رہے ہیں۔ میری کلاس بھی لی جا چکی ہے۔" حشام نے میرے مزاج کو سمجھتے ہوئے مجھے ریلیکس کرنا چاہا۔

"آخر انہیں پرابلم کیا ہے' میں نے کہہ تو دیا ہے

کہ نواب سطوت کے بارے میں میں نے اپنا کام مکمل کرلیا ہے' پہلے بھی تو ان کا انٹرویو ہوتے ہوتے رہ گیا تھا' میرے سوالات بھی تیار ہیں لیکن ان کی تو جان ہی نکلی جارہی ہے' وہ انسان ہیں کوئی توپ نہیں ہیں کہ آتے ہی رمضانی صاحب کو اڑادیں گے۔" میں نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وہ توپ چیز تو ہیں۔ ان سے سوالات بہت سوچ سمجھ کر کرنے ہوں گے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ آج رات تم گھر چلو پاپا سے ڈسکس کرلو تو اچھا ہے۔" حشام نے بہت نرم لہجے میں مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"پہلے جب مجھے وہ شو کرنا تھا تب میں انکل سے اس بارے میں ڈسکس کر تو چکی ہوں' میرے پاس ساری تیاری ہے۔" میں نے اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی حرج نہیں ہے اگر ہم ایک بار پھر سے ساری چیزوں کا جائزہ لے لیں۔" حشام نے آہستہ سے کہا تو میں اس کے انداز پر مسکرادی۔ مجھے یہ سوچ کر بہت اچھا لگا کہ اسے میرا کتنا خیال ہے۔ میں مسلسل غصے میں پتا نہیں کیا کیا کہے جارہی تھی اور وہ مسلسل میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

اتنے میں ہمارا ناشتہ اور چائے آگئی' حشام نے چائے کے ساتھ بہترین قسم کے کلب سینڈوچز منگوائے تھے۔ پہلے تو ہم نے ناشتے سے پورا پور انصاف کیا اور پھر ہم دونوں نے بیٹھ کر شو میں نواب سطوت سے کیے جانے والے سوالات اور ان کے ممکنہ جوابات کا جائزہ لیا۔

میرا موڈ ٹھیک ہوا تو حشام کی شرارتی جملہ بازی پھر شروع ہوگئی' مجھے اچانک رات والی بات یاد آگئی تو میں نے اسے چھیڑا۔

"تو پھر تم مجھے اپنی اس جان جگر سے نہیں ملواؤ گے......!"

"ملوادیں گے...... ویسے وہ ہے بڑی خونخوار ذرا سا خلاف مزاج بات ہوجائے تو فوراً پنجہ مار دیتی ہے۔" حشام نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے تو یہاں تم نے کسی سے کم سمجھا ہے' ذرا دیدار تو کراؤ پھر مقابلہ دیکھنا۔" میں نے ہنستے ہوئے آستین چڑھاتے ہوئے کہا تو حشام سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

میں نے حشام کو شمروز اور آنٹی کے بارے میں بتایا تو اس نے مجھ سے کہا کہ "تم بھی بڑی احمق ہو' بھلا راہ چلتے ایک اجنبی پر اس طرح اعتبار کیا جاتا ہے' کیا معلوم کون ہے' کیا ارادہ ہے۔"

"ہاں اسی لیے میں نے اس شخص کو نہ اپنا فون نمبر دیا ہے اور نہ ہی گھر کا ایڈریس بتایا ہے' میں نے کہا تھا کہ میں خود ہی تم سے رابطہ کرلوں گی لیکن پچھلے دو دن کافی مصروف گزرے ہیں۔ کل بابا کی طبیعت خراب تھی' اس چکر میں بھاگ دوڑ رہی' اب ذرا فرصت ملی تو سوچ رہی ہوں کہ اس کو فون کرلوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں اسے فون کرو اور اس سے کہو کہ وہ اس آنٹی کو لے جائے بلکہ اسے کسی اور جگہ بلالو اور آنٹی کو تم خود اس جگہ لے جاؤ' میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا' اور ہاں اپنے سیل سے فون مت کرنا۔" حشام نے کہا تو میں نے اپنے روم کے پی ٹی سی ایل فون سے اس کے موبائل پر فون کیا جو اس نے مجھے دیا تھا۔

اس سے جو گفتگو ہوئی اس سے میں خاصی الجھن میں پڑ گئی۔ میں نے فون کا اسپیکر آن کیا ہوا تھا اور ہمارے درمیان ہونے والی ساری گفتگو حشام بھی سن رہا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کسی جرائم پیشہ گروہ کے ساتھ ہے' پھر اس نے آنٹی کے

بارے میں بھی بتایا کہ وہ کسی ایسے بڑے آدمی کے ظلم کا شکار ہوئی ہے جو بظاہر لوگوں میں سفید پوش پہچانا جاتا ہے' اس نے اپنے ایک فلیٹ کا پتا بتاتے ہوئے کہا کہ میں اور حشام اس سے وہاں ملنے آجائیں تاکہ وہ ساری بات ہمیں تفصیل سے بتاسکے' میں نے حشام سے آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کیا کہ ہمیں جانا چاہیے یا نہیں تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ بلکہ اس سے پہلے میں اسے فون کرکے اپنے نیوز چینل پر آنے کے لیے کہا تھا' اس نے آنے کی ہامی بھی بھرلی تھی مگر عین وقت پر اس نے فون کرکے آنے سے انکار کردیا تھا کہ اس کی نگرانی ہورہی ہے' اس لیے وہ یہاں آنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ میں سمجھ گئی کہ اگر میں ان جرائم پیشہ لوگوں کی نگاہ میں آگئی تو یہ میرے حق میں بھی بہتر ثابت نہیں ہوگا۔

شمروز نے فون رکھا تو حشام نے مجھ سے کہا۔

"سرمئی میں اور تم ایک اہم معاملے میں بات کرنا تو بھول ہی گئے اور دوسرے مسائل میں الجھ گئے۔"

"کون سا معاملہ!" میں نے کہا۔

"تمہیں یاد ہے کہ تم نے اپنے والد کی دی ہوئی کچھ نشانیاں مجھے دکھائی تھیں......!"

"ہاں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"تو تمہیں وہ نشانیاں یا ان جیسی چیزیں کسی اور شخص کے پاس دکھائی دیں......؟"

"میں سمجھ رہی ہوں کہ تمہارا اشارہ کس کی جانب ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"تو پھر تم نے کیا سوچا ہے......؟" اس نے کہا۔

"تم بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟" میں نے کہا نہ جانے کیوں اس بات کے یاد آتے ہی میرا ذہن جیسے بالکل خالی ہوگیا۔ بالکل صاف سلیٹ کی مانند۔

"نواب سطوت الاسلام ملک کی بہت بڑی ہستی ہے اور جیسا کہ اس کے بارے میں ہم جانتے ہی ہیں کہ وہ در پردہ کس قماش کا انسان ہے' اب ساری بات سمجھ میں آرہی ہے کہ تمہاری والدہ نے کیوں تمہیں کسی اور کے حوالے کردیا تھا۔ اس نے یقیناً تمہاری والدہ سے چھپ کر شادی کی ہوگی اور اس کی وجوہات دو ہی ہوسکتی ہیں' ایک تو یہ کہ اس نے محض اپنی عیاش طبیعت کی وجہ سے ایسا کیا ہوگا' یا پھر دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس کی خاندانی بیوی جو کہ ایک ہی ہے اس نے صرف دو بیٹیاں پیدا کی تھیں' یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی وجہ سے وہ مزید اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی ہوگی تو اس نے بیٹے کی خاطر تمہاری والدہ سے شادی کی ہوگی تاکہ جب بیٹا پیدا ہوجائے تو وہ اس بیٹے کو اپنی خاندانی بیوی کی گود میں ڈال کر یہ مشہور کردے کہ یہ بیٹا اس کی خاندانی بیوی نے پیدا کیا ہے' اپنی نسل آگے بڑھانے اور اپنی جدی پشتی گدی سنبھالنے کے لیے اسے ہر قیمت پر بیٹا ہی چاہیے تھا' لیکن شاید تمہارے پیدا ہونے کے بعد اس نے تمہیں اور تمہاری والدہ کو جان سے مارنا چاہا اور تمہاری والدہ کسی طرح سے موقع دیکھ کر فرار ہوگئیں اور تمہیں ایک انجانے آدمی کے سپرد کردیا' یہ تو تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم اچھے لوگوں کے ہاتھ لگیں۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اگر کوئی برا آدمی ہوتا تو وہ تمہاری ننھی سی جان کو ٹھکانے لگادیتا اور تمہاری والدہ کا دیا ہوا مال ومتاع ہضم کرجاتا' کون اسے پوچھنے والا تھا' اب یہ معلوم نہیں کہ تمہاری اپنی والدہ کہاں ہیں۔ تمہیں اپنے والد کے بارے میں تو معلوم ہو ہی گیا ہے کہ تم کس کا خون ہو' نواب سطوت الاسلام...... تمہاری رگوں میں نوابی خون دوڑ رہا ہے......!"

"مت کہو اس کو میرا باپ...... ایسے شخص کو باپ کہنا لفظ باپ کی توہین ہے۔" میں نے تیزی سے

زہرخند لہجے میں کہا۔
''اب تم مانو یا نہ مانو بہرحال یہی حقیقت ہے۔'' حشام نے کہا۔
''یہ کیسی حقیقت ہے کہ میں اس کو ثابت ہی نہیں کر سکتی' لوگوں کے سامنے اسے اپنا باپ نہیں کہہ سکتی اور نہ ہی وہ اس بات کو کسی طور تسلیم کرے گا اور نہ میں اس بات کو تسلیم کروانا چاہتی ہوں۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ مجھے اپنا نام ونشان مل گیا ہے' بس اب تو میری ایک ہی دلی خواہش ہے کہ کاش جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے میرے باپ کے بارے میں بتادیا' مجھے اپنی ماں کا بھی پتا مل جائے۔''
''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ وہ شخص کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا' بلکہ ہو سکتا ہے' بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں مروادے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ خاموشی ہی اختیار کی جائے۔'' حشام نے پرسوچ لہجے میں کہا۔
ہمیں چونکہ شمروز نے آٹھ بجے فلیٹ پر بلوایا تھا' اسی لیے ہم یہیں بیٹھے ٹائم پاس کر رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔
''تمہیں پتا ہے حشام میں نے جب اس رات نواب سطوت کو ٹی وی پر دیکھا تھا تب ہی اس کے گلے میں پڑے ہوئے تعویز اور اس کی اسٹک کو دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ ہو نہ ہو یہی شخص میرا باپ ہو سکتا ہے اور میں نے چیخ کر اماں کو بھی بلایا تھا اور انہیں دکھایا تھا' لیکن چونکہ آنٹی بھی اماں کے ساتھ میرے کمرے میں آگئی تھیں اس لیے ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی' پھر دوسرے دن میں شاداب پور چلی گئی تھی پھر اگلے دن بابا کی اتنی طبیعت خراب رہی' بس اماں اور بابا سے اس موضوع پر بات ہی نہیں ہو سکی' وہ آنٹی بھی ہمہ وقت اماں کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں' اس لیے میں چاہ رہی تھی کہ وہ جلد از جلد یہاں سے چلی جائیں تاکہ میں اماں اور بابا سے کھل کر بات کر سکوں۔'' میں نے حشام کو بتایا تو وہ خاموشی سے بیٹھا سنتا رہا اور میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔
ابھی پانچ بجے تھے' آٹھ بجنے میں کافی ٹائم تھا' اس لیے میں نے حشام سے کہا کہ ''میں سوچ رہی ہوں کہ گھر چلی جاؤں' بابا کو بھی دیکھ لوں گی کہ ان کا کیا حال ہے' میری اتنی بے پروائی کی وجہ سے ان کا مرض اتنا بگڑ گیا ہے۔''
''ہاں ٹھیک ہے چلو میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں' بابا کی خیریت بھی پوچھ لوں گا' اور تمہاری ان آنٹی کو بھی دیکھ لوں گا جو زبردستی تمہاری مہمان بن گئی ہیں' پھر وہاں سے تم میری گاڑی میں چلنا' واپسی میں' میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں گا اور گھر چلا جاؤں گا۔'' حشام نے کہا تو میں راضی ہو گئی۔
پھر حشام نے اپنے گھر فون کر کے بتادیا کہ فی الحال تو وہ میرے ساتھ میرے گھر جا رہا ہے' وہاں سے ہم دونوں کو کہیں اور جانا ہے' اس لیے واپسی میں وہ لیٹ ہو جائے گا۔ حشام کی ممی نے مجھ سے دو تین باتیں کیں اور بولیں۔
''بیٹا مجھے حشام نے بتایا تھا کہ تمہیں تمہارے والد کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔''
''آنٹی اس وقت اس بات کو رہنے دیں' ہم پھر کبھی اس موضوع پر بات کریں گے' نہ جانے کیوں اس بات کا خیال آتے ہی کہ نواب سطوت ہی میرا باپ ہے میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگتی تھیں اور خود بخود میرے لہجے میں تلخی سی اتر آتی تھی' بعد میں مجھے اپنے لہجے کی تلخی کا احساس ہوا تو میں نے ان سے معافی مانگی تو انہوں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔
''میں تمہاری دلی کیفیت کو سمجھ سکتی ہوں' تم ریلیکس

رہو میری جان..... بس یہ سمجھ لو کہ ہماری تقدیر ہمارے ساتھ بہت سے کھیل کھیلتی ہے' اور ہمیں ہر حال میں انہیں فیس کرنا پڑتا ہے۔''
''جی آنٹی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور فون حشام کو واپس کر دیا' حشام نے اپنی ممی سے ایک دو باتیں کیں اور فون بند کر دیا پھر مجھ سے بولا۔
''ویری سوری سرمئی کہ میں نے بنا تمہاری اجازت کے ممی پاپا کو یہ ساری باتیں بتادیں' تم ناراض تو نہیں ہو۔''
''نہیں حشام ناراضگی کیسی' اس دنیا میں اماں اور بابا کے علاوہ ایک تمہاری فیملی ہی ایسی ہے جسے میں اپنا سمجھتی ہوں' تم اگر نہیں بتاتے تو میں انہیں بتادیتی..... تم گلٹی فیل مت کرو۔'' میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔
''گڈ گرل۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور بے خیالی میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا' میں نے چونک کر اس کی اس بے ساختہ حرکت کو دیکھا تو اس نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا اور سوری کہا۔
''حشام میں ایک بات سوچ رہی ہوں کہ میں نے اور تم نے نواب سطوت کے گلے میں تعویذ اور اس کے ہاتھ میں اسٹک دیکھ کر ہی یہ فرض کر لیا کہ یہی شخص میرا نام نہاد باپ ہے' یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ اس کی خاندانی نشانیاں اس کے کسی دوسرے رشتہ دار کے پاس بھی موجود ہوں' میرا باپ کوئی اور ہو' نواب سطوت نہ ہو۔''
''تم نے نکتہ تو بہت اچھا اٹھایا ہے' ایسا ہو بھی سکتا ہے' لیکن تمہیں اگر یاد نہ ہو تو میں تمہیں یاد دلا دوں کہ ہم جب نواب سطوت کی بیٹی کی تدفین کی کوریج کے لیے شاداب نگر گئے تھے تو وہاں ہم نے بہت سے لوگوں کو دیکھا تھا' یقیناً وہاں اس کے خاندان کے اور دوسرے لوگ بھی موجود ہوں گے' لیکن یہ دونوں چیزیں یا اس جیسی چیزیں ہمیں سوائے نواب سطوت کے کسی اور کے پاس دکھائی نہیں دیں' تو اس سے تو یہ بات صاف ظاہر ہے کہ نواب سطوت ہی تمہارا باپ ہے' اور اس نے اپنی یہ خاندانی نشانیاں تمہاری والدہ کو اپنے ہونے والے ممکنہ بیٹے کے لیے دی ہوں گی۔''
حشام نے بڑی گہری نگاہ سے اس روز شاید یہی بات ذہن میں رکھتے ہوئے وہاں موجود لوگوں کا جائزہ لیا ہوگا' اس کی توجیہہ میری سمجھ میں آگئی۔
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو حشام' میں نے نواب سطوت کو ٹی وی میں دیکھنے کے بعد ہی شاداب نگر جانے کا فیصلہ کیا بلکہ میرے جانے کا ایک اہم مقصد اور تھا میں اس کی حویلی میں جانا چاہ رہی تھی' اس کی بیوی اور بیٹی کو دیکھنا چاہ رہی تھی' مگر اس چالاک آدمی نے ایک اچھا بہانہ کر کے میڈیا کو اپنی حویلی سے دور ہی رکھا' بلکہ میں تو ایک بات اور سوچ رہی ہوں کہ میں نواب سطوت کا انٹرویو اس کی حویلی میں جا کر کروں..... تمہارا کیا خیال ہے؟''
''آپ کا خیال بالکل غلط ہے' وہ کبھی بھی اس بات کے لیے راضی نہیں ہوگا۔ وہ خود ہمارے چینل پر آجائے گا اور یہیں انٹرویو دے کر چلا جائے گا۔'' حشام نے جواب دیا۔
''چلو دفع کرو اس نواب سطوت کے ذکر کو..... میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔'' میں نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔
''بری بات ہے اپنے والد محترم کے بارے میں اس طرح نہیں کہتے۔'' حشام نے شرارتی لہجے میں کہا۔
''میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔'' میں نے بھنا کر کہا۔

"کون سی چیز آپ میرے سر پر دے کے ماریں گی...... فرمائیے حاضر کی جائے گی۔" وہ بدستور شرارتی موڈ میں تھا۔

"تمہارا سر توڑنے کے لیے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑے گی' میں نے مارشل آرٹ کی ٹریننگ حاصل کر رکھی ہے' وہ کس دن کام آئے گی۔" میں نے کہا اور ٹیبل سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر شولڈر پر ڈال کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اللہ میرے حال پر رحم کرے۔ میرا مستقبل خاصا بھیانک دکھائی دے رہا ہے۔" وہ سر کھجاتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"کیا کہہ رہے ہو زور سے بولو......" میں نے جاتے جاتے مڑ کر کہا۔

"کچھ نہیں' چلیے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور پیچھے پیچھے آنے لگا۔

میں گھر پہنچی تو بابا کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ میں اور حشام بابا کے پاس ہی بیٹھے رہے' اماں بھی چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لے کر آ گئیں اور حشام سے کہا کہ کھانا تیار ہے' کھا کر جانا' لیکن میں نے حشام کے کچھ کہنے سے پہلے ہی انکار کرتے ہوئے بتایا کہ ہمیں کسی جگہ بہت ضروری کام سے جانا ہے' میں اور حشام تو بابا کو دیکھنے کے لیے آ گئے تھے۔

"بھئی تمہیں کیا ہے' اماں تو مجھ سے کھانے کے لیے کہہ رہی ہیں' میں تو کھاؤں گا' تم کیوں انکار کر رہی ہو۔" حشام نے کہا پھر اماں سے بولا۔ "دیکھ لیں اماں میں تو کھانے کے لیے تیار ہوں یہ سر مئی ہی نہیں چاہتی کہ میں آپ کے ہاتھوں کا بنا ہوا لذیذ کھانا کھاؤں۔"

"جی نہیں گھر پر آنٹی تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی تمہیں گھر جا کر کھانا کھانا چاہیے' اماں کے ہاتھ کا کھانا کھانا ہو تو پہلے انہیں بتا دینا تاکہ وہ کھانے پر تمہارا انتظار نہ کریں۔" میں نے کہا۔

ہماری یہ نوک جھونک جاری تھی اور اماں اور بابا ہماری نوک جھونک سے محظوظ ہو رہے تھے' کافی دیر ہو گئی تھی ہمیں وہاں بیٹھے لیکن آنٹی ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آئی تھیں۔ مجھے تو ان کا خیال ہی نہیں آیا' لیکن حشام کو یاد تھا' تب ہی اس نے مجھ سے اشارے سے پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟" تب میں نے اماں سے آنٹی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وہ اندر کمرے میں ہیں۔ یہاں اس لیے نہیں آئیں کہ تمہارے مہمان ساتھ آئے ہیں۔

"ارے لو بھئی!" حشام نے چہک کر کہا۔ "میں انہی سے ملنے کے لیے تو آیا ہوں۔"

"کیوں......؟" بابا نے ایک دم چونک کر کہا میں نے ان کے چونکنے میں گھبراہٹ کو بھی محسوس کیا۔

"وہ اس لیے کہ سر مئی ان کی بہت تعریف کرتی ہے۔" حشام نے رواروی میں کہا۔

"کیا کہتی ہے......؟ اس نے تمہیں ان کے بارے میں کیا بتایا ہے؟" بابا نے دوسرا سوال کیا۔

"آپ اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ میں نے حشام کو آنٹی کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ کس طرح مجھے ملیں۔ شاید ان کے کچھ دشمن ہیں اور وہ ان ہی سے خوف زدہ ہو کر یہاں چھپی ہوئی ہیں۔" میں نے بابا کی فکرمندی پر مشکوک انداز میں کہا۔

"دراصل بابا ہم اس وقت اسی شخص سے ملنے کے لیے جا رہے ہیں جس نے آنٹی کو سر مئی کے سپرد کیا ہے' تاکہ ان کے بارے میں کچھ معلوم کر سکیں' ویسے وہ شخص بھی ہمیں مشکوک ہی لگ رہا ہے۔" حشام نے سنبھل کر بابا سے کہا۔

"میرا تو مشورہ ہے بیٹا کہ تم لوگ ان کے چکروں میں نہ ہی پڑو تو بہتر ہے' نہ جانے وہ کون ہے کن لوگوں سے اس کا تعلق ہے' کہیں تمہارے لیے ہی کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔" بابا نے کہا۔

"جب آپ کی دعاؤں کا سایہ ہر وقت میرے سر پر ہے تو مجھے کسی بات کی فکر نہیں ہے' انشاء اللہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے بابا کی اتنی فکرمندی کو دیکھتے ہوئے محبت سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"تم تو ہماری جان ہو بیٹا اگر اللہ نہ کرے تمہیں ذرا سی خراش بھی آئی تو میری تو اگلی سانس ہی نہیں آئے گی۔" بابا نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"لو اب سنبھالو انہیں......!" میں نے اپنا سر تھام لیا۔ "بابا میرے اچھے بابا میں نے جس فیلڈ کا انتخاب کیا ہے ناں اس میں ایسے رسک تو رہتے ہی ہیں۔ دنیا سے برائی کا خاتمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور پھر میرا باڈی گارڈ بھی تو ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے حشام کی جانب دیکھا۔

"بابا آپ کو اماں نے وہ والی بات تو بتا دی ہوگی ناں......" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"کون سی بیٹا؟" بابا نے پوچھا۔

"نواب سطوت والی......اس رات جب آپ کی طبیعت خراب تھی' تب میں نے ٹی وی پر اسے دیکھا تھا اور ان کے گلے میں ویسا ہی تعویذ تھا جیسا میرے پاس ہے اور اس کے ہاتھ میں اسٹک بھی ویسی ہی تھی' تب میں نے اسے پہچان لیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہی میرا باپ ہو۔" میں نے بڑے کڑے دل سے اس کے لیے میرا باپ کا لفظ استعمال کیا تو بابا کے چہرے پر ذرا دیر میں کئی رنگ آ کر گزر گئے اور وہ ایک لفظ بھی نہیں بولے۔

"کیا ہوا بابا' آپ یہ سن کر خاموش کیوں ہو گئے۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"آج تو تم یہ بات اپنی زبان پر لائی ہو' آئندہ کبھی مت لانا......بس تم میری بیٹی ہو' اپنے بابا کی بیٹی......وہ بہت ظالم ہے' اگر اسے تمہارے بارے میں پتا چل گیا تو وہ تمہیں آج بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔" یہ بات کہتے ہوئے بابا کانپ رہے تھے۔

"مجھے اس شخص کو اپنا باپ کہنے میں نہ تو کوئی خوشی ہے اور نہ ہی کوئی دلچسپی......بس مجھے یہ جان کر اطمینان حاصل ہو گیا ہے کہ مجھے اپنے بارے میں پتا چل گیا ہے' بچپن سے جو ایک کانٹا سا ہر وقت مجھے اپنے دل میں چبھا ہوا محسوس ہوتا تھا' وہ نکل گیا ہے...... اور میں تو صرف آپ کی بیٹی ہوں تھی......اور ہمیشہ رہوں گی۔" میں نے بابا کے سینے پر سر رکھ دیا' یہ بہت جذباتی منظر تھا' بابا اور اماں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میری آنکھیں بھی نم تھیں۔

اچانک ہی میرا سیل فون بجنے لگا' میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور سیل کی روشن اسکرین پر نگاہ ڈالی' اور میں بری طرح چونک پڑی' وہاں شمروز کا موبائل نمبر دکھائی دے رہا تھا۔ میرے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھے تو سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ "کس کا فون ہے؟"

"شمروز کا فون میرے موبائل پر......لیکن اس کو میرا نمبر کیسے ملا......؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"حیرت انگیز بات ہے' تم نے تو اسے اپنا نمبر دیا ہی نہیں تھا' پھر اس نے تمہارا نمبر کس سے حاصل کیا اور اس وقت تمہیں فون کرنے کا اس کا مقصد کیا ہے!" حشام نے کہا۔

میں ہاتھ میں فون لیے شش و پنج میں مبتلا تھی کہ

فون ریسیو کروں یا نہ کروں کہ بیل بند ہوگئی' میں نے فون واپس رکھ دیا' اور حشام سے کہا کہ "حشام تمہارا کیا خیال ہے' ہمیں اس سے اس فلیٹ میں جا کر ملنا بھی چاہیے یا نہیں۔"

اچانک دوبارہ فون کی بیل بجنے لگی تو میں نے فون اٹھا کر سوالیہ نگاہوں سے حشام کی جانب دیکھا تو اس نے سر کی ہلکی سی جنبش سے اشارہ کیا کہ مجھے بات کر لینی چاہیے۔

"مجھے بھی تو بتاؤ کہ آخر معاملہ کیا ہے' تم لوگ اس فون کے آنے پر اتنے پریشان کیوں ہو؟" بابا نے فکرمندی سے کہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کے لیے کہا اور فون ریسیو کر لیا۔ میرے ہیلو کے جواب میں مجھے شمروز کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"سوری سرمئی جی میں دراصل......!"

"آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا......!" میں نے شمروز کی بات درمیان سے کاٹ کر تیز لہجے میں پوچھا۔

"میں نے تو آپ کے نیوز چینل پر فون کیا تھا' تو پتہ چلا کہ آپ گھر جا چکی ہیں' آپ سے ضروری بات کرنی تھی۔ بات کیے بنا کوئی چارہ ہی نہیں تھا' اس لیے میں نے آپ کے نیوز چینل سے آپ کا نمبر لے لیا۔" اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"ابھی ہم آ تو رہے تھے پھر کیا ضروری بات کرنی ہے کہ آپ کو فون کرنا پڑا۔" میں نے حسب عادت سخت لہجے میں کہا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں تو اس فلیٹ پر پہنچ چکا ہوں اور آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن ابھی ابھی میرے ایک ساتھی کا میرے پاس فون آیا ہے کہ میرا "باس" جو گیا ہوا تھا' ابھی آنے والا ہے اس لیے مجھے فوراً واپس جانا ہوگا' آپ سے میں دوبارہ رابطہ کروں گا' بس ایک بات کی گزارش ہے کہ پلیز آپ میرے بارے میں کوئی غلط بات مت سوچیے گا' میں بہت مجبور ہوں۔ میرے پیر ایک شکنجے میں کچھ اس طرح سے جکڑے ہوئے ہیں کہ ان سے نکلنے کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑے گی' اب دیکھیے ہماری ملاقات کب ہوتی ہے اور جب ہوگی وہ یقیناً بہتر وقت ہی ہوگا' بہت معذرت کے بعد اللہ حافظ......!" اور اس نے فون بند کر دیا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" حشام نے فون بند ہونے کے بعد مجھ سے پوچھا تو میں نے اپنے اور شمروز کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو اسے سنا دی۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر اس کے کس قسم کے لوگوں کے ساتھ تعلقات ہیں یا پھر یہ کسی سیاسی گروہ کے لیے کام کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو طے ہے کہ وہ کسی سیاسی جماعت سے ضرور وابستہ ہے کیونکہ اس نے کہا تھا کہ میرے باس نے بھی اپنے مکروہ اور سیاہ چہرے پر سفید اور پاکیزگی کا نقاب چڑھا رکھا ہے' تو ایسے تو بہت سے چہرے ہماری سیاسی جماعتوں میں شامل ہیں' بظاہر وہ عوام کے بڑے خیر خواہ اور غریبوں کا درد اپنے سینے میں رکھتے ہیں لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے بہت سے لوگ جانتے ہیں لیکن کہے کون...... جو بھی آواز اٹھائے گا' مارا جائے گا۔" حشام نے کہا پھر بولا۔

"میرا خیال ہے' کہ اب مجھے چلنا چاہیے بقول تمہارے ممی کھانے پر میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ تم نے اپنی پردے دار آنٹی سے تو ملوایا ہی نہیں۔" حشام نے بات ختم کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اب جب کہ ہم شمروز سے ملنے کے لیے نہیں جا رہے تو پھر تم کھانا کھا کے ہی جانا' میں خود ابھی آنٹی کو فون کر کے کہہ دیتی ہوں اور یہ بھی بتا دوں گی کہ ہمارا جانے کا پروگرام کینسل ہو گیا ہے اور حشام میرے گھر سے ہی گھر واپس جائے گا اور رہی بات آنٹی کی تو انہیں میں ابھی بلا کر لاتی ہوں۔ اتنے تم بیٹھ کر بابا کا دل بہلاؤ۔" میں نے حشام سے کہا۔

"جو حکم سرکار کا بھلا ہماری مجال جو ہم آپ کی مرضی کے خلاف کچھ کریں۔" حشام نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو خم دیتے ہوئے کہا اور بابا کے پاس بیٹھ گیا' اور میں موبائل سے حشام کے گھر کا نمبر ملاتے ہوئے آنٹی کو بلانے کے لیے چل دی' مجھے اماں کو بھی بتانا تھا کہ حشام گھر پر ہی کھانا کھائے گا۔

حشام کے گھر فون کر کے اور اماں کو حشام کے کھانے کا بتا کر میں نے آنٹی کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ بیڈ پر دونوں پاؤں اوپر کر کے اپنے بازو گھٹنو کے گرد لپیٹے بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم بیٹھی تھیں۔

"آنٹی!" میرے روم میں جانے سے بھی ان کی محویت نہیں ٹوٹی تو میں نے قریب جا کر انہیں پکارا تو وہ بری طرح چونک پڑیں اور وحشت زدہ لہجے میں بولیں۔

"کیا تم مجھے ابھی اپنے ساتھ شمروز کے گھر لے جا رہی ہو۔"

"نہیں تو...... آپ سے کس نے کہا۔" میں نے ان کے قریب بیٹھ کر حیرانی سے پوچھا۔

"ایک بات کہوں بیٹا!" انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔

"کہیے......!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"مم...... میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ تمہارے کسی معاملے میں نہیں بولوں گی' تمہارا جب دل چاہے سونا' جب دل چاہے اٹھنا' جب آنا' جب جانا...... میں کچھ بھی نہیں بولوں گی' کیا......" انہوں نے بہت پر امید نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد بولیں۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے یہاں سے شمروز کے پاس نہ لے جاؤ' یہیں اپنے گھر کے کسی کونے میں پڑا رہنے دو...... میں تمہارے گھر کے کام کر دیا کروں گی' تم یہ سمجھ لینا کہ تم نے ایک بے سہارا عورت کو گھر میں ملازمہ رکھ لیا ہے۔"

"ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں آنٹی...... آپ تو میری ماں کی طرح ہیں۔ میں بھلا آپ کو ملازمہ کیوں سمجھوں گی۔ آپ اگر یہاں رہنا چاہتی ہیں تو خوشی سے رہیں لیکن ایک بات مجھے بتائیں کہ آپ شمروز کے پاس کیوں نہیں جانا چاہتیں' کیا آپ کو اس سے کسی قسم کا خطرہ ہے؟"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" انہوں نے تیزی سے کہا...... پہلے میں یہی چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ رہوں لیکن اب نہیں......!"

"وہی تو میں پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ اب کیوں نہیں......؟" میں نے جرح کے انداز میں کہا۔

"اس لیے کہ مجھے تمہارے ساتھ رہنا اچھا لگ رہا ہے۔ تمہارے اس گھر میں آ کر مجھے جو سکون ملا ہے میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی...... ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے برسوں سے جس سکون کے لیے میں تڑپ رہی تھی وہ سکون مجھے اس گھر میں میسر آ گیا ہے۔"

"اچھا چلیے کوئی بات نہیں' آپ کو یہاں رہنا اچھا لگتا ہے تو رہیں...... لیکن آپ میرے ساتھ آئیے' میرے ایک دوست ہیں حشام وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ آئیں کیوں نہیں' وہ تو بہت دیر سے آئے بیٹھے ہیں۔" میں نے ان کا ہاتھ تھام کر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو اس لیے نہیں آئی بیٹا کہ کہیں تم برا نہ مانو...... وہ تمہارے مہمان ہیں ناں!" آنٹی نے کہا۔

"ارے وہ کوئی مہمان نہیں ہے' دوست ہے میرا...... میرا اس دنیا میں ایک ہی تو دوست ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"صرف دوست ہی ہے ناں......!" انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"جی!" میں نے ان کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بھی انجان بنتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں!" انہوں نے اس طرح جلدی سے کہا کہ کہیں میں برا نہ مان جاؤں...... اور مجھے ایک دم ہی اس بات کا احساس ہوا کہ کیا میرا رویہ ہر ایک کے ساتھ اتنا جارحانہ ہوتا ہے کہ لوگ بات کرکے گھبرا جاتے ہیں کہ پتا نہیں ان کی بات کے جواب میں میرا ری ایکشن کیا ہوگا؟

اور میں نے سوچا کہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی اس خامی کے بارے میں ضرور سوچوں گی۔

آنٹی میرے پیچھے پیچھے بابا کے کمرے میں چلی آئیں' جہاں حشام بیٹھا بابا کو نہ جانے کون کون سی کہانیاں سنا کر ان کو ہنسا رہا تھا' جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوئی تو حشام کی توجہ میری جانب ہوگئی۔

میں نے پیچھے کھڑی آنٹی کا ہاتھ پکڑ کر سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"ان سے ملو حشام' یہ وہی والی آنٹی ہیں جو مجھے اچانک ہی راستے میں مل گئی تھیں لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ یہ یہاں آئیں تو چند دنوں کے لیے تھیں لیکن اب ان کا دل یہاں اس طرح لگ گیا ہے کہ یہ یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتیں۔" میں نے آنٹی کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اور جب میں نے حشام کی جانب دیکھا تو مجھے بڑا عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ آنکھیں پھاڑے آنٹی کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ میری جانب دیکھتا اور کبھی آنٹی کی جانب...... اسے اس طرح دیکھتے ہوئے پاکر میں بھی حیران ہوئی اور کہا۔

"کیا ہوا ہے؟ تم آنٹی کو اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے تم انہیں جانتے ہو اور یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہو گئے ہو' بات کیا ہے آخر......؟" میں نے کہا۔

"ہاں حیران تو میں ہو رہا ہوں......!" اس نے بغور آنٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کس بات پر......؟" میں نے جرح کے انداز میں کہا۔

"مجھے حیرت ہے کہ تمہیں...... خیر چھوڑو...... اچھا ہے اب آنٹی کو تم اپنے پاس ہی رکھو' لگتا ہے ان کا تمہارے ساتھ دل لگ گیا ہے۔" اس نے بس اچانک ہی وہ بات ختم کردی اور نارمل لہجے میں بولا اور مجھے حشام کی اس بات سے چڑ تھی کہ وہ بات کو بیچ میں سے ادھورا چھوڑ کر اصل بات سرے سے ہی گول کر جاتا تھا۔

حشام مجھے نظر انداز کرکے آنٹی سے بات کرنے لگا' انہوں نے پسندیدگی کی نگاہ سے حشام کو دیکھا اور پھر اس سے اس کے گھر اور والدین کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

اتنے میں اماں نے آکر کہا کہ کھانا لگ گیا ہے تم لوگ ٹیبل پر آجاؤ' میں اور حشام ٹیبل پر آگئے' آنٹی کو بھی ہم نے ساتھ ہی بٹھا لیا' اماں نے بابا کے لیے پرہیزی کھانا بنایا تھا وہ ان کا اور اپنا کھانا لے کر کمرے میں چلی گئیں۔

کھانے کے دوران ہم آنٹی سے بھی بات کرتے رہے' کبھی کبھی میں اور حشام سیاسی حالات پر گفتگو کرتے تو وہ ہماری گفتگو میں حصہ لے لیتیں' دوران

گفتگو وہ کبھی کبھی انگریزی میں بھی بات کرنے لگتیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ آنٹی کوئی عام عورت نہیں ہیں وہ پڑھی لکھی بھی ہیں اور سیاست اور سیاستدانوں کو بھی سمجھتی ہیں۔

"لگتا ہے آنٹی کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے سیاست سے اور سیاست دانوں سے......" حشام نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ارے نہیں وہ تو بس یونہی......" آنٹی نے کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"آنٹی آپ کی تعلیم کتنی ہے؟" میں نے اچانک ہی سوال کردیا۔

"میں نے ماسٹرز کیا تھا......!" انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"ارے واہ! یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔" میں نے خوش ہو کر کہا اور حقیقت میں مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔

"آنٹی آپ نے اپنے بارے میں ہمیں کچھ بتایا نہیں کہ آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہوا تھا اور آپ شمروز کے ساتھ کیوں اپنے گھر سے جان بچا کر نکلیں۔" حشام نے کھانا ختم کرکے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا یہ بہت لمبی کہانی ہے' پھر کبھی سناؤں گی' شمروز سے بس اچانک ہی ملاقات ہوگئی تھی اور پھر دوران گفتگو ہمیں ایک دوسرے کے حالات پتا چلے اور یہ بھی پتا چلا کہ میرا اور حشام کا دشمن ایک ہی شخص ہے۔ کچھ لوگوں کو میرے بارے میں پتا چل گیا تھا یعنی انہیں میرا سراغ مل گیا تھا۔ وہ مجھے یقیناً مار دینا چاہتے تھے' اس لیے میں اچانک ہی شمروز کے ساتھ وہاں سے نکل آئی۔ شمروز کیونکہ اسی شخص کے ساتھ رہتا ہے' اس لیے وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا' اور اللہ تعالیٰ نے شمروز اور سرمئی بیٹی کی گاڑیوں کا ٹکراؤ کروا کر مجھے اس کے پاس بھیج دیا۔" آنٹی نے کہا۔

"میں اس شخص کا نام جاننا چاہ رہا ہوں کہ جو بقول آپ کے کہ آپ کا اور شمروز کا مشترکہ دشمن ہے۔" حشام نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

حشام کا سوال سن کر آنٹی بری طرح گھبرا گئیں اور بولیں۔ "نہیں نہیں میں اس ظالم کا نام بھی اپنی زبان پر لانا نہیں چاہتی۔ مجھے کوئی انصاف نہیں چاہیے۔ کسی سے انصاف نہیں چاہیے۔ میں اپنی لائف میں مطمئن ہوں...... اور یہاں آکر تو میں بہت ہی پرسکون ہوگئی ہوں۔"

"آپ ہمیں اس شخص کا نام نہیں بتانا چاہتیں لیکن شمروز تو آج ہم سے مل کر ساری کہانی سنانے والا تھا وہ تو بس اچانک ہی کسی وجہ سے ہماری اور اس کی آج کی یہ ملاقات کینسل ہوگئی' ورنہ اب تک تو ہمیں سب کچھ پتا چل چکا ہوتا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اگر وہ شخص اتنا برا ہے تو آپ اسے سامنے کیوں نہیں لانا چاہتیں۔" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ شمروز سے بھی تم لوگوں کو نہیں ملنا چاہیے' میں نہیں چاہتی کہ تم لوگ کسی طرح بھی میرے معاملے میں انوالو ہو جاؤ' جن بری باتوں پر پردہ پڑا ہے پڑا رہنے دو...... راکھ میں دبی چنگاریاں کریدنے سے شعلوں کے دوبارہ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ رہتا ہے......!" آنٹی نے کہا۔

"لیکن آنٹی......!" میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ انہوں نے میری بات کاٹ دی اور بولیں۔

"دیکھو میں تم دونوں کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں' پلیز پلیز...... تم ان سب باتوں کو بھول جاؤ...... میں نے تم سے کہا تھا ناں سرمئی بیٹی کہ مجھے ایک بے سہارا

عورت سمجھ کر اپنے گھر میں پناہ دے دو...... پتا نہیں میری زندگی کے کتنے دن باقی رہ گئے ہیں، اچھا ہے وہ دن سکون سے گزر جائیں گے۔" انہوں نے اپنے ہاتھوں کو جوڑ کر بھرائے ہوئے لہجے میں کہا، اتنے میں اماں یہ پوچھنے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے کمرے میں آئیں اور انہوں نے آنٹی کے جڑے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ التجائیہ جملے سنے تو ٹھٹک گئیں اور بولیں۔

"کیا بات ہے...... کیا ہوا ہے......؟"

"انہیں سمجھائیں حمیدہ باجی، یہ بچے ہیں نادان ہیں معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہے ہیں اور مجھ سے ضد کر رہے ہیں کہ میں انہیں اپنی کہانی سناؤں اور اس شخص کے بارے میں بتاؤں...... کیا فائدہ اب ان سب باتوں کا...... جب میں ہی ایسا کچھ نہیں چاہتی۔" آنٹی نے اپنے چھلک جانے والے آنسوؤں کو تیزی سے صاف کر کے اماں سے کہا۔

میں اور حسام تو سن بیٹھے ہی تھے اماں بھی عجیب سی ہو گئیں اور بولیں۔

"چھوڑو بیٹا...... انہیں ان کے حال میں جینے دو...... آئیں بہن آپ اپنے کمرے میں چلیں۔"

اور پھر اماں اور آنٹی کے جانے کے بعد کتنے لمحے تو چپ چاپ سرک گئے، ماحول پر بڑی گمبھیر خاموشی اور سنجیدگی چھائی ہوئی تھی، نہ جانے کیوں آنٹی کی بات سن کر میرے دل پر منوں بوجھ آن پڑا...... میرا دل بھی بھر بھر کر آ رہا تھا، جی چاہ رہا تھا کہ کسی تنہا گوشے میں جا کر ڈھیر سارے آنسو بہاؤں...... تاکہ دل کا غبار ڈھل جائے...... آنٹی کے لیے میرا دل بہت ہی دکھی ہو رہا تھا۔

"میرا خیال ہے آنٹی بہت زیادہ ڈری ہوئی ہیں سرمئی یہ ایک مظلوم خاتون ہیں۔ تمہیں ان کا بہت زیادہ خیال رکھنا چاہیے، بلکہ ایسے جیسے اپنی ماں کا......!" حسام نے اس گمبھیر خاموشی کو توڑتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہاں!" میں نے خواب کی سی کیفیت میں کہا۔

"چلو اٹھو اب زیادہ اس بارے میں مت سوچو...... ان کے اتنے زیادہ ڈرنے کی کوئی نہ کوئی ٹھوس وجہ ضرور ہوگی۔" حسام نے مجھے اس جذباتی کیفیت سے باہر نکالا۔

کچھ دیر مزید بیٹھنے کے بعد حسام اپنے گھر چلا گیا، جاتے ہوئے بھی اسے میری بے حد فکر ہو رہی تھی...... وہ مجھے بار بار ریلیکس ہونے کے لیے کہہ رہا تھا...... پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے کوئی بات کہنا چاہ رہا ہو...... مگر بار بار رک جاتا، اسی بات کو محسوس کر کے میں نے کہا۔

"حسام تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو، کوئی ایسی بات کہ اسے کہتے ہوئے تمہاری زبان جھجک رہی ہے۔"

"نن...... نہیں...... تو...... ایسی کوئی بات......"

اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "نہیں فی الحال نہیں۔ اگر دماغ میں آ گئی تو پھر کبھی اس موضوع پر بات کروں گا۔" اس نے کہا۔

"آنٹی کے بارے میں کوئی بات......!" میں نے کھوجتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ہاں ایسا ہی سمجھ لو......" اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا اور میں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

میں دروازہ بند کر کے پلٹی اور دل چاہا کہ آنٹی کے پاس جاؤں اور ان کے گلے لگ کر ڈھیر سارے آنسو بہاؤں...... اور میں اپنی اس شدید خواہش کو روک نہ سکی...... اور آنٹی کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

میں نے دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اندر سے آنے والی آوازوں کو سن کر رک گئی۔ اماں اور آنٹی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ حالانکہ اس طرح چھپ کر کسی کی باتیں سننا اخلاقی گراوٹ کی نشانی ہے، لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ آنٹی اپنے کسی راز سے پردہ اٹھانے کے لیے تیار ہی نہیں تھیں تو میں مجبور ہو گئی کہ چھپ کر ان کی باتیں سنوں کہ وہ دونوں کیا باتیں کر رہی ہیں۔ مجھے اماں کی آواز سنائی دی اور میں سرتاپا سماعت بن گئی۔

"روشن بیگم آپ نے سرمئی کو اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا...... میں جانتی ہوں کہ آپ یہاں رہ کر کتنی اذیت برداشت کر رہی ہیں...... سرمئی سے اتنا پیار کرتی ہیں، کیوں نہیں اسے اپنے سینے سے لگا کر بتا دیتیں کہ......!"

یہاں ایک دم ہی اماں کی آواز بند ہو گئی...... شاید آنٹی نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ بولیں۔

"نہیں نہیں میں اسے کچھ نہیں بتا سکتی...... وہ معصوم ہے بچی ہے، کہیں اسے کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑ جائے...... میں جانتی ہوں کہ آپ اور شمسو بابا نے اسے کس طرح اپنے بچوں کی طرح پالا ہے اور اس سے کتنی محبت کرتے ہیں......" آنٹی نے کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ آپ غلط کر رہی ہیں۔" اماں نے کہا۔

"نہیں نہیں آپ اس راز پر پردہ پڑا رہنے دیں تو بہتر ہے، اور میری دلی خواہش ہے کہ یہ لوگ شمروز سے کبھی نہ ملیں، کیونکہ میں اسے اپنے بارے میں ہر بات بتا چکی ہوں۔ اس بدبخت نے اس بچارے کے بھی پورے گھرانے کو تباہ و برباد کر دیا ہے اور ستم تو دیکھیں کہ وہ الٹا اس کا احسان مند ہو کر اس کی چاکری کر رہا ہے......" آنٹی نے کہا۔

اب میرا دل قابو سے باہر ہونے لگا، دماغ کی رگیں یہ سوچ کر پھٹنے لگیں کہ آخر صرف مجھ سے اتنا سب چھپانے کی کیا وجہ ہے...... آخر وہ کون ہے......؟ میں کیا کروں کس سے اس بات کا پتا لگاؤں...... مجھے اماں کا خیال آیا...... کہ یقیناً اماں اس آدمی کو جانتی ہوں گی۔ میں ان سے پوچھ لوں گی۔

لیکن اماں مجھے کیوں بتائیں گی...... آنٹی نے انہیں جو سختی سے منع کر رکھا ہے...... لے دے کر ایک شمروز کا نام رہ گیا تھا کہ وہی ہے جو ان رازوں سے پردہ اٹھا سکتا ہے، میں اس سے ضرور ملوں گی، بھلے اماں اور آنٹی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی پھر میں نے فیصلہ کر لیا...... اور وہاں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ میں نے امی کا بند کمرہ کھولا اور چپکے سے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا، اندر آ کر میں جی بھر کر روئی...... پھر مجھے امی کی خوشبو آنے لگی...... مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے امی نے میرا سر اپنے سینے سے لگا رکھا ہو، میں روتی رہی اور پھر میری آنکھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد خود ہی میری آنکھ کھل گئی۔ شاید دس پندرہ منٹ میری آنکھ لگی ہو گی میں اٹھ کر بیٹھ گئی، ایک بار پھر امی کی الماری کھولی اور وہ ساری چیزیں دراز سے نکال کر دیکھیں جو امی نے میرے باپ کی نشانیاں سمجھ کر سنبھال کر رکھی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر اپنے تصور میں نواب سطوت کے گلے کے تعویز اور اسٹک کو تازہ کیا اور اپنے پاس موجود چیزوں کو غور سے دیکھا، حقیقت میں ان میں ذرا بھی فرق نہیں تھا۔ پھر میں نے امی کی ڈائری کو ایک بار پھر غور سے پڑھا...... لیکن کوئی نئی بات نہیں محسوس ہوئی۔ پھر میں سب کچھ دوبارہ سے اسی طرح سمیٹ کر اسی خاموشی سے کمرے سے نکل آئی، میں نے بابا کے کمرے میں جھانک کر دیکھا...... بابا سو رہے تھے اور اماں نماز

عشاء پڑھ رہی تھیں۔ آنٹی کے کمرے کا دروازہ بند تھا...... اماں یہ سمجھ رہی ہوں گی کہ میں اپنے کمرے میں سو چکی ہوں۔ میں چپ چاپ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اماں کو نماز پڑھتے دیکھا تو یاد آیا کہ مجھے بھی نماز پڑھنی ہے، میں نے وضو کیا اور اپنے وجود اور دل کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ اللہ کے آگے سر بسجود ہوگئی۔ نماز سے فارغ ہو کر خوب گڑگڑا کر اپنے لیے اللہ سے دعا کی...... جب سے آنٹی سے بات ہوئی تھی، دل کو عجیب سی بے چینی اور بے قراری نے آن گھیرا تھا۔ اور اس بے چینی اور بے قراری کا کوئی سبب بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...... میں نے اللہ سے اپنے سکون قلب اور آنٹی کے لیے ڈھیر ساری دعا کی......

دعا سے فارغ ہوئی تو دل کو ایک طمانیت کا احساس ہوا اور میں مطمئن ہو کر گہری نیند سوگئی آج رات پھر ایک بار میں نے اللہ کے مضبوط دامن کو تھام لیا تھا۔

دوسرے دن علی الصبح بیدار ہوگئی، رات اچھی اور گہری نیند آئی تھی، فجر کی نماز سے فارغ ہو کر دل چاہا کہ تلاوت قرآن پاک کروں...... مجھے یاد ہے امی نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ جب تمہارا اللہ سے بات کرنے کا دل چاہے تو تم نماز پڑھنے کھڑی ہو جایا کرو اور جب تم یہ چاہو کہ اللہ تم سے بات کرے تو تم القرآن کو کھول کر تلاوت کیا کرو...... اور جو تلاوت کرو ان آیات کے معنی اور مطالب پر غور و فکر کیا کرو...... جب بھی کوئی پریشانی ہو تو اپنے اللہ سے رجوع کرو...... قرآن سے رجوع کرو، اس سے راہ نمائی مانگو...... وہ ضرور خیر کی جانب تمہاری راہنمائی کرے گا۔

میں امی کے بارے میں سوچنے لگی کہ امی کا ماضی کتنا سیاہ تھا لیکن جب انہوں نے توبہ کی اور اللہ کی جانب پلٹیں تو پوری کی پوری اسلام میں داخل ہوگئیں...... میں نے ان کا زیادہ تر وقت نماز اور قرآن میں گزرتا ہوا دیکھا تھا۔

تلاوت قرآن کر رہی تھی کہ اماں میرے لیے چائے لے کر آ گئیں، چائے پی کر میں نے ٹی وی آن کر لیا، اپنا نیوز چینل دیکھنے لگی...... ایک سیاسی جماعت کے کچھ کارکنوں نے بھوک ہڑتال کا کیمپ لگایا ہوا تھا...... میں ٹی وی پر خبریں دیکھنے لگی، تب ہی رمضانی صاحب کی کال آ گئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ آج جلدی چینل پر آ جائیں...... ایک معروف سیاسی جماعت کے بھوک ہڑتالی کیمپ کی کوریج کے لیے جانا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ بس آدھے گھنٹے میں نکل رہی ہوں تو انہوں نے اپنے پرانے سڑے ہوئے انداز میں کہا۔ ''آپ خواتین کے پندرہ منٹ ہی دو گھنٹوں پر محیط ہوتے ہیں، اب آپ آدھا گھنٹا کہہ رہی ہیں تو پتا نہیں کب پہنچیں گی۔''

''نہیں جناب میرے دروازے پر ایک طیارہ کھڑا ہے، بس اسی پر پرواز کر کے دو منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔'' اپنی بات کہہ کر میں نے فون بند کر دیا، فوراً ہی دوبارہ فون کی بیل بجی میں پوری جان سے ہی جل گئی کہ موصوف میرے جواب سے تلملا گئے ہوں گے اسی لیے دوبارہ فون کر دیا ہے لیکن اسکرین پر مجھے حشام کا نمبر دکھائی دیا تو میں نے سکون کا گہرا سانس لیا اور چھوٹتے ہی کہا۔

''مجھے معلوم ہے بھوک ہڑتالیوں کی کوریج کے لیے جانا ہے، بس ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ رہی ہوں۔''

''اللہ خیر کرے...... کیا رمضانی صاحب کا فون آ گیا۔''

''جی ہاں......'' میں نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

''اوکے...... تم پہنچو میں بھی بس نکل ہی رہا ہوں۔'' حشام نے مزید کوئی بات نہیں کی اور فون بند کر دیا۔

میں نے اماں کو ناشتے کی آواز لگائی اتنی دیر میں ڈریس اپ ہو کر اور جلدی جلدی بالوں میں برش پھیر کر کلپ لگا لیا، اور اپنے طیارے یعنی سوزوکی مہران کو اڑاتی ہوئی چینل پر پہنچ گئی۔

وہاں سے حشام اور اپنی کیمرہ ٹیم کے ہمراہ ہم بھوک ہڑتالی کیمپ تک پہنچ گئے۔ اس سلسلے میں کئی روز تک ہمارا آنا جانا رہا...... اس کے علاوہ کوئی دوسرا کام ہی نہیں کیا۔

بھوک ہڑتالی کیمپ سے سیاسی جماعت کے پچاس سے زیادہ کارکن گرفتار کر لیے گئے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ میڈیا کے ذریعے جس حد تک بھی ممکن ہو لوگوں کو اس مسئلے کی جانب متوجہ کریں اور بالکل صحیح صورت حال سامنے لے کر آئیں، ہم نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ (یہ رمضانی صاحب کا حکم تھا) کہ فی الحال صرف بھوک ہڑتالیوں کا موقف بیان کیا جائے اور حکومت کے خلاف کوئی بات نہ کی جائے۔

بھوک ہڑتال کے کیمپ ایک نہیں مختلف جگہوں پر قائم کیے گئے تھے، سارے دن ہماری بھاگ دوڑ ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ جاری رہتی اس سلسلے میں کافی ساری تھکن بھی ہوگئی۔ ان دنوں گرمی بھی کچھ زیادہ ہی پڑ رہی تھی۔

پھر پتا چلا کہ ان بھوک ہڑتالیوں نے اپنا کیمپ ایک مشہور مسجد میں لگا لیا ہے۔ ہم نے اس بات کا خیال رکھا کہ کہیں ان بھوک ہڑتالیوں کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس والے مسجد میں جوتوں سمیت نہ گھس جائیں، لیکن ہمارے بہت روکنے پر بھی پولیس نے کچھ خیال نہیں کیا اور مسجد میں جوتوں سمیت گھس کر جتنے لوگوں کو گرفتار کر سکتے تھے گرفتار کر لیا۔

کچھ کارکنان گرفتاری سے بچنے کے لیے نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہوگئے اور پولیس والے بھی ان کی چالاکیوں کو سمجھ رہے تھے، وہ بھی ان کارکنوں کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے، بعض پولیس والے سمجھ رہے تھے کہ وہ کارکن گرفتاری سے بچنے کے لیے ایسا کر رہے ہیں، تو میں نے کیمرے کے ذریعے انہیں خبردار کیا کہ آپ نماز میں مصروف لوگوں کو گرفتار نہیں کر سکتے......

''بی بی آپ ان جھوٹے لوگوں کا ساتھ دے رہی ہیں، ہمیں اوپر سے آرڈر ملا ہے کہ انہیں ہر حال میں گرفتار کرنا ہے، حکومت ان کے بے جا مطالبات ماننے کے لیے ان کی بھوک ہڑتال کے آگے بلیک میل نہیں ہوگی۔''

''میں کسی سیاسی جماعت کا ساتھ نہیں دے رہی ہوں۔ میں صرف اس اصولی بات کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی ہوں، کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ ان لوگوں کے مطالبات ناجائز نہیں ہیں۔''

یہ ساری کوریج لائیو دکھائی جا رہی تھی۔ مسجد میں، میں اپنی کیمرہ ٹیم کے ہمراہ موجود تھی۔ پولیس والے نماز میں مصروف لوگوں کو پکڑ پکڑ کر کھینچنے لگے، میں نے آگے بڑھ کر اس بات پر احتجاج کیا تو بعض پولیس والوں نے میرے ساتھ بدتمیزی کی، مجھے دھکا دیا گیا، میرے ہاتھ سے مائک گر پڑا اور میں خود بھی نیچے گر گئی۔ بعض پولیس والوں نے کیمرہ مین صابر سے کیمرہ چھین لیا، عجیب افراتفری مچ گئی۔ مسجد میں لوگوں کا ایک ہجوم امڈ آیا تھا، ان کارکنوں کے ساتھ ساتھ پولیس نے کچھ غیر متعلق لوگ جو مسجد میں صرف نماز پڑھنے کے لیے آئے تھے انہیں بھی گرفتار کر لیا اور سب کو اپنی موبائل میں ڈال کر تھانے لے

گئے۔
اس کے بعد دوسری ہی کہانی شروع ہوگئی۔ بھوک ہڑتالی کیمپ تو ختم ہوگئے' اب ان ناجائز گرفتاریوں کے خلاف احتجاج اور لانگ مارچ شروع ہوگئے۔ ہڑتالیں ہونے لگیں' جو لوگ گرفتار ہوئے تھے ان کے گھر والے سراپا احتجاج بنے تھے۔ مظاہرے جاری تھے۔ تقریباً ایک ہفتے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میں تھکی ہاری رات کو گھر پہنچتی اور کھانا کھا کر سو جاتی اور بس چلتے پھرتے ہی سب کی خیریت پوچھ لیتی۔ البتہ بابا کی صحت بہت بہتر ہوگئی تھی اور وہ بستر سے اٹھ کر چلنے پھرنے لگے تھے' سارا سارا دن نیوز چینل لگائے ٹی وی دیکھتے رہتے تھے۔

پولیس نے جو میرے ساتھ بدسلوکی کی تھی اور ہمارے کیمرہ مین سے کیمرہ چھین کر اس کی پٹائی بھی لگائی تھی' اس کے خلاف بھی میڈیا نے احتجاج کیا..... اور ساری صحافی برادری ہمارا ساتھ دینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور یہاں ہمارا ساتھ اس سیاسی جماعت نے بھی دیا' جن کے کارکنان بھوک ہڑتال کر رہے تھے۔

اس بات کا نوٹس لیتے ہوئے آئی جی نے ان تمام پولیس والوں کو معطل کرنے کا حکم دے دیا' جنہوں نے مسجد کا تقدس پامال کیا تھا' انہوں نے میڈیا سے پولیس کی اس بدسلوکی پر معذرت بھی کی۔

ہم اپنے چینل پر ہی تھے کہ اطلاع ملی کہ اس سیاسی جماعت کے قائدین..... مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔

رمضانی صاحب یہ سن کر چوڑے ہوگئے..... اور انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور ان سیاسی لیڈروں سے ملوایا..... انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ نے بہت بہتر اور مثبت طریقے سے ہماری جماعت کا پیغام عام لوگوں تک پہنچایا اور پھر حکومت نے بھی اس بات کا نوٹس لیا' ہمارے کافی سارے مطالبات کی منظوری دے دی ہے' آپ نے خود ذاتی طور پر اتنی زیادہ تکلیف اٹھائی اس کے لیے ہم آپ کے چینل کے بہت شکرگزار ہیں اور خاص طور پر سرمئی بی بی آپ کے......"

انہوں نے ہمیں اس بات کی دعوت بھی دی کہ ہم نے جو جنگ حکومت سے جیتی ہے اس کی خوشی میں ہمارے کارکنان اور ہم نے دعوت کا انتظام کیا ہے اور ہم خاص طور پر آپ لوگوں کو مدعو کرنے آئے ہیں۔ میں اور میری ٹیم کے علاوہ رمضانی صاحب کو بھی مدعو کیا تھا لیکن رمضانی صاحب نے تو فوری طور پر معذرت کرلی کہ وہ اس دعوت میں نہیں آسکیں گے' البتہ یہ لوگ سامنے موجود ہیں ان سے آپ معلوم کرلیں یہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔

"ایک بات کا خیال رہے کہ ہماری یہ دعوت خالص نجی قسم کی ہے' اس لیے اس میں میڈیا کے لوگ شامل تو ہوں گے لیکن مائک اور کیمرے کے بغیر..... ہاں البتہ اس دعوت کی خبر آپ زبانی طور پر اپنے چینل سے نشر ضرور کرسکتے ہیں۔" ان کے ایک لیڈر نے کہا۔

"جناب' ہم بغیر مائک اور کیمرے کے کہیں بھی نہیں جاتے..... مائک اور کیمرے کے بنا ہم ادھورے ہیں۔ آپ نے ابھی تو بتایا ہے کہ یہ خالص نجی قسم کی محفل ہے تو ہماری جانب سے بھی معذرت قبول کیجیے۔" میں نے مصلحت کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بڑی خوش دلی سے انکار کردیا۔

"نہیں محترمہ ہم آپ کو اس سے معذرت نہیں کرنے دیں گے..... آپ کو تو آنا ہی پڑے گا..... اسے آپ ہمارے بانی جماعت شہزاد فاضل صاحب

کی گزارش سمجھ لیں۔" انہوں نے کہا تو میں نے بے چارگی سے رمضانی صاحب کی جانب دیکھا تو انہوں نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ "تم ہی جانو" مجھے اس وقت ایک بار پھر رمضانی صاحب پر بڑا تاؤ آیا' لیکن میں کیا کرسکتی تھی' اس لیے زبردستی کی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجاتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے' آپ اتنی ضد کر رہے ہیں تو میں اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکالنے کی کوشش کروں گی۔"

"یہ کی ناں آپ نے دل خوش کرنے والی بات..... اب دیکھیے ناں ہم لوگ بھی تو میڈیا کے تعاون کے بغیر کچھ بھی نہیں کرسکتے..... آپ بالکل بے فکر ہوکر آئیں' آپ کے عزت واحترام میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی..... بلکہ ہمیں تو آپ جیسی نڈر بے باک اور بے لوث جرنلسٹ پر فخر ہے....." اس نے خوش ہوکر کہا۔

بعد میں' میں اس بات پر رمضانی صاحب سے باقاعدہ لڑ پڑی کہ انہوں نے خود تو معذرت کرلی اور میرے لیے ایک لفظ بھی نہیں کہا..... کوئی بھی ضروری کام نکال کر کہہ دیتے کہ میں اس وقت وہاں مصروف ہوں گی' آ نہیں سکتی۔"

"بھئی میرے خیال میں کوئی حرج بھی نہیں ہے وہاں جانے میں..... تم انکار کیوں کر رہی ہو..... اور پھر تم اکیلی تھوڑی جا رہی ہو..... تمہارے ساتھ حشام اور دوسرے لوگ بھی تو موجود ہوں گے..... بھئی ہمارا اور ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے' یہ ہمارے بنا اور ہم ان کے بنا ادھورے ہیں۔" رمضانی صاحب نے کہا تو حشام نے بھی کہا کہ وہاں جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

میں نے اماں بابا کو ساری بات بتائی اور سمجھا کر دعوت میں جانے کی اجازت لے لی' بابا نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ حشام میرے ساتھ موجود ہوگا اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں بھی حشام کی سنگت کی وجہ سے مطمئن تھی۔

وقت مقررہ پر ہم اس مقام پر پہنچ گئے' یہ اس سیاسی جماعت کے ایک قائد کی کوٹھی تھی' جو قومی اسمبلی کے رکن بھی تھے' اس کے علاوہ ایک دو صوبائی وزیر جو اس سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے' موجود تھے' ایک دو قومی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی..... اور کچھ فلمی اور ٹی وی کے اداکار بھی موجود تھے۔

یہاں اس نجی محفل میں آکر میں نے نوجوانوں اور جوانوں کی زندگی کا دوسرا رخ بھی دیکھا۔

میں بہت سی نوجوان لڑکیوں سے ملی' جو اس سیاسی جماعت کی کارکن تھیں' جو بہت ہی ماڈرن اور بہت ہی خوداعتماد تھیں اور انہیں اس بات پر بھی کوئی شرم نہیں محسوس ہو رہی تھی کہ انہیں ان کے اس بے باک اور ماڈرن ڈریس میں کتنے لوگ گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔

مجھے شاید اس بات کی خبر نہیں تھی کہ ہمارے اسلامی ملک پاکستان میں اس قسم کی نجی محفلیں بھی ہوتی ہیں' یہاں موجود لڑکیوں کو میں نے نفسیاتی اور معاشرتی حجابات سے آزاد دیکھا' وہ چست جینز اور منی سکرٹ میں ملبوس تھیں انہیں اپنی کھلی ٹانگوں پر بھی ذرا حجاب نہیں تھا۔

اس روز مجھے یہ ادراک ہوا کہ یہ وہ نسل ہے جو میڈونا' ایا کوکا اور ڈونلڈ ٹرمپ کی پرستار ہے جدلیاتی مادیت کی جگہ مادہ پرستی لے چکی ہے۔

اتنی دیدہ دلیر بننے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ یہاں شراب کے جام چھلکائے جا رہے تھے۔

ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر رقص کیا جارہا تھا' ایک فلمی اداکارہ کو میں نے اس سیاسی جماعت کے قائد کے گلے میں جھولتے دیکھا۔

میرا دل یہاں بہت بری طرح گھبرا رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو یہاں مس فٹ محسوس کر رہی تھی۔ کھانا شروع ہوا تو میں اور حشام ایک جانب اپنی پلیٹیں لے کر کھڑے ہوگئے' تب ایک کارکن ہمارے پاس آیا اور ہمیں اپنے ساتھ لے کر یہ کہہ کر چلا کہ آپ کو شہزاد صاحب نے بلوایا ہے۔

اس نے ہمیں اپنے ساتھ بٹھایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے کہ آپ پارٹی کو انجوائے نہیں کر رہی ہیں۔"

"جی ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ دراصل میں نے آج سے پہلے کبھی اس قسم کی پارٹی میں شرکت نہیں کی ہے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"اوہ آئی سی...... جب ہی تو......" اس نے ایک اونچا قہقہہ لگایا۔ "دراصل ہماری پارٹی میں ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگ شامل ہیں اور ایسی پارٹیوں میں ہمیں سب ہی کے ذوق کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ آپ بھی یہی بات سوچ کر اس کو برداشت کر لیں۔"

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اجازت لے لینی چاہیے۔" میں نے کہا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ یہاں آپ جو کچھ دیکھ کر جارہی ہیں یا آپ کے جو بھی احساسات ہیں انہیں یہیں چھوڑ کر جائیے گا' ہم اپنی نجی محفلوں کی تشہیر برداشت نہیں کرتے...... مجھے امید ہے کہ بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ میرے کہنے کا مطلب کیا ہے' ہاں اس پارٹی کے بارے میں کیا نیوز نشر ہونی چاہیے' وہ آپ کو یہاں سے مل جائے گی' جو آپ کو من وعن نشر کرنی ہوگی......" اس نے کھا جانے والی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ بات تو آپ کو رمضانی صاحب سے کرنی چاہیے...... وہی ہمارے چینل کے نیوز بیورو چیف ہیں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"انہیں ساری بات سمجھا دی گئی ہے۔ آپ اپنی سوچ وہیں تک محدود رکھیں جہاں تک میں نے کہا ہے' ورنہ دوسری صورت میں......" وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

"کیا آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں......؟" میں نے بے خوفی سے کہا۔

"ارے لاحول ولاقوۃ...... میں بھلا ایسا کیسے کرسکتا ہوں' آپ تو ہمارے دوستوں میں سے ہیں' آپ نے ہمارا اتنا ساتھ دیا اسی لیے تو یہ سارا اہتمام کیا گیا ہے' بس آپ خوشی خوشی جائیے اور ان سب باتوں کو بھول جائیے' اور ہاں کبھی کوئی کام کوئی ضرورت ہو...... تو اپنے اس خاکسار کو ضرور یاد رکھیے گا......" اس نے کہا اور دوسری جانب مڑ گیا۔

میرا موڈ بہت زیادہ آف ہوگیا تھا' مجھے اپنی وہ غلطی آج بھی پچھتاوا بن کر تنگ کرتی ہے کہ میں نے بھوک ہڑتالیوں کے سلسلے میں ان کی حمایت کر کے کی تھی۔ بعد کے سالوں میں یہ سیاسی جماعت کوئی اور ہی رنگ لے کر مزید ابھری...... غنڈوں اور بدمعاشوں کے ٹولے اس سیاسی جماعت میں شامل ہوگئے...... اور ملک میں غنڈہ گردی کا بازار گرم کر دیا...... ملک کی آبادی کا ایک بہت بڑا طبقہ جو بغیر پڑھا لکھا تھا' اس سیاسی جماعت کو آگے بڑھانے میں مدد ثابت ہوا۔

حشام حسب عادت مجھے گھر تک چھوڑنے کے لیے آیا' اور اس دن تو اسے آنا ہی تھا' کیونکہ میں اپنی گاڑی نہیں لے کر گئی تھی' حشام نے مجھے گھر سے ہی پک کیا تھا' وہ سارے راستے میرے بگڑے ہوئے موڈ کو درست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

"اب چھوڑو بھئی سرمئی' یہ سارے سیاسی لیڈر ایسے ہی ہوتے ہیں' سب کی ایک ہی کہانی ہے' ملک کے بارے میں کوئی نہیں سوچتا' سب کو صرف اپنی فکر اپنے بینک بیلنس کو بڑھانے کی فکر ہوتی ہے' پبلک کے سامنے ان کا چہرہ کچھ اور ہوتا ہے اور اندر خانہ کچھ اور...... یہ سب مل کر اس ملک کو ہڑپ کرنے کی فکر میں ہیں۔ بس جس کا داؤ جس شعبے میں چل جاتا ہے وہ اسے تباہ کر رہا ہے۔ اب میں اور تم آج اس پارٹی میں جو کچھ بھی دیکھ کر آئے ہیں وہ کوئی نئی بات نہیں ہے' ایسا تو عام طور پر ہوتا ہی ہے' میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ شہزاد نے بطور خاص تمہیں کیوں کہا۔"

"اگر اسے یہ سب خفیہ ہی رکھنا تھا تو اس نے ہمیں مدعو ہی کیوں کیا تھا۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"بس......! میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ لیکن میرا تمہیں ایک مشورہ ہے کہ تم اس سلسلے میں اپنی زبان بند ہی رکھنا۔ کسی سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" حشام نے ایک گہرا سانس لیا اور مجھے مشورہ دیا۔

"تو تم مجھے ڈرا رہے ہو' میرا خیال ہے کہ میں صحافت چھوڑ ہی دیتی ہوں۔ اور گھر میں بیٹھ کر چولہا ہانڈی کروں۔" میں نے تپ کر کہا۔

"میں تمہیں نہ ڈرا رہا ہوں اور نہ گھر بیٹھنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ بس تم جو کام کر رہی ہو وہ ہی کرتی رہو' اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو' زبان تمہارے اختیار میں ہے جو کہنا چاہو گی' کہو گی' میں تمہیں اس لیے بھی سمجھا رہا ہوں سرمئی کہ آج کل کا دور بہت خراب ہے' یہاں آئے دن ہم اپنے چینل پر یہی خبریں دیتے ہیں کہ فلاں بندے کو مار دیا' یا فلاں لڑکی اغوا کر لی گئی' اس کی عزت پامال کر کے اسے قتل کر دیا گیا۔ پولیس تماشائی بنی سب کچھ دیکھتی رہتی ہے' اسے جہاں سے چار پیسے ملیں گے وہ اسی کی زبان بولے گی۔"

"تو ڈیئر یہ مت بھولو کہ تم ایک عورت ہو اور عورت کے پاس سب سے قیمتی شے اس کی عصمت ہوتی ہے' تمہیں کسی سے بھی پنگا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس بھول جاؤ' جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا......" حشام نے دھیرے دھیرے بہت تلخ بات مجھے سمجھائی اور میں نے محسوس کیا کہ گویا اس نے مجھے عورت کہہ کر میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے ہوں۔ میں کیسی جرنلسٹ ہوں' میں برائی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لوں...... کہیں کوئی بڑا پیسے والا شخص ظلم و جبر کر رہا ہے' تو کرنے دوں اس کے خلاف آواز نہ اٹھاؤں...... اسے لوگوں کے سامنے نہ لے کر آؤں......

صرف اس لیے کہ میں ایک کمزور عورت ہوں...... اور میری عزت وعفت ایک شبنم کے قطرے کی مانند ہے کہ سورج کی پہلی ہی کرن اس کے وجود کو ختم کر دے گی۔

مجھے بے پناہ بے بسی کا احساس ہوا...... اور میری آنکھیں ڈھیروں نمکین پانی سے بھر گئیں۔ لیکن حشام کے آگے میں یہ نمکین پانی بہا کر خود کو حقیقت میں ایک کمزور عورت ثابت کرنا نہیں چاہ رہی تھی' اس لیے بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ حشام میری خاموشی کو محسوس کر کے بولا۔

"سرمئی...... اے سرمئی...... کیا ہوا...... ناراض ہوگئیں...... سوری ڈیئر میں نے تم سے بہت تلخ بات

کہہ دی، لیکن یہی حقیقت ہے، مجھے پتا ہے کبھی کبھی کیسا احساس ہوتا ہے، جیسے ہم اس دور سے بھی بدتر دور میں جی رہے ہیں کہ جب اسلام کا نور اس دنیا میں نہیں پھیلا تھا، وہی جاہلانہ معاشرہ، وہی جاہلانہ سوچ...... آج اپنی جس سوچ کو ہم اصول پسندی ترقی پسندی اور ماڈرن ازم کا نام دیتے ہیں، شاید ہم سے بہتر تو اس دور کے لوگ تھے، بعض اوقات بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے نا چاہتے ہوئے بھی......!'' وہ بہت نرم اور دھیمے لہجے میں مجھے سمجھا رہا تھا۔

میں اب بھی خاموش تھی اور میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، تو وہ بولا۔

''دیکھو اگر تم اب بھی نہیں بولیں ناں تو میں اپنی گاڑی کو کہیں ٹکرا دوں گا...... یار اتنی دیر سے تمہارے ساتھ سر پھوڑ رہا ہوں...... اور تمہارے مزاج ہیں کہ کہیں تفریح کرنے کے لیے چلے گئے ہیں۔ ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہے۔''

اس کے اس طرح سے کہنے سے میں ہنس پڑی تو وہ بھی کھل کر مسکرا دیا۔ اور بولا۔ ''گڈ گرل......!'' اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''سامنے دیکھ کر گاڑی چلاؤ...... کہیں سچ مچ ہی نہ ٹکرا دینا...... بھئی میں ابھی مرنا نہیں چاہتی، بہت سارا جینا چاہتی ہوں۔'' میں نے ساری باتیں سر کو جھٹک کر اپنے ذہن سے نکال دیں اور ہنستے ہوئے کہا۔

''تو میں کون سا مرنا چاہتا ہوں...... ارے بابا ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی ہے، کہیں میری ''وہ'' میرا انتظار ہی نہ کرتی رہ جائے...... اور میں اسے دھوکا دینا نہیں چاہتا۔''

حسام کی بات سن کر میرے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی اور میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کون ہے وہ......؟''

''ہے ایک......!'' اس نے مزے سے کہا۔

''ہاں تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ دس بیس ہیں۔ ظاہر ہے ایک ہی ہوگی...... مگر ہے کون......؟'' میں نے حسب عادت چڑ کے کہا۔

''وقت آنے پر بتا دوں گا۔'' اس نے کہا۔

''کون سا وقت......؟'' میں نے ضدی لہجے میں پوچھا۔

''یہ بتاؤ کہ تمہیں میری ''اس'' سے اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو رہی ہے...... وہ جو بھی ہو......!'' وہ مجھے تنگ کرنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔

''کیوں میں تمہاری دوست نہیں ہوں۔'' میں نے روٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ہو...... لیکن......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''میں تمہارا سر توڑ دوں گی حسام...... تم مسلسل مجھے تنگ کر رہے ہو، اب اس لیکن کا مطلب!'' میں نے غصے میں اس کے سارے بال بگاڑ دیئے۔

''ارے...... رے...... رے...... کیا کر رہی ہو، گاڑی ڈرائیو کر رہا ہوں۔ ایکسیڈنٹ کرواؤ گی، یہ ہاتھاپائی ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔

''بتاؤ ناں......!'' میں نے بچوں کی طرح ٹھنک کر کہا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور بولا۔

''اگر میں نے تمہیں بتا دیا ناں تو تمہیں اچھا نہیں لگے گا...... اس لیے فی الحال اس موضوع کو ختم کرتے ہیں اور کوئی دوسری بات کرتے ہیں۔'' اس نے عجیب سی بات کہہ کر بات ہی ختم کر دی اور میں اس کے جملے میں الجھ کر رہ گئی کہ اس کا اس بات سے کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔

میں اسی بات کو سوچ کر الجھ رہی تھی، پتا نہیں کیوں میرا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ حسام یہ کہہ دے۔

''وہ لڑکی تم ہی ہو سرمئی...... میں تو نہ جانے کب سے تمہیں چاہ رہا ہوں۔ پور پور تمہارے عشق میں ڈوبا ہوا ہوں...... تمہارے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتا...... اور پتا نہیں کیا کیا۔

لیکن اس نے بات ہی ختم کر دی...... کہیں وہ کسی اور کو تو اپنے دل میں نہیں بسا بیٹھا۔ اگر ایسا ہے تو پھر...... تو پھر...... امی کی بات سچ ہو جائے گی...... یہ مرد ذات ہوتی ہی ایسی ہے۔ حسام کے ذومعنی جملوں کو میں نے اس کی محبت جان لیا۔ اسے اپنے دل میں بسا لیا، اب کیا صرف وہ یہ کہہ کر پیچھے ہٹ جائے گا کہ وہ میرا بہترین دوست ہے...... اس نے ایسا کیوں کہا کہ تمہیں برا لگ جائے گا...... اس کا صاف مطلب ہے کہ اس نے اپنے دل میں کسی اور کو بسایا ہوا ہے۔

میں اپنے سامنے منہ پھاڑے اتنے سوالوں سے اتنی بری طرح گھبرائی کہ میرے منہ سے اچانک ہی نکل گیا۔

''حسام کیا تم سچ مچ کسی اور سے......!''

''کسی اور سے کیا......؟'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔'' مجھے جیسے ہی اپنے سوال کی حقیقت کا ادراک ہوا تو میرے ہاتھوں میں پسینہ آ گیا۔ کہ یہ میرے منہ سے کیا نکل گیا۔ اور میں بری طرح گھبرا گئی۔

''بتاؤ ناں کسی اور سے کیا؟'' وہ بدستور شرارت آمیز لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں، شرافت سے سیدھی طرح گاڑی چلاؤ۔'' میں نے موڈ بدل کر کہا۔

''چلا تو رہا ہوں اور کس طرح چلاؤں......'' حسام نے کہا اور پھر ہماری یہ بحث اور نوک جھونک اختتام پذیر ہوئی، اس لیے کہ میرا گھر آ گیا تھا۔ حسام نے گاڑی کو بریک لگائے تو میں اتر گئی۔ اللہ حافظ کہہ کر جب میں پلٹنے لگی تو حسام نے مجھے آواز دی۔

''سرمئی بات سنو!''

''ہاں! اب کیا رہ گیا ہے......'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا

''پہلے موڈ ٹھیک کرو، پھر بتاؤں گا۔'' اس نے میری آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے کہا۔

پہلے جب وہ اس طرح مجھے دیکھتا تھا تو میں مزید بکھر جاتی تھی، لیکن اب اس کی یہ بہت کچھ کہتی نگاہیں میرے ہاتھ پیروں میں کپکپاہٹ پیدا کر دیتی تھیں۔

''بولو ناں......! کیا بات ہے؟'' میں نے نگاہیں نیچی کر کے دھیمی آواز میں کہا۔

''تمہیں پتا ہے سرمئی اس طرح بات کرتے ہوئے تم بہت اچھی لگتی ہو، کیا تم ہمیشہ مجھ سے اسی طرح بات نہیں کر سکتیں۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''اچھا بابا ٹھیک ہے، اب کہو بھی کیا کہہ رہے تھے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کل چھٹی ہے، اگر چینل سے اچانک بلاوا نہیں آیا تو تم کل کا سارا دن میرے گھر گزار رہی ہو۔'' اس نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

''وہ کس خوشی میں؟'' میں نے کہا۔

''میں تمہیں بتانا بھول گیا، ممی پاپا دونوں نے تمہیں بلایا ہے، کوئی کام نہیں ہے، بس یوں ہی......!'' وہ بولا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں بابا کی طبیعت دیکھوں گی اگر ٹھیک رہی تو میں آ جاؤں گی۔'' میں نے آمادگی ظاہر کر دی، میرا خود بھی دل چاہ رہا تھا۔

"میں کل لنچ پر تمہارا انتظار کروں گا' ٹیک کیئر' اینڈ گڈ نائٹ۔" اس نے کہا اور گاڑی آگے بڑھالی اور میں اندر چلی آئی۔

دوسرے دن صبح سو کر اٹھی تو میں کافی حد تک فریش تھی' اماں نے زبردست ناشتہ کروایا' بابا کی طبیعت بھی ٹھیک تھی' اس لیے میں نے حشام کے گھر جانے کا پروگرام بنالیا۔

"لو بیٹا ہم تو سوچ رہے تھے کہ آج تم سارا دن ہمارے ساتھ گزارو گی۔ اتنے دن سے مصروف تھیں تو دو گھڑی بات کرنے کا بھی ٹائم نہیں ملا۔ آج چھٹی ہے تو تم حشام کے گھر چلدیں۔" اماں نے کہا۔

"میں جلدی آجاؤں گی اماں ...... دراصل حشام کے مما پاپا نے بلوایا ہے' انکل سے ملاقات ہوتی ہے تو مجھے بہت کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"جانے دے نیک بخت ...... ہماری بیٹی جس طرح خوش رہے' ہم تو اس کی خوشی میں خوش ہیں۔" بابا نے کہا تو میں ان کے گلے لگ گئی۔

حشام کی ممی بہت محبت سے ملیں اور دیکھتے ہی فکرمندی سے بولیں۔

"کیا بات ہے بہت کمزور ہو رہی ہو' کیا ٹھیک سے کھانا نہیں کھاتیں۔"

"بس آنٹی ...... آپ کو تو پتا ہے پچھلے پندرہ دن کتنے مصروف گزرے ہیں۔ حقیقت تو وہی ہے کہ نہ ڈھنگ سے کھانا کھا سکی اور نہ سو سکی ہوں۔"

کھانے کی میز پر انکل سے باتیں ہوتی رہیں' انہوں نے سیاسی لیڈر شہزاد کے بارے میں مجھے کافی کچھ بتایا' اور وہی نصیحت اور ہدایت کی جو حشام مجھے پہلے کر چکا تھا' میں سر جھکائے ان کی باتیں سنتی رہی۔

کھانے کے بعد انکل اور آنٹی آرام کی غرض سے ہمارے درمیان سے اٹھ گئے' یہ کہہ کر کہ تم دونوں باتیں کرو...... میں نے انہیں بتا دیا کہ میں اب تھوڑی دیر میں چلی جاؤں گی' میں نے اماں سے وعدہ کیا تھا کہ جلدی لوٹ آؤں گی اس لیے وہ دونوں مجھے اللہ حافظ کہہ کر چلے گئے۔

میں اور حشام باتیں کرنے لگے' ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد حشام نے مجھ سے کہا۔

"سرمئی میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہ رہا تھا' لیکن ہماری مصروفیات کچھ ایسی رہیں کہ وہ بات میں کر نہیں سکا' کیونکہ وہ بات بہت اطمینان سے بیٹھ کر کرنے کی ہے۔"

"ایسی کون سی بات ہے؟" میرا دل دھڑک اٹھا۔

"مجھے حیرت ہے کہ میں نے جو بات پہلی نگاہ میں محسوس کرلی وہ تم نے ابھی تک محسوس نہیں کی۔" وہ خاصا سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تم نے کبھی آنٹی کو غور سے دیکھا ہے......" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہاں ...... نہیں ...... تمہارا مطلب کیا ہے' غور سے دیکھنے کا؟" میں نے پوچھا۔

"آنٹی کی شکل اور تمہاری شکل بہت زیادہ ملتی ہے' ایک نگاہ ہی میں بالکل یہی خیال آتا ہے کہ تم دونوں میں کوئی خونی رشتہ ہے......" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیا......!؟" میں بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

(ان شاءاللہ باقی آئندہ ماہ)

برائے فروخت

محترم مدیر اعلیٰ نئے افق'
تسلیمات!
یہ ایک علامتی کہانی ہے لیکن اسے پڑھنے کے بعد آپ اسے سچی کہانی قرار دیں گے کیونکہ ہمارے ملک خصوصاً آپ کے شہر کراچی میں جو کچھ ہو رہا ہے جس طرح ایک انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کو اپنے معمولی مفاد کی بھینٹ چڑھا رہا ہے بھائی بھائی کا گوشت کھا رہا ہے کیونکہ ہر شخص نے اپنا ضمیر جو فروخت کر دیا ہے۔

آپ کا اپنا
زین نقوی

بھوک سے اس کی حالت لحہ بہ لحہ خراب ہو رہی تھی۔

"یہ کس عذاب میں پھنس گیا ہوں۔" وہ غصے سے بڑبڑایا۔

وہ اس وقت ایک سرکاری اسپتال کے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ اسے بلڈ کینسر تھا۔

"ارے کیا کر رہے ہو؟ کیوں بے مقصد چہل قدمی کر رہے ہو۔ یہ چونچلے تو صبح خراب کرنے کے ہیں۔" ایک اور مریض نے اسے غصے میں دیکھ کر کہا۔

"تم اپنی بکواس بند رکھو۔" وہ غصے سے غرایا۔

"یار! غصہ کیوں کھا رہے ہو۔ یہ لو چنے کھاؤ۔" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا اور مٹھی بھر چنے اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے کچھ سوچ کر وہ چنے لے لیے۔ ان مٹھی بھر چنوں نے اس کا پیٹ نہیں بھرا تھا لیکن اشتہا ضرور کم ہوگئی تھی۔

"کیا مسئلہ ہے تمہارا!" اس دوسرے شخص نے سوال کیا۔

"مجھ بلڈ کینسر ہے۔" اس نے بجھے سے لہجے میں جواب دیا۔ اس شخص کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کتنی دیر اور زندہ رہو گے؟" اس شخص نے سوال کیا۔

"ہنسو...... خوب ہنسو...... جب کوئی مرتا ہے تو اس کی موت دوسروں کے لیے صرف ایک تماشا ہوتی ہے۔" اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

"زندہ رہنا چاہتے ہو؟" اس شخص نے سوال کیا۔

"کیسا احمقانہ سوال ہے۔ بھلا کون ہے جو زندہ نہیں رہنا چاہتا۔" اس نے غصے سے جواب دیا۔

"میں تم کو تمہاری زندگی کی ضمانت دے سکتا ہوں۔" وہ بولا۔

"کیا تم خدا ہو یا کوئی مسیحا وغیرہ۔"

"میں ایک سوداگر ہوں اور میرے پاس ایک زندگی برائے فروخت موجود ہے۔ قیمت مجھے دے دو اور مجھ سے زندگی لے لو۔" اس شخص نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"تم پاگل ہو" "زندگی برائے فروخت" یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" وہ چیخا۔ حیرت سے بھرپور چیخ نے ایک بار اردگرد والوں کی توجہ ان دونوں کی طرف مبذول کروادی۔ "سوری۔" اس نے حیرت سے دیکھنے والے لوگوں سے معذرت کی۔ اسے یقین تھا

کہ یہ سب جھوٹ ہے۔

''میں پاگل نہیں ہوں اور اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔ میرے پاس ایک زندگی برائے فروخت موجود ہے' اسے خرید لو۔ موت کے خوف سے آزاد ہو جاؤ گے اور پھر تم وہ زندگی گزارو گے جو تم نے ابھی تک نہیں گزاری۔'' اس نے اپنے لفظوں پر زور دے کر کہا۔

''تم...... تم...... خدائی دعوے کر رہے ہو۔ یہ ناممکن ہے۔'' وہ اس کا اعتماد دیکھ کر گڑبڑا گیا اور اس شخص کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ ابھر آئی۔

''جلدی میں فیصلہ مت کرو۔ اطمینان سے سوچ کر فیصلہ کرنا اور یہ میرا کارڈ بھی رکھ لو۔'' اس نے جیب سے ایک نفیس سا کارڈ نکال کر اسے تھما دیا۔ اس کارڈ کی پشت پر ہاتھ سے ایک فون نمبر لکھا گیا تھا۔

''ٹھیک ہے میں سوچوں گا۔'' اس نے لیتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے امید ہے کہ تم اپنی غربت بیچ ڈالو گے۔ میں اب چلتا ہوں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا یہاں آنے کا مقصد پورا ہو گیا ہو۔ اس کے جانے کے بعد اس نے کارڈ پلٹ کر دیکھا تو دو سیاہ لفظ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

''برائے فروخت!'' جن کے سامنے ہاتھ سے غربت لکھا گیا تھا۔

ابتدائے عشق اس کے لیے بہت مشکل ثابت ہوئی ہے۔ اسے یہ سمجھنے میں طویل عرصہ گزر گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے اور اب اس پر اپنے احسانات آشکار ہوئے تو اس نے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے کہاں ملے گا۔ اس نے اسے ہمیشہ کھیل کے میدانوں کے قریب ہی دیکھا تھا۔

⊙......☆......⊙

وہ کالج کے ذہین ترین طلباء میں شمار ہوتا تھا۔ کھیل کے میدانوں میں اس کا وہاں چکر کبھی کبھار ہی لگتا تھا مگر اب یہ اس کا معمول بن گیا تھا وہ تواتر سے وہاں جا رہا تھا اسے یہ کھیل کود سب خرافات نظر آتی تھیں پھر بھی ایک انجانی کشش اسے وہاں لے جاتی تھی اور یہی کشش اسے تماشائیوں کے ہجوم میں ایک چہرہ ڈھونڈنے پر اکساتی تھی جیسے ہی وہ نظر آتی اس کی تلاش ختم ہو جاتی اور دل سکون و اطمینان سے بھر جاتا تھا۔ اس کے خیالات کا تانا بانا کسی سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔

''سوری!'' اس نے معذرت کی۔ اس وقت وہ کھیل کے میدان کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ تبھی اسے وہ نظر آئی۔ وہ سب کچھ بھول کر اس کے پیچھے ہو لیا اور کچھ ہی دیر میں اسے جا لیا۔

''میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟'' اس لڑکی نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ اس لڑکی کی آواز نے اس کے کانوں میں رس گھول دیا۔

''میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں؟'' وہ چونک کر بولا۔

''کہو! میں سُن رہی ہوں۔'' اس لڑکی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''مجھے تم سے محبت ہے اور میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے تیزی سے اپنی بات پوری کی۔ وہ لڑکی جیسے سکتے میں آ گئی۔

''یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟'' اس نے غصے سے کہا لیکن اس سے پہلے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں بجھ گئیں اور ان میں کرب کا تاثر نظر آ رہا تھا۔ اس نے یہ مصنوعی خفگی کا جو تاثر پیدا کیا تھا وہ بے کار ہی تھا۔

''یہ کوئی بکواس نہیں ہے۔'' اس نے لڑکی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکی اور اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

''میں اچھی لڑکی نہیں ہوں۔'' اس نے کہا۔ لہجے میں لغزش سی تھی۔

''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اس نے جواب دیا۔ لہجے میں چٹانوں سی سختی تھی اس لڑکی کی آنکھوں میں نمی ابھر آئی اور آنسوؤں کے دو چھوٹے چھوٹے قطرے لڑھکتے ہوئے گالوں پر آ گئے۔ اس نے اپنے پرس سے ایک نفیس سا کارڈ نکالا اور اس کی پشت پر اپنا نمبر لکھ کر اس کو تھما دیا۔ اس کے چہرے پر مسرت کے دیپ جل رہے تھے۔

''یہ میرا ذاتی فون نمبر ہے۔'' اس لڑکی نے اس کے چہرے پر مسرت دیکھ کر کہا اور کچھ کہے سنے بغیر تیزی سے پلٹ گئی۔ اس کے چلنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ جیسے ہی اس نے کارڈ پلٹا اس کے حواس پر جیسے بجلی سی گری۔ سیاہ رنگ کے لکھے ہوئے ''برائے فروخت'' کے الفاظ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

⊙......☆......⊙

''کیا بات ہے زید میاں! کہاں گم ہو؟'' یہ الفاظ سن کر دفتر کی میز پر سوچوں میں گم ایک شخص چونک اٹھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا تو بوڑھا کرم دین ہاتھ میں چائے کی پیالی لیے کھڑا تھا۔

''اوہ کرمو بابا! آپ...... بیٹھیے!'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''کیا بات ہے بیٹا! کچھ پریشان لگ رہے ہو۔'' کرم دین نے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں شفقت تھی۔ زید کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ ابھر آئی۔ اسے کرم دین کی یہ پدرانہ شفقت بہت اچھی

لگتی تھی۔

"کرمو بابا! میں سوچ رہا تھا کہ یہ زندگی کتنی مشکل ہے۔ ہم ساری زندگی جدوجہد میں گزار دیتے ہیں لیکن ہمیں ہماری مرضی کے نتیجے نہیں ملتے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی انجانی قوت ہماری مخالفت کررہی ہے۔" زید نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"یہ بات نہیں ہے بیٹا! کوئی ہماری مخالفت نہیں کررہا۔ ہم قدرت کی مخالفت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمیشہ قدرت ہم سے جیت جاتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب ہم ہار جاتے ہیں لیکن یہ تو بتاؤ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟" کرم دین نے اسے سمجھایا۔

"میرا مسئلہ روپیہ ہے کرمو بابا! خصوصاً شادی کے بعد تو میں مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ بیوی کی روز روز کی نئی خواہشات تنگ کرتی ہیں۔ میں اتنی رقم کہاں سے لاؤں۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"زید میاں! دولت اور چوری ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ دولت ہمیشہ چور راستوں سے حاصل ہوتی ہے۔ تم بھی سبھی چور دروازے کھول دو۔ دولت خود بخود آنے لگے گی۔" کرم دین نے سرگوشی میں کہا۔

"میں کیا کروں مو بابا! میری راہ کے سبھی چور دروازوں پر میرے ضمیر کا تالا لگا ہوا ہے۔" زید نے ٹھنڈی سانس بھری۔ کرم دین نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور میز پر پڑے قلمدان میں سے ایک قلم نکال کر اس پر کچھ لکھ کر زید کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ دیکھو بیٹا! اس بارے میں کیا خیال ہے؟" کرم دین نے کارڈ زید کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ زید نے جیسے ہی کارڈ دیکھا، وہ سکتے میں آ گیا۔ کارڈ پر صرف تین حروف درج تھے "ضمیر برائے فروخت" اس کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا بنتا چلا گیا۔ کرم دین معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے اٹھ کر خارجی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ زید پرنٹڈ برائے فروخت کے سامنے ہاتھ سے لکھے گئے ضمیر کے الفاظ کو بار بار پڑھ رہا تھا۔ اس نے کارڈ کو پلٹ کر دیکھا، اس پر ایک فون نمبر درج تھا۔ اس کو بھی ہاتھ سے کرم دین نے ہی لکھا تھا۔ زید نے کچھ سوچ کر کارڈ اپنی جیب میں ڈال لیا۔

◉......☆......◉

"ہمیشہ کی طرح آج بھی کسی بات کی سمجھ نہیں آرہی۔" اختر کی جھنجلاہٹ بھری سرگوشی نے صفدر کو چونکا دیا۔

"خاموشی سے بیٹھو گے تو سب سمجھ آنے لگے گا۔" صفدر نے سرگوشیانہ آواز میں مسکرا کر جواب دیا۔

"یار! بہت کوشش کرتا ہوں پر پھر بھی......" یہ کہتے ہوئے اختر کی آواز بھرا گئی۔

"اب رونا مت شروع کردینا۔ میں بھی تمہارے جیسا ہی ہوں۔ ہر سال سب سے کم نمبر لیتا ہوں اور تین چار سپلیاں تو معمولی سی بات ہے۔" صفدر نے کہا۔

"ہاں! لیکن تم ایک رئیس خاندان سے تعلق رکھتے ہو، تمہیں خاص فرق نہیں پڑتا مگر میں یہ افورڈ نہیں کرسکتا۔ بہت مشکل سے کالج کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔" اس نے پُردرد لہجے میں کہا۔

"یہ لو یہ رکھو۔" صفدر نے اپنی جیب سے ایک نفیس سنہرا کارڈ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جس کی پشت پر اس نے اپنا نمبر لکھ رکھا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" اختر نے سوال کیا۔

"تمہاری پریشانی کا حل اور میں بھی کوئی رئیس زادہ نہیں ہوں۔ صرف بائیس ہزار تنخواہ ہے میرے ابو کی...... اس میں سے ہر ماہ پندرہ ہزار لیتا ہوں اور پورے ماہ عیاشی کرتا ہوں۔" صفدر نے زہریلے لہجے میں بتایا۔

"کیا تمہیں کسی کا احساس نہیں۔" اختر نے حیرت سے سوال کیا۔

"احساس...... کارڈ پلٹو میرے دوست!" صفدر نے عجیب سے انداز میں جواب دیا۔ کارڈ پر سیاہ رنگ کے برائے فروخت کے الفاظ جگمگا رہے تھے جن کے سامنے صفدر نے ہاتھ سے احساس لکھ رکھا تھا۔

◉......☆......◉

رات کی تاریکی میں ایک سیاہ رنگ کی کار سڑکوں پر تیزی سے بھاگتی چلی آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد یہ ایک وسیع و عریض بلڈنگ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ڈرائیور نے مخصوص انداز میں ہارن بجایا تو ایک باوردی دربان دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول تھا جو اس نے گاڑی میں بیٹھے لوگوں پر تان رکھا تھا۔

"کس سے ملنا ہے۔" دربان نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

"ہم برائے فروخت ہیں۔" عقبی نشست پر بیٹھے ایک شخص نے کہا۔

"جی سر......!" دربان نے جواب دیا اور تیزی سے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کی اور اسے پورچ میں لے گیا۔ وہاں پہلے سے کچھ گاڑیاں موجود تھیں۔ ڈرائیور نے فوراً عقبی نشست کا دروازہ کھولا۔ وہ شخص باہر آیا اور ایک شان بے نیازی سے بڑے ہال کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں پہلے ہی کچھ لوگ موجود تھے۔ ہال میں گہرا سکوت طاری تھا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا سب اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے۔

"بیٹھ جاؤ دوستو!" اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ یہاں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ سب کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ "کیا رپورٹ ہے دوستو!" اس نے اپنی نشست سنبھال کر سوال کیا۔

"وکٹری!" سب یک زبان ہو کر بولے۔

"اس ملک کو تباہ کرنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ اس ملک کو ایسی منڈی بنا دیا جائے جس میں ہر چیز بیچی اور خریدی جاسکے۔ ہم یہاں ضرورتوں کو انسانوں کے مقابلے میں مہنگا کرنے آئے تھے۔ ہمارے ملک میں انسان مہنگے اور ضرورتیں سستی ہیں لیکن اس ملک میں ایسا نہیں ہوگا۔ یہاں انسان سستے اور ضرورتیں مہنگی ہوں گی۔ ہم اس مقصد میں کامیاب ہوچکے ہیں لیکن ابھی مزید کام کرنا ہوگا۔ امید ہے آپ ہمت نہیں ہاریں گے، بائے......!" وہ یہ کہہ کر اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔

"سر! کیا آپ ہوٹل چلیں گے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"نہیں ائرپورٹ لے چلو۔ میرا کام یہاں ختم ہوچکا ہے۔" اس نے جواب دیا اور آنکھیں موندھ کر سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا لیا۔

○

عبادت

محترم بھائی عمران احمد،
السلام علیکم!
یہ ایک بالکل سچا واقعہ ہے۔ جو مجھے زبیدہ آپا (مصالحہ ٹی وی) نے سنایا تھا۔ البتہ میں نے اسے کہانی کا رنگ دیا۔ یہ ایک ایسے خود دار شخص اور ایک با غیرت بیٹے کی کہانی ہے جو رزق حلال پر یقین اور ایمان رکھتے تھے۔ امید ہے یہ کہانی قارئین کے مزاج پر پوری اترے گی۔

والسلام
نوشاد عادل
کراچی

"لگتا ہے یہ بڑے میاں اس عمر میں آ کر تھوڑا کھسک گئے ہیں۔" امین صاحب نے دبی آواز میں سلیم صاحب سے کہا اور ایک پیپر ان کی میز پر رکھ دیا۔

"کس کی بات کر رہے ہو؟" سلیم صاحب نے پیپر اٹھا کر ایک نظر دیکھا اور فائل میں لگا دیا۔

"یہی اپنے پیون فاروق بابا کی۔" امین صاحب نے کھڑے کھڑے کہا۔

"کیوں خیریت! کیا ہو گیا انہیں؟" سلیم صاحب نے مسکرا کر امین صاحب کو دیکھا۔

"آپ نے شاید نوٹ نہیں کیا۔" امین صاحب سامنے رکھی کرسی پر براجمان ہو گئے اور قدرے آگے ہو کر دبے لہجے میں بولے۔ "جب سے نئے ڈائریکٹر صاحب آئے ہیں، ان کی خوشامد میں لگے ہوئے ہیں وہ بڑے میاں! شاید نمبر بنانے کے چکر میں ہیں۔"

سلیم صاحب ہنس دیئے۔ "ارے چھوڑو بھئی، کیا پیون کی باتیں لے کر بیٹھ گئے، بنانے دو غریب کو اگر نمبر بنا رہے ہیں تو ہمارا کیا جاتا ہے۔"

"جاتا تو خیر کسی کا کچھ نہیں لیکن آگے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے سلیم صاحب! آپ شاید سمجھ نہیں رہے۔" امین صاحب نے ذو معنی انداز میں کہا۔

اس بار سلیم صاحب تھوڑا چونکے۔ "کیا مطلب؟ ویسے ایک بات تو ہے میں نے بھی نوٹ کیا ہے کہ فاروق بابا نئے ڈائریکٹر کے کمرے کے چکر کچھ زیادہ ہی لگا رہا ہے۔"

"اور ہم اتنے برسوں سے دیکھ رہے ہیں کہ فاروق بابا بڑا اصول پسند ہے۔ کام سے کام رکھتا ہے اور کبھی کسی کی خوشامد یا چاپلوسی نہیں کی۔" امین صاحب نے کہا۔ "ہے نا یہ بات......؟"

"یہ بات تو ہے۔" سلیم صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ کو معلوم ہوگا کہ فاروق بابا کا ایک جوان لڑکا بھی ہے، جس کا کبھی کبھی ذکر کرتا رہتا ہے وہ۔"

"ہاں پتا ہے، تو......؟"

"کچھ عرصے پہلے فاروق بابا نے بتایا تھا کہ وہ اس کی نوکری کے لیے پریشان ہیں۔"

"ہاں، بتایا تھا مجھے بھی۔" سلیم صاحب کچھ کچھ سمجھ رہے تھے۔ "بلکہ مجھ سے بھی کہا تھا کہ اسے کہیں نوکری دلوا دیں۔"

"بس تو وہ اسی چکر میں نئے ڈائریکٹر کی خوشامد میں لگا ہوگا۔" امین صاحب نے اصل بات بیان کر دی۔

"ہاں ہو سکتا ہے خیر ہمیں کیا اور اچھا ہے غریب کا بھلا ہو جائے، ویسے بھی اب اس کی ریٹائرمنٹ کے دن قریب آ رہے ہیں۔"

"وہ کچھ بھی کرے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔" امین صاحب بڑے محتاط اور نپے تلے الفاظ کا استعمال کر رہے تھے۔ "فکر صرف اس بات کی ہے کہ بڑے میاں خوشامد کے چکر میں ہماری اچھی بُری باتیں نئے ڈائریکٹر کو نہ بتانا شروع کر دیں۔"

"یعنی مخبری......!" سلیم صاحب کے ماتھے پر تشویش کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔

"جی جناب!" امین صاحب نے بھویں اچکائیں۔ "اب آپ کو تو پتا ہی ہے کہ یہاں سب کا ایک جیسا حال ہے، اوپر کی کمائی کے بغیر گزارہ مشکل ہو جاتا ہے، ہماری تو ویسے بھی پبلک ڈیلنگ ہے کچھ لے دے کر ہی کام کیے جاتے ہیں یہاں اگر مخبری کے نتیجے میں ہماری کمائی کا یہ ذریعہ بند ہو گیا تو پھر ہم سوکھی تنخواہ پر کیسے اپنے اخراجات پورے کریں گے؟"

سلیم صاحب نے کرسی کی پشت گاہ سے کمر لگا لی اور دونوں ہاتھ سر پر باندھ کر بولے۔ "یار! یہ تو آپ نے پریشان کر دیا مجھے۔"

"پریشان نہیں، خبردار کیا ہے۔ ذرا بڑے میاں سے بچ بچا کر کام کرنا۔" امین صاحب یہ کہہ کر اٹھ گئے۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اب کیا ہوگا؟" امینہ بیگم نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور پانی کا گلاس ٹرے پر رکھ دیا۔ "کہاں سے ہوگا تین ہزار کا بندوبست، ابھی پچھلے مہینے ہی کتابوں اور یونیفارم پر اتنا خرچہ ہو گیا تھا۔"

"اللہ مالک ہے، کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔" فاروق صاحب نے پانی کا گلاس اٹھایا اور پھر اسے خالی کر کے کہا۔ "اس سے پہلے بھی تو اللہ نے ہمارا کوئی کام نہیں روکا، بے فکر رہو۔"

"آپ اپنے آفس میں بات کر کے دیکھیں کچھ رقم ادھار لینے کی بعد میں تھوڑے تھوڑے تنخواہ میں سے کٹواتے رہیں۔"

"ادھار صرف بڑے آفیسروں کو ملتے ہیں، ایک پیون کو بھلا کیوں ادھار ملے گا، ان شاء اللہ کل میں کہیں نہ کہیں سے پیسے کر لوں گا۔"

"پرسوں عمران کی فیس جمع کروانے کی آخری تاریخ ہے۔" امینہ بیگم نے یاد دلایا۔

"ابھی کل کا دن ہے ہمارے پاس......"

"تو اب کس کے پاس جائیں گے؟"

"کسی کے پاس نہیں۔" فاروق صاحب نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی اتار کر ہاتھ میں لے لی اور کہا۔ "یہ دیکھو، ہو گیا نا بندوبست۔"

"یہ......یہ......تو کیا اسے بیچ دیں گے؟" امینہ بیگم کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہو گئے

"ہاں، تو کیا ہوا؟ بیٹے کی پڑھائی سے بڑھ کر تو نہیں ہے نا یہ۔"

"لیکن...... یہ تو آپ کے والد کی نشانی......" امینہ بیگم کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"شاید یہ اسی دن کے لیے اب تک میرے

پاس تھی کہ میرے بیٹے کے کام آ جائے‘ قیمتی گھڑی ہے میرا خیال ہے اس کے دو ہزار تو مل ہی جائیں گے باقی ہزار تو ہم ملا سکتے ہیں۔“ فاروق صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”چلو اب یہ برتن سمیٹ لو‘ وقت زیادہ ہو رہا ہے۔“

امینہ بیگم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر خاموش رہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ انہیں یہ گھڑی کس قدر عزیز تھی۔ مشکل سے مشکل معاشی حالات میں بھی انہوں نے اسے فروخت نہیں کیا تھا لیکن اب وہ کتنی آسانی سے اسے فروخت کرنے کا کہہ رہے تھے۔ اس کے باوجود امینہ بیگم جانتی تھیں کہ انہیں گھڑی بیچنے کا دکھ تو ہوگا‘ دوسری طرف ان کے اکلوتے بیٹے عمران کی تعلیم کا معاملہ تھا۔ کالج کی فیس دینی تھی۔

دونوں میاں بیوی کی خواہش تھی کہ عمران بڑا آفیسر بنے‘ خاص طور پر فاروق صاحب اکثر یہ کہتے تھے کہ میں تو زندگی بھر چپراسی رہا لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا آفیسر بنے۔ ان کے بیٹے عمران کو بھی اپنے والدین کی خواہش کا احترام تھا‘ اس لیے وہ دل لگا کر تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اپنے چھوٹے موٹے اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ ٹیوشنز بھی پڑھاتا تھا۔ اس نے تو کئی بار نوکری کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ باپ کا سہارا بن جائے مگر فاروق صاحب نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا۔

”ہرگز نہیں...... پہلے تعلیم مکمل کر لو پھر شوق سے نوکری کرتے رہنا‘ ابھی درمیان سے پڑھائی ادھوری چھوڑ کر نوکری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”لیکن ابو......“ عمران نے کہنا چاہا۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں‘ جو کہہ دیا سو کہہ دیا اگر نوکری ہی کروانی ہوتی تو اتنا پڑھانے کی ضرورت کیا تھی تمہیں‘ ابھی اگر نوکری کرنے نکلو گے تو زیادہ سے زیادہ کلرک بھرتی ہو گے‘ میں تمہیں بڑا آفیسر بنانا چاہتا ہوں بیٹا۔“

باپ کی ضد کے آگے عمران نے ہمیشہ ہتھیار ڈالے تھے‘ وہ بہت دل لگا کر محنت سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے والدین اپنا پیٹ کاٹ کر اسے پڑھا رہے ہیں‘ وہ انہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

❁......❁......❁

”جناب! میرا کام ہوا یا نہیں؟“ آنے والے جوان آدمی نے سلیم صاحب سے پوچھا۔

”کون سا کام؟“ سلیم صاحب نے اسے ایک نظر دیکھا اور دوبارہ کاغذات کی الٹ پلٹ میں مصروف ہو گئے۔

”سر! وہ جو میری فائل آپ کے پاس ہے شمشاد اینڈ سنز والی......“ اس آدمی نے قدرے لجاجت سے کہا۔ ”پندرہ دن سے چکر کاٹ رہا ہوں سر جی‘ کچھ تو کریں۔“

سلیم صاحب پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ ”اچھا اچھا ہاں...... یاد آ گیا...... وہ والی فائل‘ آپ کو تو نوٹس بھی بھجوایا گیا تھا ٹیکس بھروانے کا......“

”جی سر! سر اتنی تو ہماری انکم نہیں ہے جتنا ٹیکس لگا کر بھیجا گیا ہے‘ آپ کے تو ہاتھ کا کام ہے۔“ وہ قدرے آگے ہو کر دبے لہجے میں بولا۔ ”سر آپ اسے کم کر سکتے ہیں۔“

”میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ مشکل

کام ہے۔ اتنی آسانی سے کم نہیں ہو سکتا‘ تمام پروسس دوبارہ کرنا ہوگا‘ نئی فائل بنے گی۔ آپ نے تو بس کہہ دیا کہ کم کر دیں۔“ سلیم صاحب کا لہجہ روکھا اور بےزار کن ہو گیا تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے سر! میں سمجھتا ہوں......“

”سمجھتے ہیں تو پھر ضد نہ کریں بھائی! جتنا ٹیکس لکھ کر بھیجا گیا ہے وہ بھر دیں۔“

”کوئی تو رستہ نکالیں سر!“

سلیم صاحب نے اس بار اسے غور سے دیکھا پھر اپنے دائیں بائیں نظر ڈال کر کہا۔ ”بیٹھیں......!“ وہ جلدی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”شکریہ سر......!“

سلیم صاحب نے گلا کھنکار کر ہلکی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”ہاں اب بتائیں‘ چلیں آپ ہی کوئی راستہ نکالیں۔“ ان کا لہجہ معنی خیز تھا۔ آدمی بےوقوف نہیں تھا‘ سمجھ گیا۔ وہ راستے کی قیمت دریافت کرنے لگا۔ اپنی نشست پر بیٹھے امین صاحب ان دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ اسی لمحے ڈائریکٹر کے روم سے فاروق بابا باہر آئے۔

”سلیم صاحب یہ بڑے صاحب نے دی ہے۔“ فاروق بابا نے بتایا اور ساتھ ہی ایک نظر وہاں بیٹھے شخص پر ڈالی۔

”اچھا اچھا‘ ٹھیک ہے‘ میں دیکھ لوں گا۔“ سلیم صاحب تھوڑا گھبرا گئے۔ فاروق بابا چلے گئے۔

”ہاں تو سر جی! پھر پچیس طے ہیں نا......؟“ سامنے بیٹھے آدمی نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

”کام مشکل ہے بھئی‘ بڑا رسک بھی ہے۔ میں صرف چالیس کی ڈیمانڈ کر رہا ہوں۔“ سلیم صاحب نے اس کی فائل کی ورق گردانی کرنا شروع کر دی۔

”آپ کو فائل مل گئی؟“ اچانک ایک آواز ابھری۔

سلیم صاحب نے چونک کر سر اٹھایا اور بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔ سامنے نیا نوجوان ڈائریکٹر کھڑا تھا۔

”گ...... کون سی...... کون سی فائل؟“ وہ ہکلانے لگے۔ ان کے چہرے پر ایک دم ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

”ابھی فاروق بابا نے جو دی ہے۔“

”ہاں...... ہاں...... وہ...... وہ تو مل گئی۔“

”تو اس میں اتنا گھبرانے والی کون سی بات ہے؟“ ڈائریکٹر نے انہیں غور سے دیکھا پھر ایک نگاہ کرسی پر بیٹھے شخص پر ڈالی۔ ”کوئی کام ہے آپ کو؟“

”ہاں جی! وہ میری فائل ہے ان کے پاس۔“ آدمی کے منہ سے بوکھلاہٹ میں نکلا۔ ”یہ جو سامنے رکھی ہے۔“

ڈائریکٹر نے اس کی فائل سلیم صاحب کے سامنے سے اٹھائی اور ایک نظر کاغذات پر ڈال کر کہا۔

”اس میں نوٹس کی کاپی بھی منسلک ہے‘ اب کیا پرابلم ہے؟“

”سر! میں کہہ رہا تھا کہ شاید ٹیکس زیادہ لگایا گیا ہے‘ اسے ذرا دیکھ لیں۔“

”اس کے اندراج تو بتا رہے ہیں کہ تمام فیگرز درست ہیں۔“ ڈائریکٹر نے فائل کا دوبارہ جائزہ لیا۔ ”آپ کو اس میں درج ٹیکس کی ادائیگی کرنی ہوگی۔“ پھر وہ سلیم صاحب کی طرف مڑا۔ ”یہ فائل

آپ نے مجھے تو نہیں دکھائی؟ کب سے ہے یہ آپ کے پاس؟''

''وہ...... وہ...... ایک ہفتہ ہوگیا ہے۔'' سلیم صاحب کے تو چھکے چھوٹ گئے۔

''اسے ایک ہفتہ ہوا ہے؟'' ڈائریکٹر نے آدمی سے پوچھا۔

''جی نہیں سر! پندرہ دن سے زیادہ ہوگئے ہیں۔'' بے اختیار آدمی نے سچ بول دیا۔

ڈائریکٹر نے خاموش نظروں سے سلیم صاحب کو گھورا اور فائل لے کر چلا گیا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ ہوشیار رہنا۔'' امین صاحب دبے لہجے میں بول رہے تھے۔ ''لگتا ہے کہ یہ مخبری فاروق بابا نے کی ہے۔''

''بڑا بے عزت کیا تھا ڈائریکٹر نے اپنے روم میں بلا کر۔'' سلیم صاحب مری مری آواز میں بتانے لگے۔

''ظاہر ہے، وہ تو کرنا تھا۔ ایک اہم بات بتاؤں میں آپ کو؟'' امین صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ ''کل اتفاق سے میں چھٹی کے بعد بھی دیر تک آفس میں موجود تھا پھر میں نکل کر بس اسٹاپ پر کھڑا بس کا انتظار کررہا تھا تو میں نے ڈائریکٹر کو کار میں جاتے دیکھا، پتا ہے اس کے ساتھ کون بیٹھا تھا۔''

''کون......؟'' سلیم صاحب نے نظریں اٹھائیں

''یہی آپ کے فاروق بابا......'' امین صاحب نے مسکرا کر بتایا۔

''اچھا تو نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے۔'' سلیم صاحب نے آنکھیں پھاڑیں۔ ''اتنا شیشے میں اتار لیا ہے اس پیون نے ڈائریکٹر کو۔''

''دیکھ لیں آخر کام بھی تو نکلوانا ہے نا۔''

اتنے میں انہوں نے فاروق بابا کو ڈائریکٹر کے روم سے ٹرے لے کر نکلتے دیکھا، جس پر چائے کا کپ رکھا تھا۔ امین صاحب نے فاروق بابا کو آواز دی، وہ ان کے پاس آ گئے۔

''جی جناب؟'' فاروق بابا نے مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔

''بابا! چائے تو پلا دیں ہمیں، ہم بھی اس آفس میں کام کرتے ہیں۔ جب سے نیا ڈائریکٹر آیا ہے، آپ نے تو ہمیں منہ لگانا ہی چھوڑ دیا ہے۔'' امین صاحب کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔ فاروق بابا نے چونک کر انہیں دیکھا پھر آہستگی سے کہا۔

''میں ابھی لاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مڑے۔

''ایک منٹ بابا!'' امین صاحب نے انہیں روکا۔ فاروق بابا مڑ کر انہیں دیکھنے لگے۔ ''ایک بات پوچھنی تھی آپ سے؟''

''کون سی بات؟''

''آپ نئے ڈائریکٹر کے ساتھ آفس آتے جاتے ہیں اس کی گاڑی میں؟'' امین صاحب نے گال کھجاتے ہوئے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر مزید کہا۔ ''میں نے دیکھا تھا آپ کو اس کے ساتھ گاڑی میں۔''

فاروق بابا کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔

''وہ...... کل انہوں نے زبردستی بٹھا لیا تھا، ورنہ میں تو بس میں آتا جاتا ہوں۔''

''اوکے! بس یہی معلوم کرنا تھا۔'' امین صاحب

مسکرا دیئے۔ فاروق بابا چلے گئے۔

''دیکھا، صحیح کہا تھا نا میں نے؟''

''یار امین صاحب! مجھے تو لگتا ہے یہ بڈھا مخبریاں کرتا رہے گا اور ڈائریکٹر ہمیں کھانے کمانے نہیں دے گا۔'' سلیم صاحب مری مری آواز میں بول رہے تھے۔

''امی......'' عمران اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں آیا جہاں امینہ بیگم کولر میں پانی بھر رہی تھیں۔ ''یہ آج کل ابو اتنی دیر میں کیوں آ رہے ہیں؟ ان کی چھٹی تو شام میں ہوجاتی ہے۔''

''کام زیادہ ہے نا آفس میں۔'' امینہ بیگم نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے رکنا پڑتا ہے۔''

عمران ان کے نزدیک آیا اور کولر اٹھا کر باورچی خانے میں رکھ دیا پھر باہر آ کر بولا۔

''امی! آپ کچھ چھپا رہی ہیں، سچ سچ بتائیں؟''

''میں کیوں چھپانے لگی، ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔'' وہ پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ ''ایک تو گرمی میں کمروں کے اندر بیٹھا نہیں جاتا۔'' وہ دوپٹے سے ہوا جھلنے لگیں۔ عمران نے اپنے کمرے میں سے پیڈسٹل فین لا کر صحن میں رکھ دیا اور خود بھی پلنگ پر آ بیٹھا۔

''اب بتائیں امی! کیا بات ہے؟ دیکھیں جب تک آپ صحیح بات نہیں بتائیں گی، میرا پڑھائی میں دل نہیں لگے گا۔''

امینہ بیگم نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور آہستگی سے بولی۔

''بیٹا! بولنا نہیں اپنے ابو سے انہوں نے منع کیا تھا مجھے کہ تمہیں نہ بتاؤں۔''

''وعدہ! میں انہیں نہیں بتاؤں گا۔''

''اصل میں......'' امینہ بیگم نے اٹک اٹک کر بتانا شروع کیا۔ ''وہ تمہاری یونیورسٹی کے اخراجات بڑھ گئے ہیں نا انہیں...... انہیں پورا کرنے کے لیے وہ ایک جگہ اور جاتے ہیں نوکری کرنے...... چار گھنٹے دیتے ہیں، تھوڑے پیسوں کا آسرا ہوجاتا ہے مگر بیٹا! تمہیں میری قسم، انہیں کچھ نہ بولنا ورنہ...... ورنہ وہ مجھ سے سخت ناراض ہوجائیں گے۔''

عمران کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ چند لمحے اپنی ماں کو دیکھتا رہا اور پھر خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''فاروق بابا......'' سلیم صاحب نے زور سے آواز دی۔ ان کی آواز پر آفس کے لوگ چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔ فاروق بابا تیزی سے ان کی جانب آئے۔

''جی سر...... جی؟'' فاروق بابا نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''یہاں کی صفائی کس کی ذمہ داری ہے میری یا آپ کی؟'' سلیم صاحب کاٹ کھانے کو دوڑے۔

''میری ہے سر!''

''تو پھر یہ ٹیبل دیکھیں میری...... اس کی صفائی کیا میں آ کر کیا کروں روزانہ؟'' انہوں نے ٹیبل کی ٹاپ پر انگلی پھیر کر بتایا۔

''سر میں روز آ کر سب سے پہلے تمام ٹیبل صاف کرتا ہوں۔'' فاروق بابا کا رنگ ہلکا پڑ گیا تھا۔

''پتا نہیں کیسی صفائی کرتے ہیں، بس ایک ہلکا سا

کپڑا مارنے کو صفائی نہیں کہتے۔ ذرا ہاتھ جما کر صاف کیا کریں۔'' سلیم صاحب اپنے اندر کا دبا غصہ ان پر اتار رہے تھے۔

''کیا ہو گیا سلیم صاحب! آرام سے...... آرام سے...... اس میں اتنا غصہ کرنے والی بات کون سی ہے۔'' امین صاحب اور دیگر افسر وہیں ان کے پاس آ گئے تھے۔ ''اب ان بے چارے فاروق صاحب کے جسم میں جتنی طاقت ہو گی اتنا ہی کریں گے نا۔''

''جب نہیں ہوتا کام تو گھر بیٹھ جائیں' کسی نے زبردستی تو نہیں کہا نا کام کا۔''

''ارے صاحب! اب تو یہ بے چارے ویسے ہی ریٹائر ہونے والے ہیں' کچھ دنوں کی بات ہے۔'' امین صاحب بڑی چالاکی اور غیر محسوس طریقے سے فاروق بابا کی حمایت کر رہے تھے۔ ''چلیں چھوڑیں' صبح صبح غصہ نہ کریں' جائیں بابا! آپ چائے پلا دیں ہمیں۔''

اس لمحے ڈائریکٹر وہاں داخل ہوا تھا۔ اس نے لوگوں کو سلیم صاحب کی ٹیبل کے پاس دیکھا تو وہاں چلا آیا۔

''خیریت تو ہے نا؟'' اس نے فاروق بابا اور پھر امین صاحب کو دیکھا' وہ ان کے نزدیک تھے۔

''جی...... جی ہاں...... سب ٹھیک ہے۔'' کسی کے بولنے سے قبل فاروق بابا بول پڑے۔

''کچھ نہیں سر! وہ بس سلیم صاحب کو فاروق بابا سے تھوڑی شکایت ہو گئی تھی کہ ان کی ٹیبل ٹھیک سے صاف نہیں کی۔'' امین صاحب نے عام سے انداز میں کہا۔ سلیم صاحب نے انہیں گھور کر دیکھا۔

''جی سلیم صاحب! یہ ٹھیک بات ہے؟'' ڈائریکٹر نے سلیم صاحب سے استفسار کیا۔

''جی...... جی ہاں...... نہیں...... وہ بس مجھے ایسا لگا تھا ورنہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔'' سلیم صاحب گڑبڑا گئے تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ صفائی تو روز کی طرح ٹھیک ہوئی تھی' بس انہیں تو غصہ نکالنا تھا۔

''سر میں آئندہ خیال رکھوں گا۔'' فاروق بابا آہستہ سے بولے۔ ''مجھ سے کوتاہی ہوئی ہو گی۔''

''او کے! سلیم صاحب کی ٹیبل ٹھیک طرح سے صاف کر دیا کریں۔'' یہ کہہ کر ڈائریکٹر اپنے روم میں چلا گیا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

''آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ آفس میں آج یہ چھوٹی سی پارٹی کس لیے رکھی گئی ہے؟'' ڈائریکٹر بول رہا تھا۔ بڑے ہال میں آفس کے تمام افراد جمع تھے۔ بڑی ٹیبل پر کھانے پینے کی بہت سی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ ''آج اس آفس کے پرانے خدمت گار فاروق بابا کا آخری دن ہے۔ اب وہ ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ مجھ سے زیادہ بہتر آپ لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے کتنی محنت اور لگن سے اپنی ذمہ داری نبھائی اور برسوں تک اس آفس کے لوگوں کی خدمت کی۔ آج میں آپ کو فاروق بابا کے بارے میں وہ بات بتانے جا رہا ہوں جو آپ میں سے کوئی نہیں جانتا۔''

تمام افراد خاموشی سے ڈائریکٹر کو دیکھ رہے تھے۔ فاروق بابا کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا تو ڈائریکٹر نے ہاتھ اٹھا کر انہیں بولنے سے روک دیا لیکن سلیم صاحب درمیان میں بول اٹھے۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ ان کے بارے میں کیا بتانے والے ہیں۔'' ڈائریکٹر نے ایک نظر انہیں دیکھا اور مسکرا کر بولے۔

''لیکن سلیم صاحب! دوسرے افراد نہیں جانتے۔ میں انہیں بتا دوں کہ فاروق بابا کا تعلق ایک غریب طبقے سے ہے۔ ان کا ایک بیٹا ہے' فاروق بابا کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر بڑا آفیسر بنے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو اپنی حیثیت سے بڑھ کر اچھی تعلیم دی' اچھے اسکول اور کالج میں پڑھایا۔ اس کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنے پیٹ پر پتھر باندھے' بہت سی قربانیاں دیں' خواہش یہی تھی کہ وہ ان کی طرح پیون نہ بنے۔'' اتنا کہہ کر ڈائریکٹر چند لمحوں کے لیے رکا۔ اس وقت سلیم صاحب دوبارہ بول پڑے۔

''مجھ سے بھی فاروق بابا نے کچھ عرصہ پہلے اپنے بیٹے کے لیے نوکری کا کہا تھا۔''

''جانتا ہوں۔'' ڈائریکٹر نے سر ہلایا۔ ''انہوں نے آپ سے ہی نہیں بلکہ بہت سے لوگوں سے کہہ رکھا تھا لیکن قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔''

''سر جی! رہنے دیں...... جانے دیں اس بات کو۔'' اچانک فاروق بابا کی آواز ابھری۔ ڈائریکٹر ان کی طرف مڑا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اب آپ ریٹائرڈ ہو چکے ہیں' اب میں آپ کا سر جی نہیں...... بیٹا ہوں ابو! آپ کی قسم کو میں نے پورا کیا ہے۔''

کیا......؟'' ہال میں تحیر خیز آوازیں گونجیں۔ لوگ چہ مگوئیاں کرنے لگے۔

''جی ہاں...... فاروق بابا میرے والد ہیں اور میں ہی ان کا وہ بیٹا ہوں' جس کے بارے میں امین نے ابھی بتایا تھا۔'' ڈائریکٹر نے بات آگے بڑھائی۔ ''انسان چاہے کچھ بھی کر لے' ہوتا وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہوتی ہے۔ میرٹ پر میری سلیکشن ہو گئی' جب کہ اس نوکری کو حاصل کرنے کے لیے لوگ لاکھوں روپے دینے کو تیار تھے۔ میں نے ڈیوٹی جوائن کرتے ہی اپنے والد سے کہا کہ اب وہ نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ جائیں لیکن انہوں نے سختی سے انکار کر دیا اور کہا کہ جس نوکری کی وجہ سے پیسے کما کر میں نے تمہیں تعلیم دلوائی اور اس مقام تک پہنچایا میں اس سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ یہ میرے لیے نوکری نہیں عبادت ہے' ساتھ ہی یہ بھی قسم دی کہ میں آفس میں کسی کو نہ بتاؤں کہ ہمارا رشتہ کیا ہے۔ آفس میں تم میرے آفیسر رہو گے' میں ان کی قسم کے آگے مجبور ہو گیا تھا۔ یہ مجبوری آج ختم ہو چکی ہے۔ میرے ابو کو یہ بھی گوارہ نہ تھا کہ وہ میرے ساتھ گاڑی میں آیا کریں یا واپس گھر جائیں' کبھی کبھی میں زبردستی انہیں گاڑی میں یہ کہہ کر بٹھا لیتا تھا کہ اب تو ڈیوٹی ٹائم ختم ہو چکا ہے' آپ مجھے گناہ گار نہ کریں۔ آخری بات یہ کہ انہوں نے مجھ سے کبھی کسی کے بارے میں کوئی شکایت نہیں کی۔''

سلیم صاحب' امین صاحب اور دیگر افراد منہ کھولے یہ سب سن رہے تھے۔ یہ سب ان کے لیے حیرت انگیز واقعہ تھا۔ سلیم صاحب شرمندگی کے مارے زمین میں گڑھے جا رہے تھے۔ اب ان میں اتنی اخلاقی جرأت بھی باقی نہ رہی تھی کہ وہ فاروق بابا جیسی عظیم ہستی سے معافی مانگ لیں۔

فیصلہ

محترم ایڈیٹر نئے افق کراچی!

ہمارے معاشرے میں ایک عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے۔ وہ اپنی غرض کی خاطر یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کتنے لوگوں کو خون کے آنسو رلا رہی ہے۔ لیکن وہ بھی عورت ہوتی ہیں جو دوسروں کی خوشیوں کی خاطر خود بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ یہ کہانی بھی ایک ایسی ہی عورت کی ہے خوشیاں اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں لیکن وہ ان خوشیوں کے عقب میں آنسوؤں کے سیلاب کو دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی تھی۔ امید ہے یہ کہانی آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

آپ کا اپنا
عابد بیگ

عابد بیگ نے اپنی ساری زندگی کسی لڑکی یا عورت کا انتظار نہیں کیا تھا لیکن وہ چند دنوں سے دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر شہلا احمد کا انتظار کرنے لگا تھا۔ وہ انتظار جو اسے بڑا عجیب سا محسوس ہوتا تھا جس کے عرصے کے پل پل میں مزا ہوتا تھا۔ تڑپنے کی ایسی لذت اور بڑھتا ہوا اضطراب جس سے وہ کبھی آشنا نہ تھا۔ آج اس انتظار نے اس کے دل کے تمام نہاں خانوں میں عجیب سا گداز بھر دیا تھا۔ وہ سب سے پہلے دفتر پہنچ کر جنرل منیجر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عاشق کی طرح اس کا انتظار کرتا' جب تک شہلا احمد دفتر پہنچ کر اپنی حاضری کی اطلاع نہیں دیتی وہ تنہائی کی آگ میں جلتا رہتا۔ جب شہلا احمد کا سراپا دروازہ کھلتے ہی ابھرتا اور اس کے چہرے پر مخصوص شگفتہ مسکراہٹ بکھری ہوئی دیکھ لیتا تب کہیں اس کے سینے میں پکتا ہوا آتش فشاں کا لاوا سرد پڑ جاتا۔ وہ اپنی موجودگی اور حاضری کی اطلاع دے کر لوٹ جاتی پھر کوئی احساس اسے اپنی ذات کے جہنم میں دھکیل دیتا۔

شہلا احمد کوئی حسین و جمیل نوجوان یا ایسی بھرپور عورت نہیں تھی جس کی قربت کی تپش سے وہ جل جاتا۔ وہ ایسی گداز اور پرکشش بھی نہیں تھی کہ کسی مرد کو پاگل کردے۔ وہ ایسی تراش خراش کا بھڑکیلا لباس بھی نہیں پہنتی تھی کہ مردوں کی ندیدی نگاہیں اس کے سراپا پر چپک کر رہ جائیں۔ دفتر میں لڑکیاں اور عورتیں میک اپ کرکے اور بھڑکیلے لباس پہن کر اس لیے آتی تھیں کہ مرد متوجہ ہوکر انہیں تعریفی نظروں سے دیکھیں مگر کوئی ایسی لڑکی یا عورت اسے متوجہ اور متاثر نہیں کرسکی تھی۔ اس نے کبھی کسی لڑکی یا عورت کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے نظر بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اسے اپنے کام سے کام اور دفتر کے کاموں سے زیادہ دلچسپی اور فکر رہتی تھی۔ مگر وہ دفتر میں بڑی سادگی اور نفاست سے آتی تھی۔ میک اپ بالکل نہ کرتی تھی۔ ہلکے رنگوں کی ساڑی اور گہرے رنگ کے میچ کرتے ہوئے بلاؤز میں ملبوس ہوتی۔ بالوں کا جوڑا کس کر باندھتی تھی۔ پینتیس برس کی اس عورت کا روپ بڑا دل کش تھا۔ نکلتے ہوئے قد نے اس کا سراپا پرشکوہ بنا دیا تھا۔ وہ اس قدر باوقار اور بارعب تھی کہ کوئی اس کے ساتھ کسی قسم کی گستاخی کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر

شگفتہ سی مسکراہٹ بکھری رہتی تھی۔ وہ دفتر کے ہر شخص سے خندہ پیشانی سے پیش آتی تھی۔ اپنی کسی غلطی کا اس نے کبھی برا نہیں منایا۔ بحث یا تکرار نہیں کی تھی۔ ہنس کر اپنی غلطی تسلیم کرلیتی تھی۔ اگر اس کی کوئی غلطی نہ بھی ہوتو اسے اپنی غلطی سمجھتے ہوئے قطعی عار محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اسی بات اور خوبیوں نے نہ صرف اسے دفتر میں ہردلعزیز بلکہ عابد بیگ کی کمزوری بنا دیا تھا۔ تیزی سے گزرتا ہوا وقت اسے شہلا احمد سے قریب کرتا جارہا تھا۔

حالانکہ وہ عمر کے اس حصے میں نہیں تھا کہ رومان میں اس کے لیے کوئی کشش یا جاذبیت ہو۔ وہ اب چالیس سال کا ہوگیا تھا۔ ایک بیوی اور چار بچوں کا باپ تھا۔ مگر اس نے شہلا احمد میں کوئی خاص وصف اور کشش محسوس کی تھی جبھی وہ اپنے گھر اور دنیا کی فکر کیے بنا کشاں کشاں اس کی طرف کھنچا جارہا تھا۔

اس نے گلشن اقبال سے دفتر جاتے ہوئے یونیورسٹی روڈ کے بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے شہلا احمد کو اکثر دیکھا تھا۔ دفتر سے چھٹی ہونے پر روز ہی ایک ہی وقت گھر جانے کے لیے نکلتے تھے۔ اس نے دفتر جاتے اور گھر واپس لوٹتے وقت کئی بار سوچا کہ کار روک کر اسے لفٹ کی پیش کش کرے لیکن وہ ہر بار یہ سوچ کر رہ گیا کہ دفتر کے لوگ ایک جنرل منیجر کو ایک عام اسٹینو کو اتنی اہمیت دیتے ہوئے دیکھ کر کیا سوچیں گے کیا کہیں گے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دفتر میں اس کے عشق کے چرچے ہوں۔ کوئی اسکینڈل کھڑا ہوجائے۔

ایک روز غضنفر علی جو اس کے گہرے دوست' پڑوسی اور کنسٹرکشن کمپنی کے ڈائریکٹر تھے ان کی کار اچانک خراب ہوگئی تو اس نے لفٹ کی پیش کش کی۔ جب اس کی کار اس بس اسٹاپ پر سے گزری جہاں شہلا احمد ویگن کے انتظار میں کھڑی ہوتی تھی وہ اس روز بھی بس اسٹاپ پر لڑکیوں اور عورتوں کے ہجوم میں گھری کھڑی تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کی ساڑی میں وہ بہت پیاری دکھائی دے رہی تھی۔ میک اپ سے مبرا حسن اور سادگی کی پرکاری اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ شہلا احمد کسی اور سمت دیکھ رہی تھی۔ غضنفر علی نے شہلا احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''کیا مس شہلا احمد آج کل تمہاری کمپنی میں ملازمت کررہی ہیں؟''

''ہاں!'' اس نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ ''وہ میری اسٹینو ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اسے ہی سیکریٹری پر ترقی دے کر رکھ لوں۔''

''اگر تم نے اسے ترقی دی تو ایک کارِ خیر انجام دو گے جس کا اجر تمہیں دین اور دنیا میں بھی ملے گا۔'' غضنفر علی نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''یہ بڑی بدنصیب عورت ہے۔''

''بدنصیب عورت ہے؟'' وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ اس کے لیے یہ انکشاف بالکل نیا تھا۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیا تم اس سے واقف ہو؟''

''بہت اچھی طرح اور اسے بہت قریب سے جانتا ہوں۔'' غضنفر علی نے جواب دیا۔ ''کاش میں اسے جانتا نہ ہوتا۔ معلوم نہیں کیوں اس عورت کی بدنصیبی پر مجھے بڑا ترس آتا ہے۔ اس کا دکھ مجھے اپنا غم محسوس ہوتا ہے۔ اگر شہلا جیسی عورت میری زندگی میں آجاتی تو شاید میری زندگی میں چار چاند لگ جاتے۔''

''میں نے ان چند دنوں میں محسوس کیا ہے کہ وہ

بے حد دکھی سی ہے مگر بڑی خوش اخلاق اور باوقار عورت ہے۔ میں اس کی ذات کے پس منظر سے بالکل واقف نہیں ہوں۔"

"تم کیا ہر وہ شخص جو اسے قریب سے بھی جانتا ہو اس کے دل کے زخموں کا اندازہ نہیں کرسکتا۔" غضنفر علی کہنے لگے۔ "بظاہر اس کے چہرے اور ہونٹوں پر مونالیزا جیسی مسکراہٹ بکھری رہتی ہے لیکن شہلا احمد کے سینے میں زخموں نے سوراخ کررکھے ہیں۔ اپنے آپ کو فریب دینے اور اپنے دکھ کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے لیے دنیا کے سامنے مسکراتی رہتی ہے۔ وہ زمانے کو جتا رہی ہے کہ ان حالات میں بھی وہ بہت خوش ہے' حالات سے سمجھوتا کرکے مطمئن ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں مجھے ایک ذریعہ نے بتایا کہ وہ راتوں کو روتی رہتی ہے۔ اتنا روتی ہے کہ تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا ہے۔ وہ کیسی محبت تھی جس نے ایک عورت کی روح کو مسل اور کچل دیا؟"

"میری سمجھ میں اب تک نہیں آیا کہ آخر اسے کیا دکھ پہنچا ہے۔" عابد بیگ بولا۔ "ایسی عورت آخر کس لیے اتنی دکھی ہے۔ کون سا غم اسے دیمک بن کر اندر ہی اندر چاٹ رہا ہے۔"

"ایک مرد کی بے وفائی کا' اس کے اپنے شوہر نے دس برسوں کی رفاقت کے بعد اچانک طلاق کے تین الفاظ کہہ کر اسے اپنے وجود سے نکال پھینکا۔ وہ ششدر رہ گئی تھی۔ آخر کس گناہ کی پاداش میں اسے اتنی نفرت انگیز' قبیح اور غلیظ گالی دی گئی ہے۔" غضنفر علی جذباتی ہوگئے۔ "شہلا کا شوہر نجم الہدیٰ اس کے بچپن کا ساتھی تھا۔ نوجوانی میں محبت بھی پروان چڑھتی گئی۔ نجم الہدیٰ ایک عام اور مفلس سا شخص تھا مگر شہلا نے اسے اپنا مجازی خدا بنا کر آخری سانسوں تک زندگی کے سفر میں شریک رہنے کا مقدس عہد کیا تھا۔ اس نے دس برس تک نجم الہدیٰ کے لیے بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ اذیتیں سہیں' بھوکی رہی۔ فاقے کیے' ملازمت کرکے اپنے شوہر کو کسی دکھ کا سامنا کرنے نہیں دیا۔ پھر یکایک حالات نے پلٹا کھایا۔ نجم الہدیٰ کو ایک سنہرا موقع ملا تو وہ دولت مند بن گیا۔ پھر اس دولت نے محبت کی ہر زنجیر اور رشتوں ناتوں کو توڑ دیا۔ خواب ٹوٹ کر بکھرے تو وہ کانچ کی کرچیاں بن کر شہلا کے دل میں چبھ گئیں۔ پھر بھی اس جان وفا نے اف نہیں کیا۔ اس نے ان حالات کو رضائے الٰہی ہی سمجھ کر صابر و شاکر عورت کی طرح قبول کرلیا پھر بھی وہ اس فریب میں مبتلا رہی کہ نجم الہدیٰ اب بھی صرف اس کا ہے لیکن جب نجم الہدیٰ نے طلاق دے کر اسے تاریک راہوں پر دھکا دیا تو وہ چیخ پڑی۔ وہ شاید خودکشی کرلیتی اگر اس کی بوڑھی ماں زندہ نہ ہوتی۔ پھر بھی شہلا نے اس عورت کو کوئی دوش نہیں دیا جس نے اس کی محبت چھین لی تھی اپنی دولت کے بل بوتے پر' اس روز سے شہلا احمد نہیں بلکہ ایک لاش چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ وہ مسکراتی رہتی ہے کیا تم نے کبھی ایسی کوئی عورت دیکھی ہے جو اپنا سب کچھ ہار کر نجانے کس لیے اور کس امید پر زندہ ہے۔ سچ پوچھو تو ایسی عظیم عورت میری زندگی میں کبھی میری نظروں سے نہیں گزری۔"

غضنفر علی کا دفتر آ گیا تو شہلا احمد کا ذکر موقوف ہوگیا۔ وہ اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کیا وہ اور شہلا ایک ہی کشتی کے سوار نہیں ہیں؟ کل کا ایک فیصلہ جو اس نے عجلت اور جذباتی ہوکر

کیا تھا وہ کوتاہی آج کا پچھتاوا بن گیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنا شان دار اور سنہرا مستقبل بنانے کے لیے اپنے آپ کو دوسروں کے پاس رہن رکھ دیتے ہیں۔ اسے دولت مند اور ایک بڑا آدمی بننے کی بڑی خواہش تھی' دس گیارہ سال پہلے وہ شاہدہ کی چاہت میں نہیں بلکہ اس کی دولت کے لیے پاگل ہوگیا تھا۔ شاہدہ نے اسے پہلی بار ایک دعوت میں دیکھا تھا۔ وہ اس کے اسمارٹ ہونے وجاہت' خوش پوشی اور جوانی پر مرمٹی تھی۔ شاہدہ نے سوچا تھا کہ وہ یہ ڈیکوریشن پیس خرید کر اس سے اپنی زندگی سجائے گی تو کتنی لڑکیاں اور عورتیں اس پر رشک کریں گی۔ شاہدہ کو شوہر کی اور اسے ایک دولت مند بیوی کی ضرورت تھی۔ پھر دونوں کی شادی ہوگئی۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ اس نے تو اپنے آپ کو اذیت کے جہنم میں جھونک دیا ہے۔ شاہدہ ایک اچھی بیوی اور عورت ثابت نہیں ہوسکی۔ اس عورت نے اسے شوہر نہیں زرخرید نوکر کی طرح سمجھا۔ اسے دولت تو مل گئی مگر سکون اور پیار نہ مل سکا۔ ساری دولت دے کر بھی وہ یہ سب حاصل نہیں کرسکتا تھا۔

شہلا احمد جو دفتر میں اسٹینو کی حیثیت سے آئی تو اسے دیکھ کر یہ احساس ہوا تھا کہ...... یہ عورت اس کا خواب ہے۔ اس کی زندگی کا ہم سفر ایک ایسی ہی عورت کو ہونا چاہیے تھا۔ اس کے دل کے کسی کونے میں یہ خواہش ابھری کہ...... کاش! وہ شہلا احمد کو اپنا سکتا۔ آج بھی اسے شہلا جیسی عورت ہی کی ضرورت ہے۔ جبھی تو وہ شہلا احمد کو نظروں کے سامنے پاکر وہ اپنی تنک مزاج' دولت کے زعم میں ڈوبی ہوئی چڑچڑی بیوی کو بھول جاتا تھا جس نے آج تک اسے پیار نہ دیا تھا۔ شہلا احمد سے کسی بھی موضوع پر باتیں کرتے ہوئے اس کی روح عجیب سے سرور میں ڈوب جاتی تھی اور اس کے دل کے نہاں خانوں میں وہ مسرت بھر جاتی تھی جس سے وہ محروم تھا۔ جیسے وہ عورت نہ ہو کوئی مسیحا ہو' جس کے پاس درد کی دوا ہے۔

ایک آوارہ سا خیال اس کے ذہن میں آیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے اپنا پیچھا چھڑا سکتا ہے' اگر وہ شہلا احمد کو شادی کی پیش کش کرے گا تو شہلا احمد انکار نہ کرسکے گی۔ اس لیے کہ وہ ایک ٹھکرائی ہوئی عورت ہے۔ اس کا دل زخمی ہے' اس کی روح مسلی اور رندھی ہوئی ہے۔ ایک عورت ہونے کے ناتے اسے مرد کے سہارے کی ضرورت ہے۔ دل کے زخموں کے لیے ایک مرد کی محبت ہی آب حیات بن سکتی ہے۔ شادی کا بندھن ہی عورت کی روح میں نئی زندگی پھونک سکتا ہے۔

اس نے سوچتے سوچتے شہلا احمد کی طرف دیکھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور اس کا قلم تیزی سے رف پیڈ پر چل رہا تھا۔ وہ سپاٹ اور سرد لہجے میں ایک خط لکھوا رہا تھا لیکن بار بار اس کی نگاہ شہلا احمد کے خاص انداز سے جھکے ہوئے سر پر جاکر ٹھہر جاتی تھی۔ وہ اپنے دل میں آہیں بھرتے ہوئے سوچتا۔

کاش! میں اس سے دل کی بات کہہ سکتا؟

جب کسی مرد کو عورت کو پانے کی خواہش اور جستجو ہوتی ہے تو وہ اپنے ترکش کے تمام تیروں کو ایک ایک کرکے اس وقت تک نشانے کی طرف چھوڑتا رہتا ہے جب تک کوئی تیر اپنے عین نشانے پر نہ لگ جائے۔ ایک مرد کے لیے سب سے مشکل

ایک عورت سے اظہار محبت ہوتا ہے۔ عابد بیگ نے بھی ایک ایک کر کے اپنے ترکش کے تیر آزمانے شروع کیے اب اسے اپنی بیوی کی دولت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اس رتبے اور حیثیت کا مالک تھا کہ کہیں بھی عزت سے جی سکتا تھا۔ اگر اسے ضرورت تھی تو محبت کی...... وہ محبت جو صرف شہلا احمد ہی دے سکتی تھی۔ اس نے شہلا احمد کو اپنی سکریٹری بنالیا۔ اس کی تنخواہ اور مراعات میں بھی اضافہ کردیا تھا۔ وہ شہلا احمد پر عنایات کی بارش کرنے لگا۔ اس کی غلطیوں اور خامیوں کو ہنس کر نظر انداز کردیتا تھا۔ مختلف حیلے بہانوں سے وہ اس کے قریب ہونے لگا تھا۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ عورت ہمیشہ ہرنی کی مانند ہوتی ہے' جو شکاری کی آہٹ یا بو پا کر چوکنا ہوجاتی ہے جو مرد کی ہر فیاضی کو شک کے ترازو میں تولتی ہے۔ وہ مرد کی بدلی ہوئی نظر کو تاڑ لیتی ہے اور نگاہوں کی زبان کو سمجھنے کا فن آتا ہے۔ پھر وہ چوکنا ہوگئی تھی۔ وہ اس فرم میں ملازمت کرتے ہوئے بہت خوش تھی کہ یہاں کا ماحول دوسری فرموں کے مقابلے میں بہت اچھا تھا۔ دفتر کے لوگ اس سے گھر کے ایک فرد کی طرح پیش آتے تھے۔ اسے صرف دنیا کے ایک مرد سے نفرت تھی۔ وہ تھا نجم الہدیٰ۔ وہ دنیا کے دوسرے مردوں سے اس لیے نفرت نہیں کرتی تھی کہ اب تک اسے جن مردوں سے سابقہ پڑچکا تھا وہ اچھے اور پر خلوص تھے۔ گو اس نے کئی بار کیا روز ہی محسوس کیا تھا اور کر رہی تھی کہ عابد بیگ اسے ایسی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے کہ سیدھی دل میں اتر جائے۔ مگر پھر بھی اب تک اس نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جو اسے دفتر میں بدنام کردے یا کوئی اسکینڈل کھڑا کردے۔ وہ بہت اچھے اخلاق کا مالک تھا۔ زندگی میں عابد بیگ دوسرا شخص تھا جس کے بارے میں اس نے سوچا تھا۔ اس نے دفتر کی لڑکیوں اور عورتوں کی زبانی سنا تھا کہ عابد بیگ کی گھریلو زندگی خوشگوار نہیں ہے۔ دولت مند بیوی نے زندگی کو وبال بنا کر رکھ دیا ہے۔ جبھی اسے بیوی سے زہر بھری تلخی ملی تھی۔ اسی لیے تو وہ نگاہ التفات کے لیے چشم براہ رہتا تھا۔ وہ عابد بیگ کے دلی کرب اور جذبات کو اس کی آنکھوں میں پڑھ کر اپنی نظریں چرالیتی تھی۔

عابد بیگ نے محسوس کرلیا تھا کہ شہلا احمد کو اس کے دلی جذبات اور نظروں کا احساس ہوچکا ہے جبھی وہ کئی دنوں سے قریب والی کرسی چھوڑ کر سامنے والی کرسیوں میں سے کسی ایک کرسی پر بیٹھتی ہے۔ حالانکہ دائیں اور بائیں طرف بھی کرسیاں ہوتی تھیں۔ پھر وہ اپنا سر اس طرح جھکا لیتی ہے کہ اس کا جوڑا اور بال ہی نظر آتے ہیں۔ مضمون اختتام کو پہنچتے ہی وہ غیر محسوس انداز سے عجلت میں کھڑی ہوجاتی ہے۔ کوشش کرتی ہے کہ اس کی نظریں عابد بیگ کی نگاہوں سے نہ ٹکرائیں۔ یہ سب کچھ اس کے سینے میں خلش بن کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ تو اس موقع کی تلاش میں تھا کہ کبھی اپنا دل شہلا احمد کے قدموں میں رکھ دے۔ وہ درد آشنا ہے۔ اس کے درد کا احساس اسے جتنا ہوسکتا ہے کسی اور عورت کو نہیں ہوسکتا ہے۔

ایک روز اس کے ذہن نے ایک ایسی تدبیر سوچ لی کہ وہ اچھل پڑا۔ جب شہلا احمد اس کے سامنے والی کرسی پر رف پیڈ اور کاغذ سنبھال کر بیٹھی تو اس نے خلاف معمول اپنی پشت کرسی سے ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ خط کا مضمون لکھوانے لگا۔ سوچ سوچ کر ایک ایک جملہ بولتا جارہا تھا پھر اس نے یک لخت شہلا احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سنو شہلا احمد...... اگر میری کوئی بات ناگوار لگے تو ایک مجذوب کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کردینا' بھلا دینا آج میں آپ سے وہ بات کہنا چاہتا ہوں جو میرے لیے کش مکش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ میں راتوں کو سو نہیں سکتا۔ سوچتا رہتا ہوں' کرب مجھے کسی لمحے چین لینے نہیں دیتا ہے۔ میں اپنے آپ کو شکست نہ دے سکا تو آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتایئے شہلا احمد! میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ آپ بھی ایک عورت ہیں' شاہدہ بھی ایک عورت ہے لیکن تم دونوں میں زمین آسمان جیسا فرق کس لیے ہے۔ وہ برسوں کی رفاقت میں ایک لمحہ بھی محبت اور پیار کا نہیں دے سکی' آپ کی قربت کا ایک لمحہ جیسے صدیوں کی محبت پر محیط ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہے شہلا احمد؟ کس لیے ہے؟ میرے سینے میں جو آتش فشاں دہک رہا ہے لاوا جو اندر ہی اندر پکتا جارہا ہے وہ جبھی سرد پڑسکتا ہے جب آپ کو پالوں' میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں شاہدہ کو طلاق دے دوں گا۔ طلاق دینے سے اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس کے پاس بے حساب دولت ہے۔ دولت ہو تو ایک اسی سال کی بوڑھی عورت کو بھی اٹھارہ سال کے جوان لڑکے کا سہارا مل جاتا ہے۔ میں آپ کے زخموں پر اپنی محبت کا مرہم رکھنا چاہتا ہوں۔ قدرت نے شاید اسی لیے ہم دونوں کو پیدا کیا ہے کہ ایک دوسرے کی ذات کا جز بن جائیں۔ بے رحم وقت انسان کو بار بار مہلت نہیں دیتا ہے۔ زندگی میں ایک بار ہی موقع ملتا ہے' اگر آپ نے میرا ہاتھ تھام لیا تو ہم اپنی اپنی روحانی منزل کو پالیں گے بشرطیکہ آپ اس بے وفا مرد کے زمرے میں کسی اور کو شامل نہ کرو اور انتقام کے جنون کو اپنی منزل نہ بناؤ...... کیا...... کیا آپ......''

عابد بیگ نے اپنا آخری جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ شہلا احمد ششدر تھی۔ وہ پتھر کی طرح منجمد ہوگئی تھی اور وہ کتنی ہی دیر تک مورت بنی رہی۔ جب وہ اپنی جگہ سے اٹھی تو نڈھال سی ہورہی تھی۔ اس کی جھیل سی آنکھوں میں ابر جیسے برسنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا' وہ گھومی اور کمرے سے نکل گئی۔

شہلا احمد دفتر میں نہیں رکی وہ طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے گھر چلی آئی۔ اس نے کمرے میں بند ہوکر تنہائی میں عابد بیگ کی باتوں سے پیچھا چھڑانا چاہا جو اس کے وجود سے چمٹ گئی تھیں۔ اس شخص کی آواز میں کیسی التجا تھی۔ کیسا سحر تھا جو چاہتے ہوئے بھی اس سے نکل نہ سکی تھی۔ وہ آج اس آسیب سے نکل آئی تھی جو نجم الہدیٰ سے جدا ہوتے وقت اس کا مقدر بن گیا تھا۔ نفرت جو دل میں تھی اس کی جگہ عابد بیگ نے لے لی تھی۔ وہ خواب جو وہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی جو زندگی میں بار بار تعبیر بن کر نہیں آتے ہیں' پھر وہ سپنا اس کی نظروں کے سامنے لہرانے لگا تھا۔ اس نے لمحے کے لیے سوچا کہ اب اسے گھر بسالینا چاہیے اس لیے کہ اب اس کی عمر پینتیس برس ہورہی ہے۔ پانچ سال کے بعد سر کے سیاہ بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگیں

گئے۔ نجم الہدیٰ سے انتقام لینے کی یہی ایک راہ رہ جاتی ہے۔ وہ اسے جتا تو سکتی ہے دیکھو دنیا میں ایسے مردوں کی کمی نہیں ہے جو عورت کے دل میں چھپے جذبوں کو اس کی آنکھوں میں پڑھ کر اپنا شریک سفر بنا لیتے ہیں۔ عابد بیگ مجھے اپنا رہا ہے۔ اس کے پاس اتنی دولت تو نہیں ہے جو تمہارے پاس ہے مگر اس کے پاس وہ دل ضرور ہے جو تمہارے سینے میں نہیں ہے۔ ایک عورت کو دولت کی نہیں محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔

مگر شہلا احمد۔ "اس کے دل کے کسی گوشے میں نادیدہ آواز نے اس سے سرگوشی کی۔ "تم ایک عورت ہو کر ایک عورت کا گھر اجاڑ رہی ہو۔ آخر اس عورت کا کیا قصور ہے؟ اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟" اس نے جزبز ہو کر پوچھا۔ آخر میرا قصور کیا تھا۔ میں بھی تو معصوم تھی، میں نے دکھوں میں نجم الہدیٰ کا پورا پورا ساتھ دیا۔ جب اچھے دن آئے اس نے مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ کیا کمینگی اور خود غرضی کی اتنی بڑی مثال تم پیش کر سکتے ہو؟ سبھی اپنی خوشیوں کے لیے دوسروں کی خوشیوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہ دیوانگی اور بربریت ہر انسان کی فطرت کا ایک حصہ ہے۔

شہلا احمد دوسرے دن دفتر پہنچی تو اس نے دھڑکتے دل سے عابد بیگ کے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ عابد بیگ کو دیکھتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کی نظروں کو یقین نہیں آیا کہ کرسی پر جو شخص بیٹھا ہوا ہے وہ عابد بیگ ہی ہے۔ شہلا احمد نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا سراپا دیکھا۔ لباس پر شکنوں کا جال پھیلا ہوا تھا جیسے اسے لباس تبدیل کرنا یاد نہ رہا ہو۔ یا کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ بال الجھے اور پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ سخت اور ہونٹ خشک تھے۔ عابد بیگ کے ہونٹ بدبدائے۔ وہ اتنی دور تھی کہ ایک لفظ بھی سن نہ سکی۔ شہلا احمد اس کی یہ حالت دیکھ کر سہم سی گئی اور سینے میں اس کا دل کانپنے لگا۔ وہ اپنا ہر نقش وجود سمیٹتی ہوئی اس کی میز کے پاس پہنچی تو عابد بیگ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "آؤ مس شہلا احمد! میں ساری رات سو نہیں سکا۔ میں بس سوچتا رہا کہ آپ میرے بارے میں نجانے کیا فیصلہ کریں گی؟"

"فیصلہ؟" وہ اچھل پڑی۔ "فیصلے اتنی جلدی نہیں ہوتے۔ میں کوئی جوان لڑکی نہیں ہوں جو فوراً ہی جذباتی فیصلہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں۔"

"آخر اس فیصلے میں دیر کس لیے ہے۔ ہمارے درمیان کوئی دیوار تو کھڑی نہیں ہے۔ ہم کوئی بچے نہیں ہیں۔"

"آخر آپ مجھ سے ہی کس لیے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ دنیا اتنی بڑی ہے کہ یہاں حسین اور مجھ سے کم عمر لڑکیوں اور عورتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میں آپ کو کیا دے سکتی ہوں؟"

"محبت!" اس کے لبوں پر مردہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "میں ساری زندگی جیسے آپ ہی کے خواب دیکھتا چلا آرہا ہوں۔"

"اگر میں آپ سے شادی کرنے سے انکار کردوں تو پھر آپ کسی دوسری عورت سے شادی کرلیں گے نا؟"

"آپ نے انکار کر دیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گا لیکن میں آپ کے سوا کسی اور عورت سے شادی نہیں کروں گا۔ آپ سے ہر قیمت پر شادی کر کے رہوں گا۔" اس نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔

"آپ کی بجائے کسی اور عورت سے شادی کرنے سے کیا حاصل ہوگا اس سے تو بہتر ہے کہ میں آخری سانس تک اپنی بیوی سے نبھاہ کروں۔"

"وہ کس لیے؟" شہلا احمد نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا اور عورت اس خلا کو پر نہیں کر سکتی ہے؟"

"نہیں، میں کسی اور عورت سے شادی کر کے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ کیا معلوم وہ کس مزاج اور طبیعت کی ہو۔ میرے تصور سے برعکس ہوئی تو وہ میرے لیے عذاب بن جائے گی۔"

"پھر آپ مجھے سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے ایک ہفتہ کی چھٹی دیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "شادی کا فیصلہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔"

"ایک ہفتے کی چھٹی!" اس نے شدید حیرانی سے کہا اور ہنسنے کی کوشش کی۔ "آپ شادی کا فیصلہ کرنے جارہی ہیں یا کشمیر کا؟"

□......□......□

ایک ہفتہ کا انتظار اس پر قیامت بن کر گزر گیا آج وہ بڑے کرب و بے چینی سے شہلا احمد کا انتظار کر رہا تھا۔ جب شہلا احمد اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ آج شہلا احمد کا روپ بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ کسی دلہن کی طرح سج دھج کر آئی تھی۔ اس کے بدن پر گہرے نیلے رنگ کی بنارسی ساڑی تھی۔ وہ بڑی حسین لگ رہی تھی۔ اس نے گلے میں نیکلس اور کانوں میں آویزے بھی پہن رکھے تھے۔ وہ بائیں ہاتھ کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ "میں آپ کو بتانے آئی ہوں کہ میں نے شادی کرلی ہے۔ کل!"

"آپ نے شادی کرلی؟" اس کے سینے میں جیسے زہر میں بجھی ہوئی چھری اتر گئی۔ "لیکن آپ کو شادی تو مجھ سے......"

"میں نے قسم کھالی تھی کہ میں آخری سانس تک شادی نہیں کروں گی۔ نجم الہدیٰ نے مجھے طلاق دے دی تو پھر میرے دل میں دوبارہ گھر بسانے کی کوئی امنگ اور خواہش نہیں رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ ساری زندگی تنہا کاٹ لوں گی مگر آپ کی دل نواز شخصیت نے میری شخصیت کو توڑ پھوڑ کر خول سے نکال دیا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک عورت ہو کر ایک عورت کا گھر اجاڑنے جارہی ہوں جو زخم کسی عورت نے مجھے دیا ہے وہی زخم میں کسی اور عورت کو دینے جارہی ہوں۔ پھر میں نے سوچا کہ آپ نے دس برس ایک عورت کے ساتھ کاٹ لیے ہیں تو دس پندرہ سال اور کاٹ لیں گے۔ آخر ہماری زندگی کے دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ میں نے ایک عورت ہونے کے ناتے، ایک عورت اور اس کے بچوں کو شوہر اور باپ سے محروم کرنے کے بجائے ایک اور زخم دل پر لگا لیا ہے۔ مجھے ایسے شخص سے شادی کرنا پڑی جسے میں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ نفرت کی اور آج بھی اس سے نفرت ہے۔ میں نے اس لیے شادی کرلی کہ آپ میری وجہ سے ایک گھر برباد نہ کردیں۔ ایک گھر جیسا بھی ہو وہ ایک گھر ہی ہوتا ہے۔"

نٹ کھٹ

برادرم عمران احمد،

السلام علیکم!

امید ہے مزاج بخیر ہوگا ایک بچے کی چھوٹی سی سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوں۔ ایک ایسے بچے کی کہانی جسے معلوم تھا کہ وہ لمحہ لمحہ مر رہا ہے۔ زندگی اس سے ہر لحظہ دور ہو رہی ہے۔ مگر وہ ان چند لمحات میں زندگی کی ساری خوشیاں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ یقیناً یہ کہانی قارئین کی پلکوں کو بھگو دے گی۔ سب سے التماس ہے کہ وہ اس نٹ کھٹ کے لیے دعا کریں۔ وہ جہاں بھی ہو اللہ تعالیٰ اسے وہ تمام خوشیاں عطا کرے جس کی اسے زندگی میں تمنا تھی۔

والسلام

ناظم بخاری

میری پہلی ملاقات اس سے اس وقت ہوئی تھی جب رات کی ڈیوٹی میں، میں معمول کے مطابق مریضوں کو چیک کرتی پھر رہی تھی۔ پندرہ نمبر کمرے کے تین نمبر بیڈ کا مریض اسی دن ہی فارغ ہوا تھا، جس کی جگہ اس معصوم سے لڑکے نے سنبھال لی تھی۔ پہلی نظر میں ہی وہ مجھے اچھا لگا تھا، اپنے لبوں پر سجی مسکراہٹ اور چہرے پر چھائی معصومیت کی بدولت۔ میں نے اس کے قریب جا کر پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

''ہیلو پیارے بوائے! کیسے ہو؟''

''آئی ایم فائن سسٹر!'' اس نے اپنی شوخ اور دلکش آواز میں جواب دیا تھا، اس کے چہرے کی طرح اس کی آواز بھی بہت شیریں تھی۔

مجھ سے پہلے موجود نرس روزی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کینسر کا مریض ہے۔ اس کینسر کا مریض جس کا انت موت کی دہلیز پر ہی جا کر ہوتا ہے۔ اسے دیکھنے کے بعد وہ مجھے کہیں سے بھی کینسر کا مریض نہیں لگا تھا۔ بقول روزی اس کا کینسر اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ اب دنیا کا کوئی ڈاکٹر بھی اسے نہیں بچا سکتا۔ تمام ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا ہے اور اب وہ صرف چند دنوں یا پھر کچھ ہفتوں کا مہمان ہے مگر اس کے ماں باپ وہ ابھی تک خود کو پر فریب رستوں کے راہی بنائے ہوئے ہیں۔ کسی معجزے، کسی کرامت کی امید پر گو ہمارا آئے دن نہ سہی مگر بہت دفعہ ایسے مریضوں سے پالا پڑتا رہتا تھا۔

ان کی تکلیف کا احساس کر کے دل دکھتا رہتا تھا مگر اس لڑکے کے بارے میں جان کر مجھے جو تکلیف ہوئی تھی اس سے یہ دل پہلے کبھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ پہلی ملاقات کی ہیلو ہائے کے بعد میں آگے بڑھ کر دوسرے مریضوں کو دیکھنے لگی تھی۔ مگر میں نے اسی وقت دل میں ارادہ باندھ لیا تھا کہ مجھے اپنا زیادہ وقت اسی لڑکے کو دینا ہے، اس کا دل بہلانا ہے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ اس کے گھر والوں نے بھی اس سے اس حقیقت کو چھپا رکھا تھا کہ وہ کینسر کا مریض ہے اور صرف چند دنوں کا مہمان ہے ہماری دوسری ملاقات ایسے ہوئی کہ نہ صرف اس ملاقات میں ہم نے ایک دوسرے کے

بارے میں تھوڑا بہت جانا بلکہ ہماری وہ ملاقات معصوم دوستی کا سنگِ بنیاد بھی ثابت ہوئی۔ اپنی شادی کے سات سال گزرنے کے باوجود بھی خدا نے مجھے اپنی اس مخصوص رحمت سے نہیں نوازا تھا۔ جس سے نہ صرف عورت کی تکمیل ہوتی ہے بلکہ وہ ہر ممتا کا حق بھی ہے۔ میرا دامن، میری گود ایک عرصے سے خالی چلی آ رہی تھی اس امید پر کہ ایک دن یہ گود ہری ہوگی، دامن بھر جائے گا۔

یہی وجہ تھی کہ میں اپنے دل میں اس کے لیے ایک نرم گوشہ محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ گوشہ جسے لوگ ممتا کے نام سے پکارتے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا میری اور اس کی معصوم دوستی پروان چڑھتی گئی۔ میں جب بھی ڈیوٹی پر آتی اس کے لیے گھر سے کوئی نہ کوئی چیز بنا کر ضرور لے آتی یا پھر بازار سے ہی کوئی چیز خرید کر لاتی جو کہ اسے پسند ہوا کرتی تھی۔ جسے ذرا بحث و مباحثے کے بعد وہ قبول کر لیا کرتا تھا۔ اس کے پاس اس کے بابا بھی کبھار ہوا کرتے تھے مگر اس کی ماں اکثر اس کے پاس بیٹھی رہا کرتی تھی، ہنستی مسکراتی اس کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی مگر اس کی آنکھوں میں ہمیشہ مجھے وہی دکھ، وہی خوف نظر آیا جو کسی عزیز ترین چیز کے چھن جانے کا ہوتا ہے۔ میں اس کے دکھ کو سمجھ سکتی تھی، محسوس کر سکتی تھی۔ میں نے بارہا اسے نماز کی مخصوص جگہ پر نماز ادا کرنے کے بعد دستِ دعا بلند کرتے اور آنسو بہاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ کائنات کے سب سے بڑے مسیحا سے اپنے لختِ جگر کے لیے مسیحائی مانگا کرتی تھی، گڑگڑایا کرتی تھی۔ یہ بھی مجھے اسی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ مانی ان کی واحد اولاد ہے جو کہ شادی کے کئی برسوں بعد بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔

میں اندازہ کر سکتی تھی کہ جو چیز آپ کو منتوں، مرادوں کے بعد حاصل ہو اور کچھ عرصے بعد آپ کو معلوم ہو کہ وہ چیز آپ سے چھینی جا رہی ہے تو آپ کی کیا حالت ہوگی؟ آپ چاہ کر بھی اس حادثے کو روک نہیں پائیں گے، کچھ نہیں کر سکیں سوائے چیخنے، چلانے، رونے یا پھر چپ چاپ تماشہ دیکھنے کے۔ مانی کی ہی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ وہ 9th کا اسٹوڈنٹ ہے۔ یہ سن کر مجھے بے حد حیرت ہوئی تھی میں بمشکل اس کی بات کا یقین کر پائی تھی۔ وہ بہت کم عمر تھا، بہت کم عمر دکھتا تھا۔ وہ نویں جماعت کا طالب علم ہے یہ بات ناممکن سی لگتی تھی۔ اس میں بہت سی خوبیاں تھیں جن میں سب سے بڑی یہ تھی کہ وہ خوب صورت اور زندگی سے بھرپور باتیں کیا کرتا تھا۔

ایک دن میں ڈیوٹی پر پہنچی تو میں نے اس کے ہاتھ میں بچوں کی شاعری کی ایک کتاب دیکھی۔ میں نے کہا۔

''ارے نٹ کھٹ! تمہارے ہاتھ میں یہ کتاب؟ تمہیں کب سے شاعری کا شوق ہو گیا؟'' اور پھر مذاقاً کہا۔ ''ابھی تمہاری عمر ایسی کتابیں پڑھنے کی نہیں ہے، ویسے تمہیں شاعری کی کوئی سمجھ بوجھ بھی ہے یا یونہی مجھے امپرس کرنے کے لیے کتاب منہ سے چپکائے ہوئے ہو؟''

وہ شوخی سے گویا ہوا۔ ''آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس کتاب کا میرے ہاتھ میں ہونا کوئی انہونی نہیں ہے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ مجھے اب سے نہیں بلکہ شروع سے شاعری کا شوق ہے اور رہ گیا تیسرے اور چوتھے سوال کا جواب تو وہ یہ ہے کہ شاعری کے لیے کسی مخصوص عمر

کا ہونا لازمی نہیں۔ ہر عمر کا فرد اسے پڑھ سکتا ہے' سمجھ سکتا ہے اور دوسرا میں آپ کو امپریس کرنے کے لیے یہ کتاب نہیں پڑھ رہا بلکہ اسے اچھی طرح سمجھتا بھی ہوں۔" اس نے اس کتاب میں سے نہ صرف مجھے چند ایک نظمیں سنائیں' بلکہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اس نے ان کی تشریح بھی کی۔ اس بار پھر اس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس کے کم عمر ہونے پر ہوا کرتی تھی۔ میں نے ان نظموں کی تشریح سننے کے بعد کہا۔

"ارے نٹ کھٹ! بھئی تم تو بڑے چھپے رستم نکلے۔" اور اس نے کہا۔

"ابھی کہاں سسٹر! اصل رستم تو آپ مجھے کل مانیں گی۔"

"کل! کل کیا ہوگا بھئی؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کل آپ کے لیے ایک سرپرائز ہوگا عالم پناہ! ایک سرپرائز......!" اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر' مخصوص انداز میں کہا اور اس کا یہ انداز میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔ جب اس کی شوخی عروج پر ہوتی تو وہ مجھے "عالم پناہ" کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ اس طرح یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوتا کہ وہ اس وقت سنجیدہ نہیں ہے۔ غیر سنجیدہ ہے۔ اگلے دن واقعی ایک چھوٹا سا سرپرائز میرا منتظر تھا۔ اس رات میں ڈیوٹی پر پہنچی تو اس نے کہا۔

"بتائیے عالم پناہ! وہ سرپرائز کیا ہے' جس کی کل ہم نے بات کی تھی؟" اس کا انداز گزشتہ رات کی طرح تھا' ہاتھ سینے پر...... اس وقت اس کی ماں بھی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ مانی کے اس انداز پر میں نے اس کی ماں کی آنکھوں میں دیکھا' وہ مجھے اس پر من ہی من میں فدا ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کے لبوں پر اس وقت بڑی پیاری اور خوب صورت مسکراہٹ اتری ہوئی تھی۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"بھئی نٹ کھٹ! میں کوئی غیب کا علم تو نہیں جانتی۔ سرپرائز تم نے دینا ہے تو معلوم بھی تو تمہیں ہی ہوگا نا؟"

"پہلے آنکھیں بند کیجیے عالم پناہ!" میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ "اب آنکھیں کھولیے عالم پناہ!" میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا' میرے سامنے ایک ننھی سی' رنگین مگر کتابچہ نما سی ایک کتاب تھی۔ اس کتابچے نما سی کتاب کے دونوں سرے اس کے دائیں اور بائیں ہاتھ میں اس طرح دبے ہوئے تھے کہ اس کتاب کا ٹائٹل اور بیک ٹائٹل دونوں میرے روبرو تھے۔ بیک سائیڈ پر اس کی رنگین اور خوب صورت تصویر موجود تھی اور سامنے والے ٹائٹل پر "پھولوں کی خوشبو" کے حروف درج تھے اور ان کے نیچے مانی کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے کتاب بے ساختہ اس کے ہاتھ سے لے لی۔ وہ شاعری کی ایک خوب صورت مگر ننھی سی کتاب تھی' جس کا مصنف وہ خود تھا۔ یعنی کہ مانی...... حیرت کا ایک اور جھٹکا تھا جو اس رات میرے ذہن نے قبول کیا تھا۔

"کیوں سسٹر! ہے نا سرپرائز؟ یقین نہیں آتا نا؟ مگر یہ سچ ہے۔ اس بُک کا ہر لفظ میں نے لکھا ہے اور دل سے لکھا ہے۔ اس میں تھوڑی بہت غلطیاں تھیں جو کہ سر آصف نے دور کر دیں۔ ابھی ایک ماہ پہلے ہی بابا نے مجھے یہ بُک شائع کرا کر دی ہے' کیسی ہے؟ اچھی ہے نا؟"

"ہاں بالکل! تمہاری طرح خوب صورت' معصوم اور دلکش!" اس کے لبوں پر ایک پیاری سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے اس رات ہی وہ ننھی سی بُک پڑھ ڈالی تھی گو وہ شاعری "معیاری" اور اعلیٰ سطح کی نہیں تھی (ہو بھی کیسے سکتی تھی' اس کا مصنف ایک نوعمر لڑکا ہی تھا) مگر جیسی بھی تھی بہت خوب صورت' شفاف اور نکھری ہوئی تھی اور سب سے بڑی بات کہ سادگی سے پُر تھی۔ ایسی سادگی سے جو سچ مچ دل میں اتر جاتی ہے۔ اس کتاب میں پریوں کا رقص تھا' جگنوؤں کے خواب تھے' چاند کی چاندنی تھی اور ستاروں کی چمک۔ اس میں بلبل کے نغمے تھے' مینا کی آواز تھی' بادِ صبا کا ذکر تھا اور کلیوں اور گلابوں کی خوش بُو تھی۔ اس کتاب میں وہ سب کچھ تھا جو ایک ننھے سے ذہن کی' خوابوں کی پوری کائنات میں ہوتا ہے۔ دل کی امنگیں' ترنگیں اور خواہشیں...... میں جب بھی ڈیوٹی پر ہوتی' وہ مجھے اکثر جاگتا' کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتا ہوا دکھائی دیتا۔ میری ان دنوں رات کی ہی ڈیوٹی ہوا کرتی تھی۔ ایک شب میں نے اس سے مذاقاً کہا۔

"نٹ کھٹ! تمہیں نیند نہیں آتی کیا؟ جب بھی دیکھو' تم مجھے کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہو' اگر تمہارا یہی حال رہا نا تو دیکھنا ایک دن ایک حرف بھی پڑھنے کے قابل نہیں رہو گے۔"

اس نے کہا۔ "جہاں پناہ! جہاں تک مجھے یاد ہے مما کہتی ہیں میں چار برس کا تھا جب میں نے کتابوں کا کیڑا بننا شروع کیا اور اب میری عمر چودہ برس کے قریب ہے۔ اب تک تو کچھ ہوا نہیں آگے کیسے ہوسکتا ہے اور رہ گئی نیند نہ آنے کی بات تو وہ دن میں ہی پوری کر لیتا ہوں تاکہ مجھے آپ سے رات کو خوب باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔" پھر اس نے میرے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"سسٹر! آپ مجھے بہت پیاری لگتی ہیں' بہت ہی پیاری۔ میں سچ مچ آپ سے پیار کرنے لگا ہوں۔ اگر آپ کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو میں آپ سے ہی شادی کر لیتا۔" میں نے اس کی پیشانی چوم کر جواب دیا۔

"تم مجھ سے پیار کرتے ہو تو میں بھی اپنے نٹ کھٹ سے پیار کرتی ہوں۔" اور پھر دل میں کہا۔ "کاش! اگر تمہیں زندگی کے مزید چند برس ہی مل جائیں تو میں اپنے چاند کے لیے چاند سے بھی پیاری دلہن ڈھونڈ لاؤں۔" اور یہ سوچتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی میری آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ وہ بہت عجیب و غریب شخصیت اور کردار و اعمال کا مالک تھا۔ وہ جتنا معصوم اور سیدھا سادہ تھا اس سے زیادہ گہرا اور ذہین بھی تھا۔ اس کی ذہانت و فطانت کے یوں تو کئی پہلو پہلے ہی مجھ پر عیاں تھے اور مزید ہوتے رہتے تھے مگر اس کی گہرائی کا وہ پہلو اس دن پہلی بار مجھ پر آشکار ہوا تھا۔ اس روز معمول کے مطابق اس کی ماں جائے نماز بچھا کر نوافل ادا کرنے میں مصروف تھی اور میں تمام مریضوں کو نمٹا کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی اور پھر میں اسے اور وہ مجھے لطیفے سنانے لگا تھا۔ جنہیں سن سن کر سچ مچ میرے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔ اس نے ایک لطیفہ ختم کرنے کے بعد کہا۔

"عالم پناہ! ایک اور لطیفہ سناؤں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں بھئی بس...... بس اب نہیں' میرے پیٹ میں درد ہونے لگا ہے۔"

"نہیں نہیں......!" اس نے مخصوص انداز

میں کہا۔ ”یہ کوئی خاص لطیفہ نہیں ہے‘ پچی اسے سن کر آپ کو زیادہ ہنسی نہیں آئے گی۔ ہاں تھوڑی بہت ضرور آسکتی ہے۔“

”چلو سناؤ!“ میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

”کان قریب لاؤ!“ میں نے کان قریب کردیئے۔ ”یہ جو مما‘ پپا ہیں نا‘ قسم سے سو فیصد بدھو ہیں۔ مجھے بہلاتے ہیں‘ چکر دیتے ہیں کہ مجھے کچھ نہیں...... مگر میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں سب جانتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کینسر کا ایک لاعلاج مریض ہوں اور اب عنقریب...... میرے یہاں بہت کم دن رہ گئے ہیں۔ میں یہاں سے اس دنیا سے جانے والا ہوں۔“ اس نے یہ بات اتنے شگفتہ لہجے میں کہی‘ جیسے مجھے کوئی لطیفہ سنایا ہو اور اس کے بعد اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اس لطیفے کی داد بھی مانگ رہا ہو۔ میں بیان نہیں کرسکتی کہ وہ کیسا درد تھا‘ کیسی اذیت تھی‘ جو میں نے اس دن اپنی روح میں جنم لیتے ہوئے محسوس کی تھی۔ میرے اندر سے ایک طوفان سا اٹھا تھا جو میری پلکوں تک آ کر روکنے کے باوجود بھی نہیں رکا تھا۔ قطار در قطار کئی آنسو تھے جو میرے رخساروں پر بہتے چلے گئے تھے‘ میں نے بے ساختہ اسے بانہوں میں بھرلیا‘ بھینچ لیا اور پھر اس کے رخساروں پر پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں نٹ کھٹ! نہیں...... تمہیں کچھ نہیں ہوگا‘ تمہیں کچھ نہیں ہوسکتا۔ خدا کرے میری دھڑکنیں تمہاری دھڑکنوں میں بدل جائیں۔ میری ہر سانس‘ تمہاری سانسوں سے جڑ جائے۔ تمہیں میری عمر لگ جائے میرے چاند!“

میری وہ شب افسردگی سے گزری اور اس سے اگلی شب بھی مگر تیسری شب ہی اس نے اپنی خوب صورت اور شریر باتوں سے میرے لبوں پر مسکراہٹیں بکھیرنا شروع کردیں اور یوں اداسی کی گھٹائیں‘ چند دنوں کے لیے کسی دوسری طرف چلی گئی تھیں مگر کبھی کبھی اس کی ایسی باتیں سن کر میری آنکھوں میں نمی بھی اتر آتی تھی۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوب جاتا تھا کہ یہ چاند سا چہرہ‘ یہ پھولوں سی باتیں کرنے والا وجود اور لبوں پر مسکراہٹیں بکھیرنے والی شخصیت عنقریب فنا ہونے والی ہے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جس کے آنے کا خدشہ اس کے ماں باپ کو ہی نہیں‘ مجھے بھی دہلائے رکھتا تھا۔ اس شب میں معمول کے مطابق ڈیوٹی پر ہی تھی اور اس کے پاس بیٹھی اس سے باتیں کررہی تھی کہ اچانک اس کی طبیعت بگڑنا شروع ہوگئی۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نمایاں ہوئے اور دوسرے ہی پل وہ درد سے دُہرا تہرا ہو کر رہ گیا۔ مجھے فوراً ہی احساس ہوگیا کہ کیا ہونے والا ہے میں وقت ضائع کیے بغیر فوراً ہی ڈاکٹر وسیم کے پاس پہنچی وہ اس وقت وہاں کے سب سے سینئر ڈاکٹر تھے۔ چند لمحوں بعد ہی میں ڈاکٹر وسیم اور دوسری چند نرسوں کے ہمراہ اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ ڈاکٹر وسیم کے کہنے پر درد کو کم کرنے والا انجکشن میں نے اس کے وجود میں اتار دیا۔ چند لمحوں بعد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس کی اذیت کسی حد تک کم ہوگئی ہے۔ اس نے پُرسکون انداز میں آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور پھر ارد گرد نظر دوڑائی۔ چند لمحوں بعد اس نے مجھے وہیں رکنے اور دوسروں کو وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ ڈاکٹر

وسیم ایک تجربے کار ڈاکٹر تھے‘ میری طرح وہ بھی بخوبی سمجھ گئے کہ یہ دیئے کی وہ لو ہے جو آخری بار اپنی بقا کے لیے پھڑ پھڑا رہی ہے اور وہ تو کیا وہاں کے تمام ڈاکٹر مل کر بھی موت کی آندھی کو اس تک آنے سے نہیں روک پائیں گے۔ انہوں نے افسردگی سے ایک نظر اس پر دوڑائی اور پھر میرے علاوہ سب کو وہاں سے لے کر چلے گئے۔ اچانک اس کی ان آنکھوں سے قطار در قطار آنسو بہنے لگے‘ جنہیں میں ہمیشہ آئینوں سے تشبیہہ دیا کرتی تھی۔ میں اس کے قریب ہوئی تو وہ اپنی بانہیں میرے گلے میں حمائل کرتے ہوئے سسک پڑا۔

”آپی...... آپی...... میں اب نہیں رہوں گا۔ مجھے پتا ہے میں چلا جاؤں گا‘ مگر میں اب جانا نہیں چاہتا...... مرنا نہیں چاہتا...... میں آپ سے پیار کرتا ہوں...... آپ کے لیے جینا چاہتا ہوں...... پہلے میں زندگی سے پیار نہیں کرتا تھا مگر اب کرنے لگا ہوں۔ ابھی تو مجھے بہت سے کام کرنے ہیں‘ بہت آگے جانا ہے پلیز آپی...... پلیز مجھے بچالو...... بچالو مجھے......“ اس وقت اس کی ماں اور بابا وہاں موجود نہیں تھے۔ مانی کو میرے سپرد کرنے کے بعد ایک دن کے لیے کسی ضروری کام سے گھر چلے گئے تھے مگر انہیں کیا پتا تھا کہ ان کے پیچھے...... میں نے بے ساختہ اسے بانہوں میں بھرلیا۔ اس کی بھیگی ہوئی آواز کی اذیت کو محسوس کرکے خود میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ میں نے اسے چومتے ہوئے کہا۔

”نہیں مانی...... نہیں میرے نٹ کھٹ! تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم مجھے چاہتے ہو‘ مجھے پیار کرتے ہو اور جو کسی کو سچے دل سے چاہے‘ پیار کرے‘ وہ کبھی نہیں مرتا...... خدا نے چاہا تو تمہیں کچھ نہیں ہوگا......“ مگر نہیں‘ خدا شاید نہیں چاہتا تھا۔ شاید اسے منظور نہیں تھا کہ وہ مزید اس دنیا میں رہے۔ یہاں کے پُر اذیت تجربات سے گزرے‘ بس اس کے بعد صرف چند لمحوں کا کھیل بچا تھا‘ کچھ دیر بعد پھر اس پر سابقہ کیفیت طاری ہوئی تھی اور اذیت کے نشان‘ اس کے چہرے پر مرتسم ہوتے چلے گئے تھے اور اس کی آنکھیں...... جانے کتنے زمانوں کی اذیت ان میں بھر آئی تھی۔ اس بار تقدیر کا وار کارگر ثابت ہوا تھا۔ موت کی سفاکی نے آ کر اس کی زندگی چھین ہی لی اور ہم سب چاہنے کے باوجود بھی اسے بچا نہیں پائے تھے۔ وہ بہت پیارا تھا‘ خدا کو پیارے‘ اس جیسے افراد بہت پسند ہیں۔ شاید اس لیے اس نے اسے وہاں بلالیا تھا۔ جہاں کے وہ خواب دیکھا کرتا تھا‘ خیال سوچا کرتا تھا‘ وہ جگنوؤں‘ خوشبوؤں‘ پریوں اور نور کی دنیا...... وہ فردوس بریں‘ جہاں کوئی دکھ نہیں‘ غم نہیں‘ تکلیف نہیں۔ میرا دل اب بھی اسے یاد کرکے دکھتا ہے مگر میں یہ سوچ کر خود کو دلاسہ دے لیتی ہوں کہ وہ اب اس دنیا سے بہتر دنیا میں ہے۔ جہاں چین ہے‘ سکون ہے‘ راحت ہے اور مجھے امید ہے کہ بروزِ حشر ہی سہی میں ایک بار اس سے ضرور ملوں گی۔ اسی جذبے محبت اور اپنائیت کے ساتھ‘ جیسے اسے میں یہاں ملتی تھی اور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی مجھے اپنی انہی خوب صورت باتوں اور شریر نظروں کے ہمراہ ملے گا‘ جیسے یہاں ملا کرتا تھا۔

روحانی مسائل

حافظ شبیر احمد

عدیل حسن......شیخوپورہ۔

جواب:۔ گلزار آپ سے مخلص نہیں ہے۔ ملازمت کے لیے "سورۃ القریش" پڑھیے۔ تسبیح روزانہ ۱۱۔۱۱ درود شریف۔

محمد قاسم......راولپنڈی۔

جواب:۔ بچے کا نام بدل دیں نام کا کافی اثر ہے۔ بچے پر برے اثرات ہیں جس کی وجہ سے پریشانی رہتی ہے۔ صبح وشام آیۃ الکرسی، الفاتحہ، سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 7-7 مرتبہ پڑھ کر بچے پر دم کریں روزانہ اول و آخر 3-3 مرتبہ درود شریف۔ روزانہ ایک بار بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر یا کھوپرے کے تیل پر روزانہ ایک بار "سورۃ الزمر" پڑھ کر دم کریں یا تیل پر دم کر کے سر کی مالش کریں (نیت پڑھتے ہوئے کہ بخار میں جو جھٹکے لگتے ہیں یا سر میں جو بھی مسئلہ ہے وہ ختم ہو) 3 ماہ تک۔

ث۔م......جلال پور۔

جواب:۔ انا فتحنا لک فتحا مبینا. 313 مرتبہ نماز عشاء 11-11 مرتبہ درود شریف۔ جو مسائل ہیں ان کا تصور رکھ کر پڑھیں۔

ثمینہ طاہر......کیروالا

سوال:۔ آداب! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میری ہمشیرہ کی شادی کو چھ سال ہوگئے ہیں لیکن ابھی تک بچہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹروں کو چیک کروایا ہے۔ وہ کہتے ہیں ٹیوبیں بند ہیں۔ آپریشن کروائیں۔ لیکن ہم آپریشن نہیں کرواتے۔ مہربانی سے کوئی عمل بتائیں۔ تاکہ میری ہمشیرہ اولاد کی نعمت سے فیض یاب ہوسکے۔

جواب:۔ قل یحییھا الذی انشاھا اول مرہ. 313 مرتبہ بعد نماز عشاء مریض خود پڑھے۔ 11-11 مرتبہ درود شریف دعا کریں شفاء کی صدقہ بھی دیں۔ 3 ماہ تک پڑھنا ہے۔

آسیہ قیصر......اوکاڑہ

جواب:۔ اپنے شوہر کا صدقہ دیں۔ (مرغی یا بکرا جو حسب حیثیت ہو۔) بعد نماز عشاء "یا وھاب" 313 مرتبہ۔ پڑھتے وقت تصور رکھنا ہے کہ اس لڑکی سے ان کا دل اور دماغ ہمیشہ کے لیے دور ہوجائے اور میری طرف مائل ہوجائے۔

(کیا آپ مستقل پاکستان میں رہتی ہیں۔ اگر مستقل پاکستان میں رہتی ہیں تو کیوں؟)

م۔ش......حیدرآباد

سوال:۔ السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا رشتے طے ہونے میں رکاوٹ ہے۔ میری 3 منگنیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ ہم لوگ خود جواب دیتے ہیں لڑکے والوں کو ان کے لالچ کی وجہ سے کیا کسی نے بندش کروائی ہے؟ مہربانی کر کے بتائیں۔

جواب:۔ کسی قسم کی بندش نہیں ہے۔ وہم کا کوئی علاج نہیں ہے۔

صائمہ جبیں......لاہور

سوال:۔ السلام علیکم! میرا نام صائمہ جبیں ہے۔ میری تاریخ پیدائش 6-2-1977 ہے اور میری والدہ کا نام پروین اختر ہے۔ میں لاہور کی رہائشی ہوں۔ اپنی شادی کے حوالے سے پوچھنا چاہتی ہوں۔ کچھ عرصے پہلے میری والدہ نے میری ایک رشتے والی کے ذریعے رشتہ کی بات کی۔ پہلے تو وہ میرے لیے رشتے لاتی رہی مگر خدا کی مرضی کہ کہیں بات نہ بن سکی اور اب رشتے والی نے بھی آنا بند کردیا ہے۔ شاید کوئی رکاوٹ یا بندش ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ رکاوٹ یا بندش دور ہوجائے اور میرے لیے کوئی مناسب رشتہ آئے جو میرے سب گھر والوں کو پسند آئے۔ اس کے لیے مجھے کوئی مناسب پڑھائی بتائیں کہ میرا مسئلہ حل ہوجائے۔ شکریہ۔

جواب:۔ نماز کی پابندی کریں۔ بعد نماز عشاء سورۃ

الفاتحہ 41 مرتبہ اول و آخر درود شریف 11-11 مرتبہ دعا بھی کریں اپنے رشتے کی رکاوٹ ختم ہونے کے لیے۔

حنا......کراچی

سوال:۔ ہم دو بہنیں ہیں۔ میں انٹر کر چکی ہوں اور میری بہن نے پانچویں تک پڑھا ہے اور میری بہن کی عمر 26 سال ہے اور میری عمر 24 سال ہے نہ ہمارے گھر رشتے آئے ہیں اور ہماری شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ جب کسی کے ہاں جاتے ہیں یا کوئی ہمارے گھر آتا ہے اپنا ہو یا غیر ہم سے بات ٹھیک نہیں ہوپاتی اور کسی کے سامنے جا نہیں پاتے۔ اسی وجہ سے جسم میں لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ دل گھبرانے لگتا ہے ہاتھ پیر ساتھ نہیں دیتے۔ پورے جسم میں عجیب سی کیفیت ہوجاتی ہے۔ ذہن ساتھ نہیں دیتا اور زبان بھی ساتھ نہیں دیتی ہاتھوں سے برتن ٹوٹنے لگتے ہیں۔ اس کمزوری کی وجہ سے ہم احساس کمتری کا شکار ہیں۔ اسے جلد از جلد دور کرنا چاہتی ہوں۔

جواب:۔ سلام قولا من رب رحیم. 111 مرتبہ۔ 11-11 مرتبہ درود شریف بعد نماز عشاء۔ نماز کی پابندی کریں۔

روشنی......گوجرانوالہ

جواب:۔ تعویذ اتار دیں۔ نماز کی پابندی کریں۔ لیخرجکم من الظلمت الی النور. 111 مرتبہ بعد نماز عشاء۔ 11-11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔ پڑھتے ہوئے اپنا تصور کریں۔

پپو......خانیوال

سوال:۔ السلام علیکم! مہربانی فرما کر آپ میرے مسئلہ کا حل بتادیں۔ ہمارا کاروبار بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ لیکن 2006ء کے بعد آہستہ آہستہ کم ہوتا رہا اور اب بالکل بھی اچھا نہیں ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ نظر لگ گئی ہے اور کوئی کہتا ہے کہ کسی نے تعویذ کردیے ہیں مہربانی فرما کر اس کا حل بتادیں اور اگر کوئی وظیفہ کرنا ہے تو وہ بھی بتادیں شکریہ۔

جواب:۔ ان اللہ یرزق من یشاء بغیر حساب. 313 مرتبہ بعد نماز فجر اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف دعا کریں۔ بعد حالات اچھے ہوجائیں گے۔ 41 نیم کے پتے لے کر اس پر 3-3 مرتبہ سورۃ الفلق، سورۃ الناس پڑھ کر دم کریں۔ بارش کے پانی میں ابال کر نہالیں۔ پانی نالی میں نہ جائے۔ (یہ عمل ایک دفعہ کرنا ہے)۔

محمد ارشد......دینہ

سوال:۔ پہلا مسئلہ یہ ہے میرے اندر اعتماد بالکل نہیں ہے۔ اپنی طرف سے میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ ہر کام پورے اعتماد سے کروں لیکن باوجود کوشش کے میں وہ کام اعتماد سے نہیں کرسکتا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا دماغ حاضر نہیں رہتا۔ کوشش کے باوجود ایسا نہیں کرسکا۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے دماغ میں سمجھ بالکل نہیں آتی۔ آپ سے امید ہے کہ آپ میرے مسائل کا حل نکالیں گے۔ جس سے میرے مسائل ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائیں۔ شکریہ۔

جواب:۔ مستقل مزاجی پیدا کریں۔ آپ لوگوں کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے آپ یہاں کھڑے ہیں۔ نماز کی پابندری کریں۔ صدقہ دیتے رہیں۔ استغفار اور درود شریف کی 1-1 تسبیح روزانہ کریں۔

جمیلہ خاتون......نارتھ کراچی

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ یٰسین اور سورۃ مزمل 1-1 مرتبہ۔ بعد نماز عشاء لیخرجکم من الظلمت الی النور. 313 مرتبہ۔ 11-11 مرتبہ درود شریف اول و آخر۔ آپ خود یہ عمل کریں۔ رشتہ ہونے کے بعد عشاء کی نماز والا وظیفہ ختم کردیں اور فجر کی نماز کے بعد والا اپنے معمول میں رکھیں۔ وظیفہ پڑھنے کے بعد دعا بھی کریں۔

سمیرا ندیم......اسلام آباد

سوال:۔ السلام علیکم! میری شادی کو ساڑھے تین

سال ہوگئے ہیں اور ابھی تک اولاد نہیں ہے۔ لگتا ہے کسی نے جادو کردیا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم سمجھتی ہوں۔ کبھی احساسِ کمتری کا شکار ہوجاتی ہوں۔ میرے مسئلے کا حل ضرور بتائیے گا۔ اللہ آپ کو خوشیاں دے آمین۔

جواب:۔ کسی قسم کا جادو یا بندش نہیں ہے۔ لا الہ الا انت سبحنک انی کنت من الظلمین. 101 مرتبہ روزانہ بعد نماز عشاء 11-11 مرتبہ اول وآخر درود شریف۔ نیک اولاد کے لیے دعا کریں۔ نماز کی پابندی کریں۔ صدقہ ہمیشہ دیتی رہیں۔

ن۔م...... گوجرانوالہ

سوال:۔ السلام علیکم! میرے بچے کی شادی کا مسئلہ ہے۔ اس کی نظر کمزور ہے۔ رشتے آتے ہیں۔ مگر بات بنتے بنتے بگڑ جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ حالانکہ ہماری بہت مختصر فیملی ہے۔ کاروبار بھی ٹھیک ہے اور کوئی ڈیمانڈ بھی نہیں ہے۔ کوئی بندش تو نہیں ہے۔

جواب:۔ رکاوٹ ہے صدقہ دیں۔ نماز کی پابندی کریں۔ (آنکھوں کا مسئلہ وضاحت سے لکھیں)۔

مہر بھری...... حیدرآباد

سوال:۔ السلام علیکم! آپ کا کالم پڑھا دل کو بہت اچھا لگا آپ کے جوابات مختصر اور جامع ہوتے ہیں امید ہوئی کہ آپ میرے مسئلے کے حل کے لیے میری مدد کریں گے۔ میری بیٹی جس کی عمر 18 سال ہے اس کے لیے بہترین رشتے کے لیے کوئی عمل بتائیں۔ دعا کیجیے لڑکا سلجھی ہوئی طبیعت کا بندہ ہو اور شادی کے لیے سارے انتظامات بھی اچھے طریقے سے خیر و عافیت سے ہوجائیں۔ میرے شوہر بیمار ہیں گھر بیٹھ گئے ہیں۔ 3 بیٹے ہیں جو اپنی اپنی زندگی میں مگن ہیں خیر کوئی گلہ نہیں فکر پریشانی صرف اس بات کی ہے کہ ہماری زندگی میں بیٹی کی شادی ہوجائے اور مسائل اس لیے نہیں لکھ رہی کہ آپ ناراض نہ ہوجائیں۔ میں انتظار اور دعا کروں گی کہ اگست کے شمارے میں آپ بہت اچھا بہترین جواب دیں۔

جواب:۔ "یا لطیف یا ودود" بعد نماز عشاء 101 مرتبہ۔ اول وآخر 11-11 مرتبہ درود شریف۔ بعد نماز فجر سورۃ المزمل 3 بار۔

سعدیہ مظہر...... میرپورخاص

جواب:۔ سورۃ النصر (اذا جاء نصر اللہ والفتح) پوری سورت بعد نماز عشاء۔ 125 مرتبہ اول وآخر 11-11 مرتبہ درود شریف۔ رشتہ کے لیے دعا کریں۔ وہ تعویذ اتار دیں۔

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے ستمبر 2011ء

نام .... والدہ کا نام .... گھر کا مکمل پتا ....

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں ....

خوشبو سخن

عمر اسرار

اعتراف

اک چاند میں اس کا ہیولا ہے
اک میں ہوں اور
اک جھیل سی گہری آنکھیں
اک بادِ نسیم
اک امبر ہے
اک چشموں کی نغمہ سرائی
اور ہے اک شور سا
میری ذات کے اندر
کہ......!
"اس دل میں تم ہی بستے ہو"

ناز سلوش ذشے...... میرپور، آزاد کشمیر

غزل

خوشی کے بدلے تم سے سمجھوتا کروں کیسے
رنگوں پر چھا گئے مگر دل پر اختیار نہیں
خوش نصیب ہیں لوگ رہتے ہیں جو پھولوں میں
غموں میں سلگتے رہتے ہیں دل کو مگر قرار نہیں
چھا گئی ہے اداسی کی لہر ہر ہنستے مسکراتے چہروں پر
کون کسی کو پرکھے گا دل میں مگر پیار نہیں
روز مہکتے دیکھتے ہیں ہم پھول اپنے آنگن میں
کسی کے آنے کی امید سہی مگر اب انتظار نہیں
لوگ خود کو روگ لگا لیتے ہیں اے جاوید
خوشیاں تھیں یہاں کبھی اب وہاں بہار نہیں

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

غزل

لب پہ خوشیاں سجا کے دیکھیں گے
جب تمہیں مسکرا کے دیکھیں گے
ہر تفس میں تمہاری یادوں کی
ایک محفل سجا کے دیکھیں گے
خواہشوں نے تو کر دیا پامال
زندگی کو بجھا کے دیکھیں گے
کھل اٹھے دل میں چاہتوں کے گلاب
اب تیرے پاس آکے دیکھیں گے
نور برسے ہے تیرے چہرے سے
ہم بھی نظریں چرا کے دیکھیں گے

ماہ نور خانزادہ...... لانڈھی، کراچی

حوا کی بیٹی

حوا کی بیٹی مریم جیسی
جس کے آنچل کے تقدس کے لیے
فرشتوں نے قسم کھائی تھی
آج کے انسانی درندوں کے
ہاتھوں
یوں پامال ہو رہی ہے کہ
انسانیت چیخ اٹھی ہے
شیطانیت لرز اٹھتی ہے
تار تار آنچل کے ساتھ
یوں بکھرتی ہے
کہ فرشتے رو دیتے ہیں
طنز کے تیر سہہ کر
ہمدردی کے نشتر سے زخم زخم ہو کر
یوں سنگلاخ چٹان بنتی ہے
کہ
اس کا خاموش چہرہ
سوال کرتی آنکھیں دیکھ کر
عرش کانپ اٹھتا ہے

ریحانہ سعیدہ...... لاہ

غزل

حریم ذات کے اندر مقیم عشق آباد
سلامِ عجز و عقیدت قدیم عشق آباد
دعائے نیم شبی میں بصر نیاز، سدا
خدائے عشق سے مانگا عظیم عشق آباد
یہ کیا مقام ہے آیا ہوا ہوں وجد میں، میں
دہائی دیتی ہے عقلِ سلیم عشق آباد
اب اور کچھ بھی نہ مانگیں گے عمر بھر تجھ سے
سوائے اس کے اے ربِّ رحیم عشق آباد
ہماری خاک سے پھوٹیں گے اور عشق ابھی
اُڑا کے لے جا اے بادِ نسیم عشق آباد

میثم علی آغا

غزل

کانٹوں بھرا ہے راستا منزل تلاش کر
تھک ہار کر نہ بیٹھ جا منزل تلاش کر
گمراہیوں کے خار ہیں دامن بچا کے چل
بن کے تو سب کا راہنما منزل تلاش کر
مجبوریوں کے قصر کی دہلیز پار کر
یہ ہے تقاضا وقت کا منزل تلاش کر
گزری گھڑی سے درس لے اور کل کی فکر کر
یوں کب تلک تو بیٹھے گا منزل تلاش کر
فرقہ پرستیوں کی تو چادر اتار دے
ہو کر تعجب سے جدا منزل تلاش کر
اسلاف کے تُو نقش کفِ پا کو ڈھونڈ لے
کیوں ہے قمر بھٹکا ہوا منزل تلاش کر

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

نظم

کل شام میرے گھر کے آنگن میں
ایک اور
چاند کا ٹکڑا اترا
چاندی جیسا شفاف بدن جس کا
ہونٹوں پر مدھ بھری مسکان لیے
جیسے کہہ رہی ہو
تمہیں معلوم ہے کہ میں کون ہوں؟
آنکھیں نیند سے بوجھل
خواب نئی دنیا کے سجائے
کبھی کھلتی کبھی بند ہوتی
رشتوں کی پہچان کرتے
وہ گلاب کی ایک کلی ہے
اس کا وجود ایسا ہے
میرے لیے
پھول کنول کا کھلا ہو جیسے

وسیم اختر...... راولپنڈی

اب بھی

جب برستی بارش کی جھما جھم
من میں اک ہلچل سی مچاتی ہو
جھولتی ہوئی شاخساروں پہ
کوئل سریلے گیت گاتی ہو
جب چاند بادلوں کے آنچل میں
کبھی چھپتا کبھی مسکراتا ہو
دلفریب سی اڑتی کرنوں میں
ندی کا پانی جگمگاتا ہو
نرم ہواؤں میں لہلہاتی
مخملی گھاس پہ چلتے ہوئے
خوابیدہ افق کے اس پار
رخِ آفتاب ڈھلتے ہوئے
بارش کی دھند میں لپٹی
کلی کلی تو یوں جھومتی ہو
کہ شاخِ گل بے اختیار ہو کے
شوخ ہواؤں کو چومتی ہو

ساون کی ان مہکی فضاؤں میں
دل کیوں بے قرار رہتا ہے
شاید کہہ دے آ کے چپکے سے
مجھے اب بھی ترا انتظار رہتا ہے

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم

غزل

جب تک میرے اندر کوئی پاگل نہیں ہوتا
سینہ میرا بارش سے جل تھل نہیں ہوتا
برسوں سے اٹھا رکھا ہے انا کا پرچم
لیکن میرا بازو کبھی شل نہیں ہوتا
جلتا ہے تجربات کی آگ میں شاعر
ایسے تو وہ شاعر صاحب غزل نہیں ہوتا
ہر شخص یہاں سود و زیاں سے ہے واقف
اس دور کا مجنوں بھی پاگل نہیں ہوتا
نفرت کے مسائل تو حل ہوتے ہیں فوراً
یہ مسئلہ حقیقی محبت کا ہے حل نہیں ہوتا
فرصت کے شب و روز مجھے ہوش نہیں رکھتے
فرقت میں بھی دل میرا بے کل نہیں ہوتا
اس کو بھی مجھ سے بچھڑ کر بڑا رنج ہوا واجد
یوں تو پھیلتا میرا عشق نہیں ہوتا

پروفیسر واجد نگینوی...... ملیر، کراچی

غزل

جنوں کے حصار میں ہے
زندگی تیرے انتظار میں ہے
کانٹوں بھری ڈگر ہے اور
دلِ غم کی قطار میں ہے
باقی سب بھول چکا ہوں
اک نام تیرا شمار میں ہے
زخم فراق دے یا لطفِ وصال
اب سب تیرے اختیار میں ہے
چشم نم دیکھ کر مسکرائے
خوبی یہ میرے غمگسار میں ہے
مثل غبار ہوں میرا ٹھکانہ
بس تیری راہ گزار میں ہے
تو کہیں آس پاس لگتا ہے
خوش بوسی برگ و بہار میں ہے

رانا پرویز احمد...... منچن آباد

غزل

عکس اس کا ابھرتا رہا رات بھر
چاند دل میں اترتا رہا رات بھر
پھول تھے اس کے بستر پہ بکھرے ہوئے
میں کہ پھولوں کو چنتا رہا رات بھر
ایک انسان شبنم میں بھیگا ہوا
راستا اس کا تکتا رہا رات بھر
یاد آیا یہ کس کا معطر بدن
غنچۂ دل مہکتا رہا رات بھر
دھیان اس کا ستاتا رہا پے بہ پے
کروٹیں میں بدلتا رہا رات بھر
خشک پودے کہاں سبز اس سے ہوئے
ابر پھر بھی برستا رہا رات بھر
دیکھ اس کی طرف اے جمالِ حزیں
پی کے آنسو جو ہنستا رہا رات بھر

سمیع جمال...... کراچی

غزل

تیری آس تھی تو ملا نہیں
میری جان تجھ سے گلہ نہیں
تیرے دل میں جو رہا دیر تک
وہ شخص تو اتنا برا نہیں
مجھے بھول مت اے حسنِ ستم
یہ میری وفا کا صلہ نہیں

میرے دل پر تیرا ہی نام ہے
تُو نے آج تک اسے پڑھا نہیں
تیرا سایہ بن کے چلا میں
میرے ساتھ ساتھ تو چلا نہیں
تجھے کس کی آس ہے آج تک
یہی راز مجھ پر کھلا نہیں

محمد ندیم فراز......محمد پور دیوال

گیت

اک پھول ملا ہے تم کو
اک پھول ملا مجھ کو
آؤ ان پھولوں کو دل میں لگالیں!
دیکھوں گا میں اس پل
تم جس گھڑی یاد کروگی
الجھوگی کبھی مجھ سے
کبھی خود سے خاموش رہوگی
اک خواب ملا ہے تم کو
اک خواب ملا ہے مجھ کو
آؤ ان خوابوں کو آنکھوں میں سجالیں!
آنچل میں ہے رخِ زیبا
اس پر تیرے ہونٹوں کا تبسم
پھر ہواؤں کی شرارت پر ہو
پردہ نشیں کا انداز برہم
اک ادا ملی ہے تم کو
اک ادا ملی مجھ کو
آؤ ان اداؤں سے خوشیوں کو چرالیں!
اک پھول ملا ہے تم کو
اک پھول ملا ہے مجھ کو
آؤ ان پھولوں کو دل میں لگالیں!

سید عبداللہ شاہد......حیدر آباد

غزل

اٹھایا تھا جام اک غم بھلانے کے لیے
وہی سینے سے لپٹ گیا مجھے اور ستانے کے لیے
اس سے کہہ دو نہ آیا کرے میری محفل میں
اس کی یاد ہی کافی ہے دل جلانے کے لیے
ساقی آج پلا دو اتنی کہ کچھ خبر نہ رہے
کوئی غم میرے پاس نہ رہے مجھے رلانے کے لیے
دکھ نہیں کہ اب کوئی ساتھ نہیں رہا میرے
اب میخانہ ہی کافی ہے میرا ساتھ نبھانے کے لیے
ساقی یوں مجھے ہر بار بس کرنے کا نہ کہہ
آج سارا میخانہ بھی کم اس کی یاد بجھانے کے لیے

غلام عباس جتوئی......محمد پور

پھر دکھ کیسا

جب تم اپنے ہو
اور ہم اپنے ہیں
پھر دکھ کیسا
جب زمین سے اُگے فسانے
اور دل میں چھپے خزانے
سب ایک ہیں
پھر دکھ کیسا
جو اُس نے لگائے تن پر
اور ہم نے سجائے دل میں
سب زخم ہیں
پھر دکھ کیسا
جب پھولوں کے چہرے پر
اور دل سے بہتے لہو میں
سب رنگ ہیں
پھر دکھ کیسا
جب جھیل سے بہتا پانی
اور آنکھ سے ٹپکا آنسو
سب ایک ہیں
پھر دکھ کیسا

فرحانہ عارف......کراچی

ذوقِ آگہی

عفان احمد

دردناک عذاب

تباہی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو جھوٹا ہو، نافرمان ہو، جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور وہ ان کو سنتا ہے، پھر بھی وہ تکبر کرتا ہوا اپنے کفر پر اس طرح اڑا رہتا ہے کہ جیسے اُس نے ان کو سنا ہی نہیں۔ ایسے شخص کو دردناک عذاب کی خبر سنا دیجیے۔ ہماری آیات میں سے کوئی بات جب اس کے علم میں آتی ہے تو وہ ان کا مذاق بنالیتا ہے یہی لوگ تو ہیں جن کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

(سورۃ الجاثیہ: آیات: ۷تا۹)

فرحین احمد انصاری......کراچی

حق تعالیٰ کی فرماں برداری

اے انسان! رات میں روشن چاند اور دن میں دنیا کو روشن کرنے والا سورج تیرے آرام کے لیے ہے' بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان تمام کے تمام اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں تا کہ تُو روزی حاصل کرسکے اور غفلت سے نہ کھائے۔

اے انسان! اللہ تعالیٰ تیرے لیے خاک سے رنگ، خوش بو اور کھانے کی چیزیں پیدا فرماتا ہے' مکھی سے شہد، کانٹے سے پھول، نافہ سے مشک، کان سے سونا اور خشک لکڑی سے سبز پتے تیرے لیے پیدا کرتا ہے۔

یہ انصاف کی بات نہیں ہے کہ جس خدا نے ساری کائنات کو تیرے نفع کے لیے بنایا تو اس کی فرماں برداری نہ کرے۔

سن! جب آدمی اللہ کے حکم کے مطابق زندگی گزارتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا محافظ اور مددگار ہوجاتا ہے۔ (من کان للہ لہ جو اللہ کا ہوگیا اللہ اس کا ہوجاتا ہے)

مراسلہ: مرزا توصیف بیگ......حیدر آباد

ڈر اور پیار

ممتاز مفتی نے ایک روز اپنے استاد سے کہا ایک بات پوچھوں۔

انہوں نے کہا۔ "پوچھو۔"

مفتی صاحب نے کہا۔ "اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ اس سے ڈرو لیکن مجھے اللہ تعالیٰ سے ڈر نہیں لگتا۔ اس پر پیار آتا ہے۔" ان کے استاد نے کہا۔

"جنہیں ڈر لگتا ہے وہ بھی خوش قسمت ہیں اور جنہیں پیار آتا ہے وہ بھی خوش نصیب ہیں۔ یعنی ڈر بھی ایک تعلق ہے محبت بھی ایک تعلق ہے۔ سارا کھیل ہی تعلق کا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہے تو پھر سب اچھا ہے۔"

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

کوہ قاف

کہا جاتا ہے کہ یہ پہاڑ تبت کے پہاڑوں کے بعد آتا ہے۔ یہ ایشیائے کوچک کے شمال میں آرمینیا کے علاقے میں واقع ہے۔ اس سارے سلسلہ ہائے کوہ کو کوہ قاف کہتے ہیں۔ یہ علاقہ پریوں کی روایتی جنم بھومی ہے۔ عرفِ عام میں بلند اور دشوار گزار سارے پہاڑوں کے لیے بھی کوہ قاف کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔

آرمینیا URARTU کا پرانا نام ہے۔ آج سے تقریباً تین ہزار سال قبل اس کا نام آرودیشیا تھا۔ آرمینیا ملک ترکی کے قریب واقع ہے اور اپنی خوب صورتی کی وجہ سے مثلِ جنت ہے۔

نازسلوش ذشے......میرپور آزاد کشمیر

انمول باتیں

جو شخص مال خرچ کر کے احسان نہیں جتلاتا نہ زبان سے ایسا کلمہ تحقیر ادا کرتا ہے جس سے کسی غریب محتاج کی عزت نفس مجروح ہو۔ اس کا اجر اس کے ربّ کے پاس ہے۔

اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملیں اسے کبھی حقیر مت جانیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے۔

''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین آدمیوں سے کلام نہیں کرے گا۔ ان میں سے ایک احسان جتلانے والا ہے۔''

صدقہ خیرات کر کے احسان جتلانا اہلِ ایمان کا شیوہ نہیں۔ صدقے کی قبولیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ریاکاری سے پاک ہو۔

وسیم اختر......راولپنڈی

کچھ دشمن کے بارے میں ارشادات

☆ بداخلاق انسان ایسے دشمن کے قبضے میں ہے جس کے شر سے کہیں بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

☆ دشمن کی نصیحت قبول کرنا سخت غلطی ہے ہاں اس کو سن لینا درست ہے تاکہ حفاظت کی صورت نکالی جاسکے۔

☆ دشمن جب نقصان پہنچانے کے تمام حیلوں سے عاجز ہو جاتا ہے تو پھر دوستی کی کوشش کر کے دل کی مراد حاصل کر لیتا ہے اس کی چالاکی سے بے خوف نہیں رہنا چاہیے۔

☆ کمزور دشمن سے بھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ زندگی سے مایوس آدمی بھیڑیے کا بھی بھیجا نکال لیتا ہے۔

☆ دشمن ہمیشہ نرمی سے قابو میں نہیں آتا بعض مرتبہ اس کی دشمنی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے ایسے بدماغ کا علاج سختی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

☆ اے عقلمند! ایسے دوست کی دوستی چھوڑ دے جو تیرے بدشمن کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والا ہو۔

☆ دشمن سے اپنی تکلیف کا ذکر ہرگز نہ کر، سامنے لاحول پڑھ کر دل میں خوش ہوگا۔

اگر تجھے کسی سے اذیت کا اندیشہ ہو تو احسان کے تعویذ سے (یعنی اس پر احسان کر کے) اس کی زبان بند کر دے۔

☆ دشمن کو جتنا نقصان پہنچانے کی جتنی قدرت ہو اتنا نقصان مت پہنچا، ممکن ہے یہی دشمن کبھی مخلص فداکار دوست بن جائے اور پھر تجھے شرمندگی اٹھانی پڑے۔

مراسلہ: ماجد علی......ساہیوال

ولادت ہائے مشاہیر ماہ اگست

1901ء تا 1922ء تک

1901ء 14 اگست ممتاز سیاست دان و سابق وزیر اعلیٰ سندھ محمد ایوب کھوڑو۔

1902ء یکم اگست سابق گورنر مغربی پاکستان اختر حسین۔

1902ء 7 اگست پنجابی شاعر و ادیب جوشو افضل دین (جہلم)۔

1902ء 14 اگست سابق وزیر اعظم ریاست حیدرآباد دکن میر لائق علی۔

1905ء 5 اگست سیاسی رہنما پیر علی محمد راشدی (لاڑکانہ)۔

1905ء 5 اگست سیاست دان مخدوم الملک مہر میران شاہ (ضلع رحیم یار خان)۔

1906ء 22 اگست مترجم محقق نقاد غلام علی الانا۔

1908ء 11 اگست تحریک پاکستان کی رہنماء بیگم سلمیٰ تصدق حسین۔

1908ء 14 اگست ممتاز ادیب شاعر صہبا اکبر آبادی۔

1908ء 24 اگست ادیب شاعر لغت نویس نسیم امروہی۔

1910ء یکم اگست جدید شاعری کے بانی ن۔م راشد۔

1910ء 15 اگست معروف ادیب سید وقار عظیم۔

1910ء 27 اگست ممتاز سماجی کارکن مدر ٹریسا۔

1915ء 15 اگست معروف ادیبہ عصمت چغتائی۔

1916ء 3 اگست ممتاز اردو شاعر شکیل بدایونی۔

1917ء 14 اگست نامور صحافی و شاعر شورش کاشمیری۔

1919 12 اگست ممتاز مورخ و صحافی ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔

1919ء 15 اگست قائداعظم کی صاحبزادی دینا جناح۔

1919ء 21 اگست شاعر، نقاد و صحافی ظہیر کاشمیری۔

1919ء 31 اگست معروف ادیبہ و شاعرہ امرتا پریتم۔

1920ء 14 اگست معلم و نقاد ڈاکٹر عبادت بریلوی۔

1922ء 22 اگست نقاد محقق و معلم ڈاکٹر عبد السلام۔

1922ء 28 اگست معروف مصور آزر زوبی۔

ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات

اے داتا! ہم تیرے رزق سے پلے ہیں، تیری مہربانی اور انعام کے عادی ہو گئے ہیں۔ عزت اور ذلت تیرے ہاتھ میں ہیں۔ اے خدا! اپنی عزت کے طفیل ہمیں دنیا اور آخرت میں بھی عزت عطا فرما، ہم پر بخشش فرما۔ اے خدا! ہم اپنے نفس اور شیطان کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں چیونٹی چیتوں کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے اپنی ذات کے طفیل اپنے بے مثل اوصاف کے طفیل ان دشمنوں سے ہمیں پناہ عطا فرما۔

یااللہ! یقین کے چراغ کو ہمارے راستہ میں رکھ دے بُرائی کرنے سے ہمارے ہاتھوں کو تھام لے نہ دیکھنے کی چیز سے ہماری آنکھیں پھیر دے ناپسندیدہ چیز پر ہمیں قابو نہ دے۔ تیرے پاک بندوں کے طفیل ناپاکی سے ہمیں دور رکھ اگر کوئی لغزش ہو جائے تو معاف فرما دے۔

اے خدا! ہم کام میں کوتاہی کرنے والے ہیں، گناہ گار ہیں اور امیدوار بن کر آئے ہیں، اگر غلام نادانی سے سرکشی کرتے ہیں تو مالک معاف کر دیتے ہیں، نیک بختی کے چہرے سے ہماری آنکھیں بند نہ کر، موت کے وقت کلمہ سے ہماری زبان بند نہ کر۔

اے اللہ! یوسف نے یعقوب کی اولاد کو معاف کر دیا (علیہما الصلوٰۃ والسّلام) گناہ کی وجہ سے ان کو قیدی نہیں بنایا، ان کی کھوئی پونجی کو واپس نہیں لوٹایا، تیری مہربانی سے ہم بھی امید کرتے ہیں۔ اے عزیز! اس بے مائیگی کے باوجود ہم کو بخش دے۔

سوائے امید کے اور کوئی سامان نہیں لایا ہوں۔

اے خدا! مجھے اپنی بخشش سے ناامید نہ کرنا۔

وصلّی اللہ تعالیٰ علی خیرِ خلقه سیدنا و مولنا محمد و آلهِ

واصحابه اجمعین و بارک وسلّم تسلیماً کثیراً کثیرا

مراسلہ: محمد حذیفہ پیرزادہ......ناظم آباد، کراچی

خالی دامن

محمد اعظم خان

خواہشیں کس دل میں جنم نہیں لیتیں۔ ہر ذی روح اپنا آج اور کل اچھا اور خوشگوار بنانے کی خواہش اور تمنا رکھتا ہے۔ شاید اسی لئے کسی شاعر نے کہا ہے کہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے

مگر زمانے میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خواہشوں کے غلام بن کر خود غرضی کے اسیر بن جاتے ہیں۔ جب خواہشیں خود غرضی میں تبدیل ہوجاتی ہیں تو انسان انسانیت کے رتبے سے گر کر حیوان بن جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر بندھی خواہوں کی پٹی کے باعث نہ تو اپنی تمناؤں کے آگے دیکھتے ہیں نہ سمجھنے۔ بس وہ اپنی خوشی چاہتا ہے اور ہر قیمت و ہر طریقے سے......

ایک خواہشوں کے غلام کا قصہ اس کی پیاس صرف ایک بوند تھی مگر وہ پورا دریا پی جانا چاہتا تھا

کرم دین کو موکلوں کے ذریعے کئی مواقع پر مختلف اشیاء منگواتے ہوئے دیکھ کر مبارک کے دل میں بھی اس خواہش نے انگڑائی لی تھی ”کاش اس کے قبضے میں بھی کوئی جن ہوتا، جس سے وہ بھی جو چاہتا آرام سے گھر بیٹھے منگوا لیا کرتا اور اس کے دوسرے کام بھی چٹکیوں میں ہوجایا کرتے۔“ مگر وہ چاہتے ہوئے بھی کبھی کرم دین سے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کر پایا تھا لیکن آج قدرت نے اسے خود یہ موقع فراہم کیا تھا، جسے وہ ٹھکرا آیا تھا۔

مبارک چارپائی پر لیٹا مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے بار بار پہلو بدل رہا تھا، اس سے فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ اس نے کرم دین کی آفر قبول نہ کرکے صحیح کیا تھا یا غلط، اس کا دل اس حق میں تھا کہ کرم دین سے عملیات سیکھ لیے جائیں مگر دماغ اس بات سے ڈرا رہا تھا کہ اس معاملے میں کئی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے، رات بھر دل اور دماغ کی جنگ جاری رہی۔ کبھی دل کا پلڑا بھاری ہوجاتا اور کبھی دماغ دل پر غالب آجاتا، اسی کشمکش میں رات بیت گئی مگر کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔

رات بھر جاگتے رہنے کے بعد صبح کے وقت بمشکل مبارک کی آنکھ لگی تھی مگر وہ زیادہ دیر سو نہ سکا اور اس کی ماں نے اسے کام پر جانے کے لیے جگا دیا، چھٹی کا دن ہوتا تو وہ کسی بھی قیمت پر چارپائی چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوتا مگر اسے کام پر جانا تھا اس لیے مجبوراً اٹھنا پڑا، کیونکہ اگر وہ نہ جاتا تو اس کی ایک دن کی تنخواہ کٹ جاتی، اسے پڑھنے لکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا، اسی لیے انٹر میں بار بار فیل ہونے کے بعد اس کے والدین نے مجبوراً اسے قریب ہی فرنیچر بنانے والی فیکٹری میں کام پر لگوا دیا تھا۔

ماں کے اٹھانے پر وہ بمشکل اٹھا اور ناشتے کے بعد سائیکل پر فیکٹری کے لیے گھر سے نکل پڑا، فیکٹری پہنچ کر وہ روز کی طرح اس مشین پر جا کھڑا ہوا تھا جہاں بطور ہیلپر اس کی ڈیوٹی تھی، وہ جسمانی طور پر مشین کے پاس کھڑا کام کر رہا تھا مگر اس کا ذہن کرم دین کی باتوں میں الجھا ہوا تھا، جس کی وجہ سے وہ کام پر پوری توجہ نہیں دے پا رہا تھا، ایسا بہت کم ہوا تھا کہ اسے کبھی کسی کام کی وجہ سے ڈانٹ پڑی ہو لیکن اس روز وہ ایک ہی دن میں کئی بار اپنے انچارج کی جھاڑیں سن چکا تھا، یہی وہ لمحے تھے جب اس نے کرم دین سے عملیات سیکھنے کا ارادہ کر لیا جن کی مدد سے وہ جنات کو اپنے قابو میں کرکے ان کے ذریعے جو کام چاہتا کروا سکتا تھا، وہ

سوچنے لگا کہ اس طرح محنت مزدوری سے بھی جان چھوٹ جائے گی اور باآسانی جتنی چاہے دولت بھی سمیٹ لے گا، اس خیال کے آتے ہی وہ بے صبری سے شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

کرم دین، مبارک کی طرف سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا تھا، اس کا خیال تھا کہ وہ تھوڑی سی کوشش اور کرے گا تو اسے قائل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا، پھر بھی اس کے دل میں اس خوف نے جگہ بنا لی تھی کہ اگر وہ کسی بھی طرح تیار نہ ہوا تو کیا ہوگا، وہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ ایسے میں اسے کیا کرنا چاہیے، دن اسی سوچ میں گزر گیا مگر مبارک نہ آیا، رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا، امید، مایوسی میں بدل رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی، کرم دین نے بے دلی سے دروازہ کھولا تھا، مگر مسکرائے بغیر رہ نہ سکا کیونکہ وہاں اس کے سامنے مبارک کھڑا تھا، کرم دین یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس لیے وہاں آیا تھا مگر اس کے باوجود اسے دیکھ کر کرم دین کے بیمار جسم میں نئی طاقت آگئی تھی۔

مبارک کو کمرے میں بٹھا کر کرم دین وہ تمام پھل پلیٹوں میں ڈال کر لے آیا جو پچھلے روز بچ گئے تھے، کرم دین جلدی سے جان لینا چاہتا تھا کہ اس نے عملیات کے متعلق اس کی تجویز کے بارے میں کیا سوچا ہے مگر وہ چاہتا تھا کہ اس بارے میں بات کا آغاز وہ خود کرے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

”تم نے بہت اچھا کیا جو آگئے۔ ورنہ میں بھی گھر میں اکیلا بیٹھا بور ہوتا رہتا ہوں۔ اب تم آگئے ہو تو کم از کم کچھ وقت تو اچھا گزرے گا۔“ کرم دین نے بات کا آغاز کیا۔

”اصل میں آج سارا دن میں تمہاری بات پر غور کرتا رہا۔“

”میری۔ کون سی بات؟“ کرم دین نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

”وہی جو کل تم۔ جنات کے بارے میں ذکر کر رہے تھے۔“

”مگر وہ بات تو کل ہی ختم ہوگئی تھی۔“ مبارک کی بات سن کر کرم دین کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے مگر اس نے اپنے دل کی کیفیت چھپاتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں نے کہا تو ایسا ہی تھا۔ مگر بعد میں سوچا کہ تمہاری بات ماننے میں کوئی حرج نہیں۔ اصل میں دل تو چاہتا ہے لیکن ڈر بھی لگتا ہے۔“

”اگر ڈرو گے۔ تو کچھ بھی نہیں کر پاؤ گے۔ پہلے اپنے اندر کے سارے خوف، سارے ڈر ختم کرو پھر اس کام کا آغاز کرو۔ اور ویسے بھی جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو تمہیں فکر کی کیا ضرورت ہے۔“

”پھر بھی ڈر تو لگتا ہے ناں۔“

”تم ایک دو دن اچھی طرح سوچ لو۔ بس اتنا یاد رکھنا۔ اگر اپنے دل سے ڈر نکال دو گے تو عیش کرو گے ورنہ ساری زندگی مر مر کے گزرے گی......“ کرم دین نے ایک اور تیر پھینکا۔

بات سن کر مبارک سوچ میں پڑ گیا تھا، کرم دین نے بھی جان بوجھ کر مزید کوئی بات نہ کی اور اسے اچھی طرح سوچنے کا موقع دیا۔

”مجھے کرنا کیا ہوگا؟“ مبارک نے کچھ دیر سوچنے کے بعد دریافت کیا۔

”لگتا ہے اب تم اس کام کے لیے پوری طرح تیار ہو۔“

”جب کسی کام کے لیے ارادہ کر ہی لیا تو پھر اتنا کیا سوچنا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تم بس یہ بتا دو کہ اس کام کی ابتدا کب سے کی جائے۔“

”نیک کام میں دیر تو نہیں ہونی چاہیے، لیکن پھر بھی ہمیں چاند کی پہلی جمعرات تک انتظار کرنا ہوگا تاکہ جیسے جیسے چاند روشن ہوتا جائے وظیفہ پڑھنے میں آسانی رہے اور پھر اگلے ماہ چاند کی چودھویں تاریخ تک یہ کام مکمل بھی ہوجائے۔ ابھی تمہارے پاس دو دن ہیں، تم اپنی تیاری کر لو، میں تمہیں تمام تفصیلات بتا

دیتا ہوں۔" کرم دین نے بات کی اور پھر مبارک کو دیگر معلومات فراہم کرنے لگا۔

☆☆☆

کرم دین سے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد مبارک چپ چاپ اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا تھا، وظیفہ دائرے میں بیٹھ کر پڑھا جانا تھا اور کرم دین کے کہنے کے مطابق جس دائرے میں بیٹھ کر وظیفہ پڑھا جانا تھا اس میں کوئی بھی دوسری مخلوق کسی بھی صورت میں داخل نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے کسی پریشانی کی ضرورت نہیں تھی۔ مبارک نے خود کو اس عمل کے لیے پوری طرح تیار کر لیا تھا مگر گھر والوں کو بتائے بغیر کئی روز تک راتوں کو گھر سے غائب رہنا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔

مبارک کو علم تھا کہ اس کا باپ کسی بھی صورت اس کام کے لیے راضی نہیں ہوگا، تاہم اسے اس بات کا یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی ماں کو اس مقصد کے لیے ضرور منا لے گا۔

"اماں! ایک بات کروں؟" موقعہ ملتے ہی مبارک نے بات شروع کی۔

"لگتا ہے کوئی خاص بات ہے، جس کے لیے تم باقاعدہ اجازت لے رہے ہو۔"

"بات تو بڑی خاص ہے لیکن پہلے یہ وعدہ کرو کہ تم یہ بات ابا سے نہیں کرو گی۔"

"بات سنے بغیر میں یہ وعدہ کیسے کر سکتی ہوں؟"

"اماں بات جو بھی ہے بس ابا کو نہیں بتانی۔"

"اچھا نہیں بتاؤں گی۔"

"وعدہ؟"

"ہاں بابا کہہ تو دیا نہیں بتاؤں گی اب کیا لکھ کر دوں؟"

"میں جن قبضے میں کرنے کے لیے کرم دین سے وظیفہ سیکھنے لگا ہوں۔" مبارک نے ماں کو رازداری سے بتایا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟" ماں نے بیٹے کو ڈانٹا۔

"اماں ذرا سوچو تو سہی۔ چند وظیفے پڑھ لینے سے اگر جن قبضے میں آ جائے تو بھلا اور کیا چاہیئے۔"

"کیوں مرنے والے کام کرتے ہو؟"

"اماں فکر کی کوئی بات نہیں، کرم دین میرے ساتھ ہے۔"

"کرم دین کا نام سن کر تو ساری بستی کے لوگ تھو تھو کرتے پھرتے ہیں اور تم اسی سے تعلق جوڑنے کی باتیں کر رہے ہو۔"

"اماں ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ تم ذرا سوچو تو سہی جب لاکھوں روپے یوں چٹکیوں میں ہمیں جن لا کر دے گا تو ہم کتنے امیر ہو جائیں گے۔" مبارک نے چٹکی بجاتے ہوئے ماں کو سمجھایا تو لاکھوں کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی پھر بھی اپنی تسلی کے لیے بولی۔ "لاکھوں روپے ہمیں جن لا دے گا؟"

"ہاں اماں ہاں۔ بس تم میرا ساتھ دو اور میرے آنے پر رات کو چپکے سے دروازہ کھول دیا کرنا۔ ویسے بھی تھوڑے دنوں کی تو بات ہے۔ ایک بار جن میرے قبضے میں آ جائے، پھر دیکھنا میں اس سے کیا کیا کام لیتا ہوں۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔" اماں نے بات کی پھر اپنا منہ اس کے کان کے قریب لاتے ہوئے آہستہ سے بولی "بس اب اس بات کا خیال رکھنا، اپنے ابا کو اس بارے میں خبر نہ ہونے دینا، وہ کبھی بھی اس کام کے لیے راضی نہیں ہوگا۔"

ماں کو منانے کا کام با آسانی ہو گیا تھا، اب اسے دو دن بعد آنے والی چاند کی پہلی جمعرات کا انتظار تھا، جن کو قابو کرنے کے لیے جو وظیفہ پڑھا جانا تھا، اس کا آغاز عشاء کی نماز کے بعد ہونا تھا، جمعرات کو سارا دن مبارک اندھیرا پھیلنے کا انتظار کرتا رہا تاکہ وہ کرم دین سے مزید معلومات حاصل کر کے چلہ کاٹنا شروع کر دے۔

کرم دین سے ضروری ہدایات لینے کے بعد مبارک مسجد میں گیا اور عشاء کی نماز ادا کی، اس نے اپنی تسلی کے لیے دن میں ہی اس جگہ کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا، جہاں بیٹھ کر اسے چلہ کاٹنا تھا، نماز کے بعد اس نے سیدھا وہیں کا رخ کیا تھا وہ انتہائی ڈرپوک تھا مگر چلے کے بعد ملنے والی دولت اور عیاشیوں کا سوچ کر اس کے سارے ڈر ختم ہو گئے تھے۔

مقررہ جگہ پر پہنچ کر سب سے پہلے اس نے انتہائی احتیاط سے ادھر ادھر کا جائزہ لیا پھر کرم دین کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گول دائرہ لگا کر اس کے اندر جائے نماز بچھائی اور اس پر بیٹھ گیا، مبارک کے لیے یہ انتہائی مشکل مرحلہ تھا، گو کہ کرم دین کے کہنے کے مطابق دائرے میں بیٹھ کر کسی بھی چیز سے نقصان پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر اس کے باوجود اسے خوف محسوس ہو رہا تھا، وہ اپنے اندر کے اس خوف پر قابو پانے کے لیے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا، اس عمل نے اس کا اعتماد بحال کرنے میں بھرپور مدد دی تھی، پھر اس نے خدا کو یاد کیا اور وظیفہ پڑھنے کا آغاز کر دیا، جیسے جیسے وہ کرم دین کی بتائی ہوئی آیات کا ورد کرتا گیا اس کا اعتماد بحال ہوتا چلا گیا۔

پچھلی رات خیریت سے گزری تھی جس کی وجہ سے مبارک قدرے پرسکون تھا، اس نے ایک بار پھر دائرہ کھینچا اور اس کے اندر بیٹھا کرم دین کے بتائے ہوئے الفاظ پڑھ کر تسبیح کے دانے گرانے لگا۔

پھر ایک ایک کر کے دن گزرنے لگے، یوں دس دن گزر چکے تھے، وہ پہلے روز کی طرح ہر روز عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد مقررہ جگہ پر جا بیٹھتا اور وہیں دائرے میں بیٹھا تسبیح کرتا رہتا، تسبیح کی مقررہ تعداد پوری کرنے میں اسے تین سے چار گھنٹے لگتے تھے، پھر جیسے ہی وہ اس عمل سے فارغ ہوتا گھر لوٹ آتا، جہاں فاطمہ اس کی راہ دیکھ رہی ہوتی، عیش و آرام اور دولت کے حصول کی خاطر فاطمہ نے اکلوتے بیٹے کو چلہ کاٹنے کی اجازت تو دے ڈالی تھی مگر جب تک وہ واپس گھر نہ پہنچ جاتا اس کی جان سولی پر لٹکی رہتی، اس کے واپس

آنے تک فاطمہ کے دل سے مبارک کے بخیریت گھر لوٹ آنے کے لیے دعائیں نکلتی رہتی تھیں، ایسے میں اس کی آنکھ کس طرح لگ سکتی تھی، جب مبارک بخیریت گھر پہنچ کر اپنی چارپائی پر لیٹ جاتا، تب کہیں اسے سکون کی نیند آتی۔

مبارک کو چالیس دن کا چلہ کاٹنا تھا، ایک حصہ خیریت سے گزر چکا تھا جبکہ ابھی تین حصے باقی تھے، وہ روز کی طرح دائرے میں بیٹھا تسبیح کر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں مکھیوں کے بھنبھنانے کی ہلکی ہلکی سی آواز پڑی، مگر مبارک نے اسے اپنا وہم جان کر کوئی توجہ نہ دی پھر، آہستہ آہستہ یہ آواز تیز ہونے لگی، مکھیوں کے بھنبھنانے کی آواز نے مبارک کو ہلکا سا پریشان ضرور کیا تھا مگر اس نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی اور اپنی تسبیح میں لگا رہا تھا، کچھ دیر تک یہ آوازیں اس کے کانوں میں پڑتی رہیں پھر آہستہ آہستہ ختم ہو گئیں، اس نے بلاخوف اس دن کا وظیفہ مکمل کیا اور گھر واپس آ گیا۔

گو کہ مکھیوں کے بھنبھنانے کی آوازوں نے اسے کوئی زیادہ پریشان نہیں کیا تھا مگر ان آوازوں کے متعلق کرم دین سے بات کرنا بہت ضروری تھا، اس لیے اگلے روز مبارک نے کرم دین کو رات کو آنے والی آوازوں کے بارے میں بتا دیا۔

"بس اتنی سی بات سے ڈر گئے؟" مبارک کی بات سن کر کرم دین نے دریافت کیا۔

"میں ڈرنے والا نہیں۔ اور نہ ہی رات کو کانوں میں پڑنے والی مکھیوں کی آوازوں سے مجھے کوئی ڈر ہی محسوس ہوا تھا۔ میں تو بس تمہیں بتا رہا تھا کہ رات کو چلے کے دوران مجھے کچھ اس طرح کی آوازیں آتی رہیں۔" مبارک نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کی۔

"اب یہ ذہن میں رکھنا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جائیں گے تمہیں ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کے لیے بہت کچھ ہو گا، تا کہ تم اس کام سے باز آ جاؤ لیکن تم یہ بات یاد رکھنا۔ جب تک تم اس دائرے میں بیٹھے رہو گے، تمہیں کسی قسم کا کوئی بھی نقصان نہیں ہو گا۔"

"میں جانتا ہوں اور مجھے پورا یقین ہے کہ میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گا۔"

"بس یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو، جب تک تم کسی خوف کو اپنے دل میں جگہ کرنے نہیں دو گے، تب تک سب اچھا ہے۔ ورنہ۔ تم خود سمجھ دار ہو۔" کرم دین نے مبارک کو مزید سمجھایا۔

اگر چہ اس طرح کی باتیں پہلے سے مبارک کے علم میں تھیں پھر بھی کرم دین کے منہ سے وہی باتیں دوبارہ سن کر اس نے خود کو اور بھی مضبوط کر لیا تھا اور کسی بھی خطرے سے نہ ڈرنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

......☆☆☆......

کرم دین کی باتوں نے مبارک کو نیا حوصلہ دیا تھا، اس نے اپنے دل میں یہ بات اچھی طرح بٹھا لی تھی کہ جب تک وہ دائرے میں رہے گا، کوئی بھی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی، وہ روز کی طرح دائرہ کھینچ کر بیٹھ گیا اور چلہ کاٹنے لگا، ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پچھلی رات کی طرح مکھیوں کی بھنبھناہٹ اس کے کانوں میں پڑنے لگی، جو کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی مگر اب مبارک کو ان آوازوں کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہ تھی اور اس کی تمام تر توجہ تسبیح کے دانے گرانے پر تھی۔

دانے پہ دانہ گر رہا تھا، بظاہر وہ پر سکون تھا مگر تیز ہوتی ہوئی مکھیوں کی بھنبھناہٹ نما آوازیں آہستہ آہستہ قریب ہوتی جا رہی تھیں، پھر اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جسے وہ بھنبھناہٹ سمجھ رہا تھا، وہ دراصل بہت سے لوگوں کی آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں تھیں، یہ محسوس ہونا تھا کہ مبارک کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

تسبیح کے دانے اب بھی گر رہے تھے مگر ان کے گرنے کی رفتار کم ہوتی جا رہی تھی، اس کے کان مسلسل اسی طرف لگے ہوئے تھے، اب وہ آوازیں مزید واضح ہونے لگی تھیں اور ایسا محسوس ہونے لگا تھا، جیسے بہت

سے لوگ دائرے کے ارد گرد کھڑے آپس میں باتیں کر رہے ہوں، آوازیں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں مگر وہاں کوئی کھڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا، کئی لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے اس لیے کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

گیارہ دن گزر چکے تھے اب تک مبارک کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، کرم دین نے اس بات کی تسلی کروا دی تھی کہ دائرے میں بیٹھے ہوئے اسے کوئی بھی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی، اس لیے اسے کچھ حد تک تسلی تھی مگر کانوں میں پڑنے والی آوازیں اسے پریشان کر رہی تھیں، تسبیح کے دانے گرنا بند ہو گئے تھے اور اس کی آنکھیں تیزی سے ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھیں، کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی پھر آہستہ آہستہ وہ آوازیں دور ہوتے ہوتے ختم ہو گئیں، آوازوں کے ختم ہونے پر مبارک نے سکھ کا سانس لیا اور جلدی سے اس روز کا وظیفہ مکمل کر کے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر جا پہنچا۔

مبارک جان چکا تھا کہ اب دن بدن اس کے لیے مشکلات بڑھتی جائیں گی، کوئی اور کام ہوتا تو وہ فوراً سے پہلے اس کام سے توبہ کر لیتا، مگر اس کام سے اسے عیش و آرام کی زندگی ملنے والی تھی اس لیے وہ تمام خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا، یوں بھی اس کا چلہ ختم ہونے میں کچھ ہی دن باقی تھے، اب اسے اپنا مشن مکمل کرنے کے لیے اپنی آنکھیں اور دماغ کھلا رکھنا تھا۔

......☆☆☆......

پچھلی کئی راتوں سے اس کا معمول تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد سیدھا مقررہ جگہ پر جانا اور وہاں دائرہ کھینچ کر اس میں بیٹھ کر بے دھڑک چلہ کاٹنے میں لگ جانا، آج بھی وہی وقت تھا، وہی جگہ تھی جہاں بیٹھ کر وہی کلمات پڑھنے تھے جو وہ ہر روز پڑھا کرتا تھا لیکن آج کہیں نہ کہیں انجانے خوف نے اس کے دل میں جگہ بنا لی تھی، اس نے خود کو حوصلہ دیا اور دل مضبوط کر کے دائرے میں بیٹھ گیا۔

"یہ آج پھر آ گیا؟" ایک آواز مبارک کے کانوں سے ٹکرائی۔

"اس کا کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ یہ باز نہیں آئے گا۔" ایک اور آواز مبارک کے کانوں میں پڑی، پھر بہت سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"اسے جنگلی جانوروں کے حوالے کر دیتے ہیں وہ خود ہی اس کا کام تمام کر دیں گے۔"

"جنگلی جانوروں کو رہنے دو۔ اس کے لیے شکاری کتے ہی کافی ہیں۔"

"میرے خیال میں تو یہ میرا ایک تھپڑ بھی برداشت نہیں کر پائے گا۔ اس کی گردن ٹوٹ جائے گی اور چہرہ دوسری طرف مڑ جائے گا۔"

آوازیں اس قدر خوفناک تھیں کہ اسے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اس نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اور آنکھیں بند کر لیں، وہ تسبیح کرنا بھول گیا تھا اور زبان سے کلمات جاری تھے۔ "یا اللہ معاف کر دے۔ یا اللہ معاف کر دے۔ یا اللہ معاف کر دے۔"

کچھ دیر اسی کیفیت میں گزر گئی، کچھ دیر بعد جب اسے محسوس ہوا کہ خطرہ ٹل چکا ہے تو اس نے اپنے کانوں سے ہاتھ اٹھا لیے، اس کا خیال درست ثابت ہوا تھا، اب کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، کانوں سے ہاتھ اٹھانے سے اس بات کی تسلی ہو گئی تھی کہ اب کوئی آواز اس کے کانوں میں نہیں پڑ رہی تھی مگر اس کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں، اس نے اپنی ایک آنکھ تھوڑی سی کھول کر دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی، وہاں دائرے کے آس پاس نہ ہی کوئی موجود تھا اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی آواز ہی آ رہی تھی۔

مبارک نے چاروں طرف گردن گھما کر ارد گرد کا جائزہ لیا اور جب اسے اس بات کا اچھی طرح یقین ہو گیا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تو اس نے سکھ کا سانس لیا اور گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، مگر اچانک

اسے خیال آیا کہ اس نے ابھی تک اس روز کا وظیفہ تو پڑھا ہی نہیں، وہ فوراً سے پہلے گھر جانا چاہتا تھا مگر یہ خیال آتے ہی وہ پھر سے مصلٰی بچھا کر وہیں بیٹھ گیا اور تسبیح کے دانے گرانے لگا۔

اس روز اسے وظیفہ مکمل کرنے میں پچھلے دنوں کی نسبت زیادہ وقت لگا تھا، کیونکہ وظیفے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اردگرد بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا، خدا خدا کر کے اس کا وظیفہ پورا ہوا اور اس نے گھر کی راہ لی، گھر جاتے ہوئے بھی وہ دہشت زدہ تھا اور بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے چل رہا تھا۔

وہ چارپائی پر آکر لیٹ گیا تھا مگر اس کے اندر کا خوف ابھی بھی اسے گھیرے ہوئے تھا، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آوازیں آنا تو بند ہو گئی تھیں مگر ان کی گونج ابھی تک اس کے کانوں میں باقی تھی، وہ بار بار کروٹیں بدلنے لگا تاکہ کسی طرح آوازوں کی گونج سے پیچھا چھوٹ جائے لیکن ایسا ہو نہیں پا رہا تھا، عجیب سی بے چینی تھی جس نے اسے جکڑ رکھا تھا، پھر اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی چلی گئیں اور وہ سو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو وہ قدرے پرسکون تھا، چارپائی چھوڑنے کے بعد وہ اپنے کاموں میں لگ گیا تھا مگر دن بھر اٹھتے بیٹھتے اس کے اندر جوڑ توڑ ہوتی رہی، وہ اس قدر خوف زدہ تھا کہ اسے دوبارہ اس جگہ جا کر چلہ کاٹنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ جس مقصد کے لیے اس نے اس قدر محنت کی اور راتوں کو جاگا اسے ادھورا چھوڑ دینا عقل مندی نہیں تھی، ان سب سے بڑھ کر اس کے لیے یہ بات زیادہ تکلیف دہ تھی کہ جن خوشیوں کو پانے کے لیے اس نے بہت سی راتوں کی نیند قربان کی تھی، اس کام کو ادھورا کیسے چھوڑ دیا جائے۔

مال و دولت اور عیش و آرام کی زندگی پانے کا خیال اسے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا، وہ انتہائی دہشت زدہ تھا مگر اس کے باوجود اس نے اپنی تمام ہمتیں جمع کیں اور مقررہ جگہ پر دائرے میں بیٹھا تسبیح گھمانے لگا۔

”آج نہیں بچے گا یہ۔ آج تو اس کا کام تمام کرنا ہی پڑے گا۔“ مبارک کے کانوں میں ایک عجیب سی آواز پڑی اور وہ بری طرح کانپنے لگا۔

عجیب و غریب شکلوں والے بہت سے لوگوں کو دائرے کے اردگرد ڈیرا ڈالے کھڑے دیکھ کر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی، تسبیح اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی، دائرے کے اردگرد کھڑی مخلوق اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔

اب تک مبارک صرف آوازیں ہی سنتا آیا تھا مگر آج ان لوگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا، وہ اپنی آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا تاکہ اسے ان کی شکلیں دکھائی نہ دیں مگر اسے ڈر تھا کہ جیسے ہی وہ آنکھیں بند کرے گا، وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے، پھر کچھ دیر بعد ان میں کھسر پھسر ہونے لگی، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کے آنے کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔

اس کی سوچ صحیح ثابت ہوئی تھی، کسی کے آنے کے لیے راستہ بنا دیا گیا تھا، اب وہ سب ایک طرف کو ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے، ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ سب اس کی بے بسی کا تماشہ دیکھنے آئے ہوں۔

چاندنی کی روشنی میں اس نے دور سے کچھ ہیولے اپنی طرف بڑھتے ہوئے محسوس کیے، جو تیزی سے اس کے قریب ہوتے جا رہے تھے، اب وہ دائرے کے پاس کھڑی مخلوق کو بھول کر اسی طرف دیکھ رہا تھا، پھر جیسے ہی کچھ شکلیں واضح ہونے لگیں تو یہ دیکھ کر اس کے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی کہ کچھ شیر اور چیتے تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے، اندھیرے میں ان کی خوفناک آنکھیں چمک رہی تھیں، اب وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے، شیر اور چیتوں کی شکل میں اسے اپنی موت دکھائی دینے لگی تھی، اس کے جسم میں اتنی بھی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو پاتا، اس کے دماغ نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان حالات میں کیا کرے، اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا ان سب شیر اور چیتوں نے ایک ساتھ اس پر چھلانگ لگا دی۔

اس لمحے اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ دائرے میں بیٹھا ہے اور کرم دین نے اسے یقین دلایا تھا کہ دائرے میں بیٹھے ہوئے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، بس اسے یہی دکھائی دے رہا تھا کہ شیر اور چیتے اس پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اسے چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے، اسے یقین تھا کہ وہ ان سے بچ نہیں پائے گا پھر بھی اس نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنی تمام قوتیں یکجا کیں اور دوڑ لگا دی، اس وقت اس کے پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا مگر وہ ننگے پاؤں ہی دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

وہ دوڑ رہا تھا کہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا، گرنے سے اس کی ٹانگوں اور سینے پر چوٹیں آئی تھیں مگر جان بچانا زیادہ ضروری تھا، اس لیے اس نے چوٹوں کی کوئی پرواہ نہیں کی اور پھر سے پوری قوت سے دوڑ لگا دی۔

وہ گرتا پڑتا گھر پہنچ گیا تھا، اس کی سانس بری طرح اکھڑی ہوئی تھی، گرنے سے جو چوٹیں آئی تھیں ان سے خون بہہ رہا تھا، پاؤں میں جوتے نہ ہونے کی وجہ سے پاؤں بھی بری طرح زخمی ہو گئے تھے، ماں نے بیٹے کے اندر آنے پر روز کی طرح دروازے کی کنڈی لگا دی تھی۔

”اماں مجھے بچا لو...... اماں وہ مجھے مار ڈالیں گے...... مجھے بچا لو“ مبارک نے ماں کے پیچھے چھپتے ہوئے کہا۔

”کیا ہو گیا مبارک۔ کون مار ڈالے گا تمہیں؟“ ماں نے بیٹے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”اماں ...... وہ...... وہ...... وہ دیکھو۔ وہ دیکھو وہ آ رہے ہیں۔ مجھے ان سے بچا لو۔“ مبارک یہ کہتے ہوئے بے ہوش ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ فرش پر گر پڑتا، فاطمہ نے اسے سنبھال لیا، بیٹے کی حالت دیکھ کر ماں کی تجربہ کار نگاہیں جان گئی تھیں کہ یقیناً وہ ڈر گیا ہے، اس نے مبارک کو چارپائی پر لٹا دیا اور خود پاس ہی بیٹھ گئی، صحن میں اندھیرے کی وجہ سے وہ مبارک کی حالت دیکھ نہیں پائی تھی، کمرے میں بلب کی روشنی میں اس کی نظر مبارک پر پڑی تو وہ دیکھ کر تڑپ گئی، کیونکہ بار بار ٹھوکر کھا کر گرنے سے اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ مٹی لگی ہوئی تھی۔

فاطمہ، مبارک کو ہوش میں لانے کے لیے اس کے گال تھپتھپانے لگی مگر اسے کچھ ہوش نہیں تھا، اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں ان کی آوازیں سن کر ساتھ والے کمرے میں لیٹا مبارک کا باپ نہ جاگ جائے، اس لیے وہ آہستہ آہستہ مبارک کا نام لے کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

مبارک بے ہوش پڑا تھا، پاس بیٹھی فاطمہ اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے جسم اور کپڑوں پر لگنے والی مٹی صاف کر رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، یہ سوچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے کہ اس نے محض دنیاوی مال و دولت کے لالچ میں اپنے اکلوتے بیٹے کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا، اس وقت مبارک کی جو حالت تھی، وہ خود اس کی ذمہ دار تھی، ماں کی آنکھوں سے آنسو نکل کر بیٹے کے چہرے پر پڑے تو اسے کچھ ہوش آ گیا، ہوش میں آتے ہی وہ اس قدر پھرتی سے اٹھ کر فاطمہ کے پیچھے ہو گیا کہ اگر اس نے ذرا سی بھی دیر کر دی تو کوئی اسے پکڑ لے گا۔

”وہ آ گئے اماں۔ وہ آ گئے...... مجھے بچا لو...... مجھے بچا لو...... اماں وہ مجھے مار ڈالیں گے۔“ مبارک نے ہوش میں آتے ہی ماں کے پیچھے چھپتے ہوئے کہا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔

......☆☆☆......

کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو چھپائے بھی نہیں چھپتیں، مبارک نے اپنے چلہ کاٹنے والی بات انتہائی راز میں رکھی تھی مگر اس کے باوجود یہ بات بہت سے کانوں میں پڑ گئی تھی، اس کی حالت دیکھ کر

لوگ جان گئے تھے کہ ہونہ ہو یہ سب اسی چلے کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔

مبارک کی طرف سے مایوسی ہوئی تو ایک بار پھر کرم دین اس سوچ میں پڑ گیا کہ وہ جس بوجھ کو اٹھائے پھرتا ہے وہ اب کس کے سر پر ڈالے، مبارک نے جس طرح ہمت سے اتنے دن گزار لیے تھے باقی کے چند دن بھی حوصلے سے کام لیتے ہوئے گزار لیتا تو کرم دین بھی سکون میں آجاتا، مگر اس کے چلہ چھوڑ کر بھاگنے سے کرم دین وہیں کا وہیں آکھڑا ہوا تھا جہاں وہ ایک ماہ قبل تھا۔

رات کافی گزر چکی تھی، کرم دین اپنی سوچوں میں گم چارپائی پر تنہا لیٹا تھا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دے رہا ہو، دستک کی آواز کرم دین کے کانوں میں پڑی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ اب تو کوئی بھولے سے دن میں بھی اس کے دروازے پر دستک نہیں دیتا، اتنی رات کو اس کے ہاں کون آسکتا تھا، اس لیے اس نے اپنا وہم سمجھ کر کوئی توجہ نہ دی مگر اگلے ہی لمحے دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ آواز سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اپنی ایک انگلی سے دروازے پر اس احتیاط سے دستک دے رہا ہو کہ کوئی دوسرا اس آواز کو نہ سن سکے۔

کرم دین سوچنے لگا کہ دروازے پر گھنٹی بھی لگی ہوئی ہے، آنے والا با آسانی گھنٹی بجا سکتا تھا مگر وہ گھنٹی بجانے کے بجائے دستک کیوں دے رہا تھا، رات گئے دروازے پر ہونے والی دستک نے کرم دین کو الجھا کر رکھ دیا تھا، اس نے چارپائی چھوڑی اور آنے والے کے متعلق سوچتا ہوا دروازے پر جا پہنچا، دن کا وقت ہوتا تو وہ بغیر تصدیق کیے دروازہ کھول دیتا لیکن اس وقت تسلی کیے بغیر دروازہ کھولنا مناسب نہیں تھا۔

''کون ہے؟'' کرم دین نے دروازے پر پہنچ کر دریافت کیا۔

''میں ہوں۔ کرم دین دروازہ کھولو۔'' کرم دین کے پوچھنے پر آنے والے شخص نے آہستہ سے جواب دیا۔

''مگر تم ہو کون؟ اپنا نام تو بتاؤ......'' کرم دین نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

''میں صابر ہوں...... دروازہ تو کھولو......''

صابر کا نام سن کر کرم دین نے دروازہ کھولا تو وہاں چادر میں لپیٹا صابر کھڑا تھا۔

''تم؟ اس وقت یہاں خیر تو ہے؟'' صابر کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر کرم دین نے حیران ہو کر سوال کیا۔

''ہاں ہاں سب خیر ہے تم مجھے اندر تو آنے دو۔ یہاں کھڑے کھڑے تو کوئی بات نہیں ہوسکتی۔''

''کیوں نہیں...... کیوں نہیں...... آجاؤ اندر آجاؤ۔'' کرم دین نے صابر کے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

اجازت ملتے ہی صابر اندر آگیا تھا، کرم دین نے احتیاط سے کنڈی لگادی اور اسے ساتھ لیے اسی کمرے میں آگیا جہاں وہ کچھ دیر قبل لیٹا ہوا تھا، آمنے سامنے دو چارپائیاں بچھی تھیں ایک چارپائی پر کرم دین بیٹھ گیا اور دوسری پر صابر، رات گئے صابر کے اچانک آنے پر کرم دین کے ذہن میں بہت سے سوال اٹھ رہے تھے، ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ بات کا آغاز کہاں سے کرے کہ صابر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''تم یقیناً پریشان ہو رہے ہوگے کہ اس وقت آدھی رات کو میں یہاں کس لیے آیا ہوں۔''

''پریشانی کی بات تو ہے، کیونکہ اگر تمہیں مجھ سے کوئی کام تھا تو تم دن کے وقت بھی آسکتے تھے۔''

''میں کئی دنوں سے تمہیں ملنا چاہ رہا تھا، لیکن کوئی موقع ہی نہیں مل رہا تھا، دراصل دن کے وقت میں تم سے ملنا ہی نہیں چاہتا تھا اور نہ کب کا مل لیتا۔''

''اچھا خیر...... اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟''

''میں بات کو گھما پھرا کر نہیں کرنا چاہتا۔''

''ہاں ہاں کہو...... تم جو کہنا چاہتے ہو۔''

''میں وہ علم سیکھنا چاہتا ہوں جو تم مبارک کو سکھا رہے تھے۔''

''یہ تم سے کس نے کہا؟'' کرم دین نے صابر کی

بات سن کر حیرانی سے دریافت کیا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مبارک کے چلہ کاٹنے والی بات ان دونوں کے علاوہ کسی تیسرے شخص کو معلوم نہ تھی پھر صابر کو کیسے پتا چل گیا تھا۔

''مبارک میرا جگری دوست ہے، اس کی کوئی بھی بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں، پھر بھلا یہ بات وہ مجھ سے کیسے چھپا سکتا تھا۔''

''اگر تم جانتے ہو تو یقیناً یہ بھی جانتے ہوگے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔''

''میں جانتا ہوں لیکن وہ بزدل تھا اسی لیے چلہ درمیان میں چھوڑا اور ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا اور اب اسی خوف کو سر پر سوار کیے اپنے گھر میں بیٹھا بھی ڈرتا رہتا ہے۔''

کرم دین کو جس شخص کی تلاش تھی، وہ خود چل کر اس کے پاس آپہنچا تھا، اس کی باتیں سن کر کرم دین کو پھر سے حوصلہ مل رہا تھا لیکن اس بار وہ مبارک جیسے کسی ڈرپوک شخص کا انتخاب نہیں کرنا چاہتا تھا، صابر کی باتوں سے اسے کچھ تسلی ہو رہی تھی مگر اتنا کافی نہ تھا، اسے اپنی تسلی کے لیے صابر کو کسی امتحان سے گزارنا تھا، اگر وہ اس امتحان میں پورا اترتا تو پھر اسے اس کے چلہ کاٹنے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

''تم کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟'' کرم دین کو خاموش پا کر صابر نے دریافت کیا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔''

''کچھ تو ہے۔''

''دراصل۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری بہادری کا چھوٹا سا امتحان لے لیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا، کہیں یہ نہ ہو تم بھی مبارک کی طرح بھاگ کھڑے ہو۔''

''میں ہر امتحان کے لیے تیار ہوں لیکن اگر میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو پھر تو تم مجھے وہ علم سکھا دو گے نا؟''

''ہاں۔ پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''تو پھر بتاؤ وہ کون سا امتحان ہے؟''

''پرانے قبرستان کے آخری کونے میں جو نیم کا درخت ہے تمہیں آدھی رات کو اس کے نیچے کیل ٹھونک کر آنا ہوگا۔''

''بس اتنی سی بات ہے؟'' صابر نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

''یہ اتنا بھی معمولی کام نہیں وہاں کسی جن بھوت یا چڑیل سے بھی تمہاری ملاقات ہوسکتی ہے۔''

''انہیں بھی دیکھ لیں گے۔ وہ کھا نہیں جائیں گے بس تم یہ بتاؤ، یہ کام کب کرنا ہے؟''

''یہ کام چاند کی چودھویں تاریخ کو ہوگا ابھی تمہارے پاس تین دن باقی ہیں، تب تک اچھی طرح سوچ لو اگر پھر بھی تم اس امتحان کے لیے تیار ہوئے تو کیل لے کر میرے پاس آجانا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، اب چاند کی چودھویں تاریخ کو ہی ملاقات ہوگی۔'' صابر نے اٹھتے ہوئے بات کی۔

اسے اٹھتے دیکھ کر کرم دین بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا، باہر نکلنے سے پہلے صابر نے گلی میں ادھر ادھر نظر دوڑائی، وہاں کوئی موجود نہیں تھا، پھر اس نے چادر اچھی طرح لپیٹی اور وہاں سے نکل گیا۔

صابر کو رخصت کرنے کے بعد کرم دین واپس اپنی چارپائی پر آلیٹا تھا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی شخص خود بخود اس کام کے لیے چلا آئے گا، گو کہ صابر کو ابھی ایک امتحان سے گزرنا تھا اور آئندہ کا لائحہ عمل اسی امتحان کے بعد ہی طے ہونا تھا، مگر کرم دین اس بات سے ہی مطمئن تھا کہ کوئی اور اس کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار تھا۔

......☆☆☆......

کرم دین کے اگلے تین دن ایک ایک پل گن گن کر گزرے تھے، اس دوران صابر اس کے پاس آیا تھا اور نہ کہیں کرم دین سے اس کی ملاقات ہوئی تھی، کرم دین جانتا تھا کہ اس نے صابر کو آدھی رات کا وقت دیا تھا مگر پھر بھی وہ شام کو ہی کھانے سے فارغ ہو کر اس

کے انتظار میں بیٹھ گیا تھا، اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا مگر اس کے باوجود جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا اس کے دل میں خدشات پیدا ہوتے جارہے تھے۔

بار بار کرم دین کی نظر دیوار پر لگی گھڑی کی طرف اٹھ جاتی تھی، وقت اپنی مقررہ رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا مگر کرم دین کو تسلی نہیں ہورہی تھی، اس کا خیال تھا کہ گھڑی میں ضرور کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے اسی لیے تو اس کی سوئیاں آہستہ چل رہی تھیں، وہ کبھی بیٹھ جاتا، کبھی لیٹ جاتا اور کبھی بے چین ہوکر صحن میں ٹہلنے لگتا تھا، دو بار وہ دروازہ کھول کر باہر گلی میں بھی جھانک آیا تھا اور دونوں بار اسے مایوسی ہوئی تھی۔

صابر وعدے کا پکا نکلا، ادھر گھڑی نے بارہ بجائے ادھر اس نے دروازے پر آ دستک دی، دستک پر کرم دین یوں دوڑ کر دروازے پر پہنچ گیا کہ اگر اس نے کنڈی کھولنے میں ذرا سی بھی دیر کردی تو وہ واپس لوٹ جائے گا۔

"بہت دیر لگادی تم نے؟" دروازہ کھولتے ہی کرم دین نے سوال کیا۔

"تم نے خود ہی آدھی رات کو آنے کو کہا تھا۔" صابر نے آہستہ سے جواب دیا۔

"اچھا کیل لائے ہو؟"

"لایا ہوں جناب! لایا ہوں یہ دیکھو میرے پاس ہے۔" صابر نے اپنے جسم پر لپٹی ہوئی چادر کو ہٹا کر ہاتھ میں پکڑا ہوا کیل دکھاتے ہوئے کہا۔

"اور ہتھوڑی کہاں ہے؟"

"تم نے ہتھوڑی کا تو نہیں کہا تھا۔"

"خیر۔ ہتھوڑی کے بغیر بھی کام چلالیں گے وہاں سے کوئی نہ کوئی اینٹ، روڑہ مل ہی جائے گا۔"

"اب کرنا کیا ہے؟" صابر نے سوال کیا۔

"کرنا یہ ہے میں خود تمہارے ساتھ قبرستان چلوں گا۔ تم بلاخوف وخطر مقررہ جگہ پر کیل ٹھونک کر واپس آگئے تو میں اپنے وعدے کے مطابق تمہیں وہ علم سکھا دوں گا اور اگر تم ڈر کر ناکام لوٹ آئے یا تمہارے چہرے پر خوف کی کوئی پرچھائیں بھی دکھائی دی تو پھر تم خود سمجھ دار ہو۔"

"تو پھر چلیں؟"

"تم یہیں ٹھہرو، میں اندر سے دروازے پر لگانے کے لیے تالا لے آؤں پھر چلتے ہیں" کرم دین نے بات کی اور تالا لینے اندر چلا گیا۔

وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں تالا تھا اور اس نے چادر لپیٹ رکھی تھی، کرم دین نے تالا لگا کر چابی احتیاط سے جیب میں ڈال لی، پھر وہ دونوں قبرستان کی طرف چل پڑے، قبرستان وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا، ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا، کسی کسی گھر کے باہر بلب جل رہا تھا مگر چاند اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ روشن تھا اس لیے انہیں چلنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہورہی تھی، وہ تھوڑی ہی دیر میں قبرستان پہنچ گئے تھے، راستے میں سے ہی کیل ٹھونکنے کے لیے صابر نے ایک اینٹ بھی اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔

"لو بھئی۔ میرا اور تمہارا ساتھ یہیں تک تھا۔ اب تم قبرستان کے اندر جاؤ اور وہاں کونے میں درخت کے نیچے یہ کیل ٹھونک کر آؤ۔ میں یہیں کھڑا تمہارا انتظار کررہا ہوں۔" کرم دین نے قبرستان کے باہر رُکتے ہوئے صابر سے کہا۔

صابر نے کرم دین کی بات تسلی سے سنی اور پھر کوئی بات کیے بغیر قبرستان میں چلا گیا، قبرستان کافی پرانا اور بڑا تھا، اس میں مزید تدفین کی گنجائش نہیں رہی تھی، اس لیے اب لوگ مردے کسی دوسرے قبرستان میں دفنانے لگے تھے، صابر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تسلی سے مقررہ جگہ کی طرف بڑھ رہا تھا، کرم دین چاند کی چاندنی میں اسے جاتا ہوا باآسانی دیکھ رہا تھا، کچھ دور تک وہ اسے صاف دکھائی دیتا رہا پھر جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا گیا اسے دیکھنا مشکل ہوتا گیا، پھر جب وہ کافی دور چلا گیا تو وہ اسے بالکل ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

صابر دل کو مضبوط کرکے مقررہ جگہ پر پہنچ گیا تھا، قبرستان کی خاموشی اسے ڈرانے کے لیے کافی تھی مگر کرم دین کے مطابق صابر کو عین درخت کے نیچے کیل ٹھونکنا تھا، اب تک چاند کی روشنی اسے راستہ دکھانے کے لیے کافی تھی مگر درخت کے نیچے مکمل اندھیرا تھا، درخت اس قدر گھنا تھا کہ چاند کی روشنی اس کے نیچے نہیں پہنچ پارہی تھی۔

وہ درخت کے نیچے گھپ اندھیرے میں کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، مگر اندھیرے کے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، کچھ دیر تک اندھیرے میں کھڑا رہنے سے اسے کسی سائے کی طرح کچھ کچھ دکھائی دینے لگا تھا مگر ابھی بھی واضح طور پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، پھر بھی وہ درخت کے نیچے ایک مناسب جگہ دیکھ کر کیل ٹھونکنے لگا۔

اس نے کیل ٹھونکنے کے لیے اینٹ سے پہلی ہی ضرب لگائی تو درخت پر بیٹھے ہوئے پرندوں نے ڈر کر شور مچادیا، اچانک پرندوں کے شور اور ان کے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز سے صابر دہل گیا اور اس کا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا پرندوں نے ہلکا سا احتجاج کیا تھا پھر خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تھے، صابر بھی تھوڑی دیر کے لیے خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا، اسے یہ کام ختم کرکے واپس بھی جانا تھا، جہاں کرم دین اس کا انتظار کررہا تھا۔

صابر نے اپنی تمام قوتوں کو یکجا کیا اور ہمت کرکے پھر سے کیل ٹھونکنے لگا، پرندے پھڑپھڑاتے رہے مگر اس نے کوئی پرواہ نہ کی اور اپنا کام مکمل کرکے اینٹ وہیں پھینک دی اور واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، اسے جلد از جلد اس شہر خموشاں سے نکل جانا تھا، اسے اندھیرے کی وجہ سے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس کی چادر زمین پر لگ رہی تھی اور اس نے اسی میں کیل ٹھونک دیا تھا، وہ اٹھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے دبوچ کر پیچھے کھینچ لیا ہو، وہ ڈرا سہما ہوا تو پہلے ہی تھا، خوف اور دہشت نے اسے اس قدر جکڑا کہ وہ وہیں گر گیا اور اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ بھی نہ نکل سکی۔

☆☆☆

کرم دین کا خیال تھا کہ صابر کام ختم کرتے ہی تھوڑی ہی دیر میں لوٹ آئے گا لیکن وہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آیا، جب وہ انتظار کرتے ہوئے تھک گیا تو اس نے واپسی کا ارادہ کرلیا اور گھر کی جانب چل پڑا، راستے میں بھی وہ یہ سوچ کر بار بار پلٹ کر دیکھتا رہا کہ شاید اب وہ اس کے پیچھے آرہا ہو، وہ اسی کیفیت میں گھر پہنچ گیا تھا مگر صابر نہیں آیا تھا۔

صابر کے نہ آنے سے کرم دین کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں، وہ قبرستان سے واپس آکر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا تھا مگر اس کا ذہن مسلسل صابر میں ہی الجھا ہوا تھا، سوچتے ہوئے وہ خود کو بھی کوس رہا تھا کہ اگر وہ نہیں آیا تھا تو اسے خود قبرستان میں جاکر حالات کا جائزہ لینا چاہئے تھا، یا کم از کم اسے کچھ دیر اور انتظار کرنا چاہئے تھا، ہوسکتا ہے اسے اپنا کام مکمل کرنے میں کچھ وقت لگ گیا ہو، اور جب وہ واپس آیا ہوگا تو اسے وہاں کھڑے نہ پاکر اسے کتنا برا لگا ہوگا۔

وہ چارپائی پر لیٹا دیر تک خود کو ہی برا بھلا کہتا رہا تھا، صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ نکل آئی تھی، سورج کی کرنیں کھڑکیوں اور دروازے کے راستے کمرے میں داخل ہوکر اس کے چہرے پر پڑرہی تھیں، آنکھ کھلتے ہی وہ پھر سے صابر کے متعلق سوچنے لگا تھا، وہ جلد از جلد صابر کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، اس لیے منہ ہاتھ دھویا اور دروازے پر تالا لگا کر باہر نکل گیا۔

کرم دین اکثر حلوہ پوری کا ناشتہ کیا کرتا تھا، اس روز وہ خاص طور پہلوان چنے والے کے پاس گیا تھا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ صابر بھی اکثر ناشتے کے لیے وہیں آیا کرتا تھا، اس نے نان چنے لیے اور ایک بنچ پر بیٹھ کر بے دلی سے کھانے لگا، اس کی نگاہیں مسلسل صابر کو ڈھونڈ رہی تھیں، اس کی نظر ہر آنے جانے والے

پرتھی مگر صابر کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا، وہ جس مقصد کے لیے وہاں آیا تھا وہ پورا نہیں ہوا تھا، اس لیے وہ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے گھر کی راہ لی۔

واپسی پر صابر کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے متعلق معلوم کرے، لیکن ایسا کرنا خطرے سے خالی نہ تھا، اس لیے وہ اس کے گھر کے سامنے رکے بغیر آگے بڑھ گیا، گلی کے کونے پر محلے کے کچھ افراد کھڑے آپس میں باتیں کررہے تھے، وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر کی جانب جا رہا تھا، ان کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھانا شروع کر دیے تا کہ وہ وہاں رکے بغیر با آسانی ان کی باتیں سن سکے، یہاں بھی کرم دین کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا، کیونکہ ان کی گفتگو کا محور ملکی سیاست تھی اور ان کی باتوں میں صابر کا کہیں کوئی ذکر نہیں تھا۔

وہ گھر لوٹ آیا تھا مگر صابر کے متعلق اسے کچھ معلوم نہیں ہوسکا تھا، صابر کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ الجھ کر رہ گیا تھا، وہ یہ سوچ کر پھر سے خود کو کوسنے لگا کہ کل رات اگر اس نے تھوڑا سا بھی دماغ سے کام لیا ہوتا تو جس الجھن کا شکار وہ اب ہے، اس سے بچ جاتا۔

رات سے صبح، پھر صبح سے دوپہر ہوگئی تھی مگر کرم دین صابر کے علاوہ کسی دوسری بات کے متعلق ذرا سا بھی نہیں سوچ پایا تھا، اسی پل مسجد سے ہونے والے اعلان نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا، ابھی اس نے اتنا ہی سنا تھا ”حضرات ایک ضروری اعلان سنیے۔“ کہ وہ اس قدر تیزی سے ایک جھٹکے کے ساتھ چارپائی سے اٹھ بیٹھا جیسے اس کے اندر کرنٹ دوڑ گیا ہو، وہ فوراً کمرے سے نکل کر صحن میں آ کھڑا ہوا اور اپنے کان مسجد سے کیے جانے والے اعلان پر یوں لگا دیے جیسے وہ اعلان صرف اور صرف اسی کو سنانے کے لیے کیا جارہا تھا۔

مسجد سے اعلان ہورہا تھا جس میں کہا جارہا تھا ”ایک لڑکا جس کی عمر بیس سال ہے، اس کا نام صابر ہے، وہ رات سے گھر واپس نہیں آیا، جس کی وجہ سے اس کے والدین بہت پریشان ہیں، اگر اس کے بارے میں کسی کو خبر ہو تو وہ ان کے گھر اطلاع کر دے اور اگر صابر خود یہ اعلان سن رہا ہو تو فوراً گھر پہنچ جائے“۔

یہ اعلان کرم دین پر بجلی کی طرح گرا تھا اور اسے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگی تھی کہ یقیناً رات کو قبرستان میں اس کے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا ہوگا، تبھی تو وہ رات سے اب تک گھر نہیں پہنچا تھا، پھر دل کو تسلی دینے کے لیے وہ خود ہی اپنے خیال کی نفی کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ قبرستان سے واپسی پر وہ کسی دوست کے ہاں چلا گیا ہو اور پھر رات کو اسی کے پاس ٹھہر گیا ہو، رات بھر دوست یار مل کر جاگتے رہے ہوں، اس لیے آنکھ نہ کھلی ہو اور وہ ابھی تک سو رہے ہوں۔

پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے آس پاس کی دیگر مساجد سے بھی صابر کی گمشدگی کے متعلق اعلانات ہوتے رہے، ان اعلانات نے کرم دین کو خوف زدہ کر دیا تھا، اسی ڈر نے اسے گھر میں قید رہنے پر اس قدر مجبور کر دیا تھا کہ اس نے دوپہر کا کھانا کھایا نہ رات کا کھانا کھانے کے لیے ہی گھر سے نکلا، اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی اس کے اندر کے خوف کو اس کے چہرے سے نہ پڑھ لے۔

وہ کچھ کھائے پیئے بغیر ہی لیٹ گیا تھا، صابر کی سوچوں نے اسے اس قدر جکڑ رکھا تھا کہ اسے کسی کروٹ چین نہیں آرہا تھا، ابھی تک وہ چلہ کاٹتے ہوئے مبارک کے ذہنی توازن کھو دینے کو دماغ سے پوری طرح جھٹک نہیں پایا تھا کہ اب صابر کی گمشدگی نے اس کی نیند اور بھوک اڑا کر رکھ دی تھی۔

رات بھر وہ ایک پل کے لیے بھی سو نہیں پایا تھا، صبح ہوگئی تھی مگر پھر بھی وہ چارپائی پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا، اس طرح چارپائی پر پڑے کب تک گزارا ہوسکتا تھا،

یوں بھی صبح سے صابر کی گمشدگی کے اعلانات پھر سے کیے جانے لگے تھے، اسے گھر سے باہر نکل کر حالات کا جائزہ لینا تھا، یہ سوچ کر وہ گھر سے نکل پڑا اور بلا ارادہ ایک طرف کو چلنے لگا، گزرتے ہوئے راستے میں اسے جہاں کہیں دو چار افراد کھڑے دکھائی دیتے وہیں صابر کے بارے میں ہی باتیں سنائی دیتیں۔

......☆☆☆......

دوپہر کا وقت تھا، کچھ لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے، بیٹس مین نے اونچی شارٹ لگائی تھی، کیچ پکڑتے ہوئے ایک لڑکے کی نظر آسمان کی طرف اٹھی تو اسے ایک کٹی ہوئی پتنگ دکھائی دی، اس نے گیند وہیں چھوڑا اور اس طرف دوڑ لگا دی جہاں پتنگ تیزی سے زمین کی طرف آرہی تھی، جب دوسرے لڑکوں کی نظر بھی پتنگ پر پڑی تو وہ بھی کھیل چھوڑ کر پتنگ کے پیچھے دوڑ پڑے، اب سب لڑکوں کی نظریں پتنگ پر جمی ہوئی تھیں، دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے اور جس طرف کو پتنگ جارہی تھی اسی طرف دوڑے چلے جارہے تھے۔

کٹی ہوئی پتنگ قبرستان کے اوپر پہنچ گئی تھی، کچھ لڑکے قبروں کو پھلانگتے ہوئے اور کچھ قبروں کو روندتے ہوئے کسی بھی چیز کی پروا کیے بغیر پتنگ پکڑنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں تھے، اچانک پتنگ نے ایک جھول کھائی اور قبرستان کے کونے والے درخت میں اٹک گئی، جو لڑکا سب سے آگے تھا اس نے چھلانگ لگا کر پتنگ کے ساتھ آنے والی ڈور کا سرا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

آگے پیچھے تمام لڑکے پتنگ کے پیچھے بھاگتے ہوئے درخت کے نیچے آ کھڑے ہوئے تھے اور درخت سے پتنگ اتارنے کے لیے اپنے اپنے مشورے دے رہے تھے، اتنے میں انہی میں سے ایک لڑکے نے پتھر اٹھایا اور پتنگ پر دے مارا، جس کی وجہ سے پتنگ پھٹ گئی اور سارا کھیل ہی ختم ہوگیا۔

”یہاں کتنی بدبو آرہی ہے؟“ پتنگ سے توجہ ہٹنے کے بعد ایک لڑکے نے بدبو کا احساس ہونے پر کہا۔

ابھی تک وہاں کھڑے کسی بھی لڑکے کو بدبو محسوس نہیں ہوئی تھی، کیونکہ ان سب کا دل و دماغ پتنگ پکڑنے پر مرکوز تھا، جب ایک لڑکے نے بدبو کا احساس دلایا تو سب نے بدبو سے بچنے کے لیے اپنے اپنے ناک پر ہاتھ رکھ لیے۔

”مگر یہ بدبو ہے کس چیز کی؟“ ایک اور لڑکے نے سوال کیا۔

اس بچے کی بات سن کر یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ وہ بدبو کہاں سے آرہی تھی، سب لڑکے ادھر ادھر جائزہ لینے لگے۔

”وہ دیکھو! کسی کی لاش پڑی ہے، لگتا ہے یہ بدبو بھی وہیں سے آرہی ہے۔“ ایک لڑکے نے ایک طرف اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے توجہ دلائی۔

”مجھے تو یہاں سے خوف آنے لگا ہے۔ میں تو جارہا ہوں۔“ ایک لڑکے نے فیصلہ سنایا۔

”ہاں یار! ہم بھی چلتے ہیں، قبرستان میں لاش دیکھ کر مجھے تو عجیب سی وحشت ہونے لگی ہے۔

”چلو...... چلو چلتے ہیں۔“ ایک اور لڑکے نے بات کی اور پھر وہ سب جس طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے وہاں آئے تھے اسی طرح واپس چل پڑے۔

بہت سے لڑکوں نے ایک ساتھ لاش دیکھی تھی، اس لیے یہ بات زیادہ دیر تک چھپی نہ رہ سکی اور تھوڑی ہی دیر میں لاش کے متعلق سرگوشیاں ہونے لگیں، کچھ ہی دیر بعد یہ خبر صابر کے گھر والوں تک بھی پہنچ گئی تھی، ابھی تک کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ قبرستان میں پڑی ہوئی لاش کس کی تھی، لاش کے متعلق سنتے ہی صابر کی ماں نے رونا شروع کر دیا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنی چھاتی پیٹتے ہوئے بین کرنے لگی تھی۔

صابر کے باپ اور بھائی نے محلے کے چند معززین کو ساتھ لیا اور لاش کی شناخت کرنے قبرستان پہنچ گئے، لڑکوں کی نشاندہی پر جب وہ لوگ اس کونے میں پہنچے

جہاں لاش پڑی تھی تو وہاں تعفن پھیلا ہوا تھا، جس کی وجہ سے وہاں کھڑا ہونا محال تھا، کئی روز تک لاش اسی طرح پڑی رہنے سے اس میں ہوا بھر جانے سے پھول گئی تھی اور چہرہ بری طرح مسخ ہو چکا تھا، کپڑوں کی وجہ سے لاش کو پہچاننے میں کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوئی تھی، وہ صابر کی ہی لاش تھی، جسے اٹھا کر چارپائی پر ڈالنے لگے تو چادر کیل میں ٹھنکی ہونے کی وجہ سے کھنچ گئی، جسے پھاڑ کر نکالا گیا۔

کچھ محلے داروں نے پولیس کو اطلاع دینے کا مشورہ دیا تھا مگر صابر کے اہلِ خانہ لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے اور چیر پھاڑ کے ڈر سے ایسا نہیں چاہتے تھے، مرنے والا تو مر چکا تھا، ان کی کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں تھی، پولیس کو اطلاع دینے سے بھی کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا، اس کے باوجود قانونی کارروائی پوری کرنا بھی ضروری تھا، اس لیے صابر کے قتل کی رپورٹ پولیس کو کر دی گئی، پولیس لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے جانا چاہتی تھی، جبکہ صابر کے والدین اور اہل خانہ ایسا نہیں چاہتے تھے اس لیے کچھ دے دلا کر پولیس کو ایسا نہ کرنے دیا گیا اور لاش کو غسل دے کر خاموشی سے دفنا دیا گیا۔

کسی اور کا جنازہ ہوتا تو شاید کرم دین شرکت نہ کرتا، لیکن صابر کے جنازے میں شرکت کے لیے وہ خصوصی طور پر پہنچا تھا تاکہ جان سکے کہ صابر کی موت میں کسی بھی حوالے سے کہیں اس کا نام تو نہیں لیا جا رہا، صابر کے والدین اس بات سے پریشان تھے کہ صابر قبرستان کے اس کونے میں کیا لینے گیا تھا اور اگر وہ خود نہیں پہنچا تھا تو اسے وہاں کون لے گیا تھا۔

......☆☆☆......

کرم دین چارپائی پر لیٹا گزرے ہوئے وقت کو کھلی آنکھوں سے کسی خواب کی طرح دیکھ رہا تھا، اس وقت اس کی زندگی کسی کتاب کی طرح اس کے سامنے تھی، جس کا کبھی کوئی باب کھل جاتا اور کبھی کوئی دوسرا باب کھل کر اس کے سامنے آ جاتا، کچھ باب ایسے بھی کھل کر اس کے سامنے آ جاتے تھے جنہیں وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا، مگر وہ چاہتا بھی تو انہیں اس کتاب سے پھاڑ کر پھینک نہیں سکتا تھا، کیونکہ ان صفحات کے بغیر اس کی زندگی کی کتاب ادھوری اور نامکمل تھی۔

انہی صفحات میں کچھ ایسے بھی تھے جنہیں پڑھ کر اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی، گو کہ وہ صفحات اس کی آنکھوں میں آنسو لانے کا سبب بن رہے تھے، مگر پھر بھی وہ انہیں پلٹنا نہیں چاہتا تھا مگر ایسا اس کے بس میں نہیں تھا، کیونکہ صفحات تو خود بخود پلٹتے جا رہے تھے، وہ ایک ایسے سحر میں گرفتار تھا جس سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا، کبھی ماں کی سسکیاں، کبھی بیوی کی سرگوشیاں اور کبھی ان کی نصیحتیں اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

دروازے پر دستک ہوئی تھی، جس کی آواز کرم دین کے کانوں میں بھی پڑی تھی، مگر وہ اسے بھی کانوں میں پڑنے والی دوسری آوازوں کا حصہ سمجھا تھا، کچھ دیر تک دروازہ کھلنے کا انتظار کیا گیا تھا مگر جب کسی نے دروازہ نہ کھولا تو پھر سے دستک دی گئی، اس بار ہونے والی دستک کرم دین نے سن لی تھی مگر وہ اسے اپنا وہم سمجھا تھا، کیونکہ ایک مدت سے کسی نے بھی اس کے دروازے پر دستک نہیں دی تھی، وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ تھا کہ آس پاس کے سبھی لوگوں نے اس سے میل جول ختم کر رکھا تھا اور اسی بائیکاٹ کی وجہ سے ہی کبھی کوئی بھولے سے بھی اس سے ملنے نہیں آتا تھا مگر دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک سے اسے یقین کرنا پڑا کہ واقعی وہ دستک اسی کے دروازے پر ہو رہی تھی۔

زندگی کی جو کتاب وہ کھولے بیٹھا تھا وہ خود ہی بند ہو گئی تھی، وہ چارپائی سے اٹھا اور بے یقینی کے عالم میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا، اسے دروازہ کھولنے میں کافی دیر ہو گئی تھی، اس لیے دروازے پر دستک دینے والا اب دروازے کو پیٹنے لگا تھا، اور دستک نے باقاعدہ شور کی شکل اختیار کر لی تھی، اس سے پہلے کہ کوئی دروازہ ہی توڑ

ڈالتا اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''جی فرمایئے۔'' سادہ سی شلوار قمیض پہنے دروازے پر کھڑے درمیانی عمر کے اجنبی شخص کو دیکھ کر کرم دین نے سوال کیا۔

وہ شخص جو دروازے کے اس پار کھڑا تھا اس کے چہرے کے تاثرات سے بھی پتا چل رہا تھا کہ وہ بھی کرم دین کو نہیں پہچانتا تھا، اسے خاموش پا کر کرم دین کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ اس شخص کو کہیں اور جانا تھا مگر وہ غلطی سے اس کے دروازے پر آ کھڑا ہوا تھا۔

''تم کرم دین ہو؟''

''ہاں۔''

''وہ لوگ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اس اجنبی شخص نے اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس شخص کے اشارہ کرنے پر کرم دین نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کے گھر کے سامنے ہی تین گاڑیاں کھڑی تھیں، جن میں سے جو اشخاص نکل کر اس کی طرف بڑھ رہے تھے، اس نے پہلی ہی نظر میں انہیں پہچان لیا تھا، گو کہ وہ بہت سالوں بعد وہاں آئے تھے مگر وہ انہیں کیسے بھول سکتا تھا، اس نے زندگی کے بہت سے سال ان کے ساتھ مل کر گزارے تھے، ایک عرصہ تک ہر دھوپ چھاؤں میں وہ اکٹھے رہے تھے اور زندگی کے بہت سے دکھ سکھ ایک ساتھ دیکھے تھے۔

''کیسے ہو کرم دین؟'' ان تینوں نے ہی باری باری رسمی طور پر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ہاتھ ملاتے وقت ان میں سے کسی نے بھی کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

جب بھی کوئی بڑا آدمی اپنے سے کسی چھوٹے آدمی سے ملتا ہے تو اس کے رویے میں ایسی ہی سرد مہری ہوا کرتی ہے، مگر وہ تو اس کے بھائی تھے، جنہوں نے ایک ہی ماں کے پیٹ سے جنم لیا تھا، پھر وہ کیوں غیروں کی طرح مل رہے تھے، کیا دولت بھائیوں کو بھائیوں سے اس قدر دور کر دیتی ہے کہ وہ سالوں بعد بھی ملیں تو یوں لگے جیسے ان میں کوئی تعلق، کوئی رشتہ ہی نہ ہو کرم دین سوچنے لگا۔

ابھی وہ اور بھی نہ جانے کیا کچھ سوچتا مگر اس کا تسلسل اس وقت ٹوٹ گیا جب اس کے تینوں بھائی اس سے ٹکراتے ہوئے اندر داخل ہو گئے، دروازے پر دستک دینے والا اجنبی شخص بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا تھا، کرم دین کے تینوں بھائی گھر کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بیوپاری کسی چیز کا سودا کرنے سے پہلے اس کا اچھی طرح جائزہ لے رہا ہو۔

کرم دین بھی ان کے ساتھ ساتھ صحن میں آ کھڑا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اسے ملنے آئے تھے تو وہ اس سے بات کیوں نہیں کر رہے تھے، وہ گھر ان کا دیکھا بھالا تھا، اسی گھر میں انہوں نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری تھی، پھر اسی گھر کو وہ عجیب عجیب زاویوں سے کیوں دیکھ رہے تھے، پھر اس کے بڑے بھائی راحت کے ایک ہی جملے نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔

راحت کہہ رہا تھا ''تم بہت سال رہ لیے یہاں' اب اس گھر کو تقسیم ہو جانا چاہیے۔''

بھائی کی بات سن کر وہ کہہ دینا چاہتا تھا ''اچھا تو تم اس گندی بستی میں بھائی سے ملنے نہیں اس گھر کا بٹوارہ کرنے آئے ہو۔'' وہ سوچتا رہا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

''ہمیں بھی پیسوں کی ضرورت ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ چاروں مل کر اپنا اپنا حصہ بانٹ لیں۔'' ریاض نے بھی اپنا مدعا بیان کیا۔

کرم دین اب تک خاموشی سے گردن جھکائے کھڑا تھا اسے زندگی میں کبھی اتنا حوصلہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی بھی معاملے میں بڑے بھائیوں کے سامنے زبان کھولے، مگر جائیداد بانٹنے کی بات جیسے کسی تیر کی طرح اس کے دل پر لگی اور اسے زخمی زخمی کر گئی، وہ انہی زخموں کے درد کی شدت سے چیخ اٹھا ''آج تم تینوں ہی جائیداد تو بانٹنے آ گئے ہو۔ کاش کبھی میرے ساتھ دکھ بانٹنے بھی آ گئے ہوتے۔ میں تم سب کے حصے کے دکھ

اکیلا ہی سہتا چلا آیا ہوں، ان دکھوں، مصیبتوں اور تکلیفوں میں تم تینوں کا بھی اتنا ہی حصہ تھا جتنا میرا۔ پھر وہ بانٹنے کیوں نہیں آئے؟" کرم دین نے بھائیوں سے شکوے کے طور پر بات کی تھی مگر وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ شاید وہ اس گھر میں سے ان کا حصہ دینے سے انکار کر رہا ہے، اس لیے راحت فوراً بول پڑا "تم ایسا نہیں کر سکتے۔ اس گھر میں ہم تینوں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا تم اس گھر کے اکیلے وارث نہیں ہو۔"

"یہ میں نے کب کہا کہ اس گھر میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔ میں تو تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ بھائی صرف جائیداد میں ہی کیوں حصہ داری کا دعوا کرنے آجاتے ہیں۔"

کرم دین اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ شفیق نے بات کاٹ دی "اگر تم نے ماں کو کچھ سالوں تک اکیلے سنبھالا ہے تو اتنے سالوں تک اس گھر میں بھی تو تم اکیلے ہی مالک بنے بیٹھے رہے ہو۔ اگر ہم ان سالوں کے کرائے کا ہی حساب کرنے بیٹھ جائیں تو وہ لاکھوں میں ہوگا۔ ہم تو اس کرائے کا بھی تم سے کوئی مطالبہ نہیں کر رہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے حصے میں شفٹ ہو جاؤ تاکہ ہم تینوں اپنا حصہ فروخت کر کے آپس میں رقم بانٹ لیں۔ ہم اپنے ساتھ مستری بھی لے آئے ہیں تاکہ دیوار بنانے کے لیے پیمائش کی جا سکے۔"

"مجھے اس گھر میں سے کچھ نہیں چاہیے۔" کرم دین کہہ رہا تھا "میرے بیوی بچے بھی نہیں، میں اکیلا ہوں کہیں بھی رہ لوں گا۔ میرا حصہ بھی تم تینوں ہی آپس میں بانٹ لو۔"

کرم دین کی بات سن کر راحت، شفیق اور ریاض تینوں ہی کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی پھر بھی راحت بول پڑا "ہم اتنے بھی ظالم نہیں...... تمہیں تمہارا حق پورا ملے گا......" پھر مستری کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا "تم اچھی طرح پیمائش کرلو اور نشان لگالو کہ دیوار کہاں بنے گی اور کل ہی سے دیوار بنانے کا کام شروع کر دو تاکہ ہم جتنی جلدی ہو سکے اس کام سے فارغ ہو جائیں۔"

راحت کی بات سن کر کرم دین نے نظریں جھکا دیں اور خاموشی سے ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

......☆☆☆......

کرم دین کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا، نہ بیوی، نہ بچے، نہ دولت اور نہ عزت، وہ سب کچھ جو اس کے پاس تھا چھن چکا تھا، ان سب سے بڑھ کر جو بوجھ وہ اٹھائے پھر رہا تھا وہ کسی پل اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا، اسے کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی، آج کل اس کے پاس بابا سائیں نجات دہندہ کی شکل میں دکھائی دیتے تھے، مگر انہوں نے بھی جو حل بتایا تھا اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

کوئی مزار، کوئی پیر فقیر، کوئی دربار، کوئی خانقاہ ایسی نہیں رہی تھی جہاں وہ اپنے درد کا علاج ڈھونڈنے نہیں پہنچا تھا، مگر اس کے اجڑے دل کو کہیں قرار نہیں ملا تھا، دن بدن اس کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی، وہ سارا سارا دن چارپائی پر لیٹا چھت کو گھورتا رہتا، تمام محلے داروں نے بھی اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس سے میل جول ختم کر رکھا تھا، وہ بھری دنیا میں بھی تنہا تھا، کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو مشکل کے ان لمحات میں اس کا ساتھ دیتا۔

وہ روز کی طرح اپنی سوچوں میں گم بیٹھا تھا، جب مسجد سے ہونے والی اذان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، یہ آواز ہر روز پہلے بھی پانچوں وقت اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی تھی، جسے وہ سنی ان سنی کر دیا کرتا تھا، لیکن اس لمحے اذان کی آواز کانوں کے راستے سیدھی اس کے دل میں اتر رہی تھی، اس وقت اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا صرف اذان کی آواز تھی جو اسے جھنجوڑ رہی تھی، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار اس نے دل سے مکمل توجہ کے ساتھ اذان سنی تھی۔

مسجد سے ہونے والی اذان ختم ہو گئی تھی مگر وہ گم صم بیٹھا اذان کے الفاظ پر غور کر رہا تھا، وہ کچھ دیر تک اسی کیفیت میں بیٹھا سوچتا رہا پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، اٹھتے ہی اس نے جلدی سے وضو کیا اور سر پر ٹوپی لے کر مسجد کی طرف چل پڑا، کرم دین کے قدم مسجد کی طرف بڑھ رہے تھے، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ یہ سب اپنی مرضی سے نہیں کر رہا تھا، کوئی طاقت تھی جو اس سے یہ سب کروا رہی تھی۔

مسجد میں نمازیوں کی تعداد کافی کم تھی، جیسے ہی کرم دین نے مسجد میں قدم رکھا، وہاں بیٹھے ہر شخص نے اسے اس انداز سے دیکھا جیسے کوئی غیر مسلم غلطی سے مسجد میں آ گیا ہو، کرم دین نے اس بات کی کوئی پروا نہ کی اور خاموشی سے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا، اس کی موجودگی کی وجہ سے نمازی آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے مگر کرم دین ان سب سے بے خبر نگاہیں نیچی کیے سکون سے بیٹھا جماعت کھڑی ہونے کے انتظار میں تھا۔

نماز کے بعد دعا ہوئی، دوسرے نمازیوں کے ساتھ کرم دین نے بھی اپنے ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے تھے، دعا مانگتے ہوئے اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے تھے، دعا ختم ہوئی تو نمازیوں نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی، اب صرف ایک دو نمازی تھے جو مصلے کے پاس بیٹھے میاں جی سے گفتگو کر رہے تھے، کرم دین کچھ دیر تک اپنی جگہ پر بیٹھا آنسو بہاتا رہا پھر خاموشی سے اٹھا اور وہاں سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میاں جی کے پاس بیٹھے ہوئے نمازیوں نے کرم دین کے مسجد میں آنے کے متعلق بات کرنے کی کوشش کی تھی، مگر میاں جی نے نہ صرف انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی تھی بلکہ یہ کہتے ہوئے ایسا کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا "یہ خدا کا گھر ہے، اور ایک مسلمان کو اس کے گھر میں آنے سے روکنے کا حق کسی کو بھی نہیں"۔

کرم دین مسجد سے نکل کر سیدھا گھر پہنچا تھا، اس نے راستے میں کسی سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی، وہ واپس آ کر پھر سے چارپائی پر لیٹ گیا تھا، وہ سوچنے لگا کہ وہ نماز ادا کرنے مسجد میں گیا تھا اور اسے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے، مگر ان چند گھڑیوں میں اسے جو راحت اور سکون ملا تھا وہ اسے کبھی کہیں نصیب نہیں ہوا تھا، وہ خود کو لعنت ملامت کرنے لگا، مسجد سے دن میں پانچ بار خدا کی طرف سے بلاوا آتا ہے کہ آؤ فلاح کی طرف، لیکن وہ تو ہمیشہ سے ہر پکار کو سنی ان سنی کرتا آیا تھا، اسی لیے تو اس کے حصے میں ناکامیاں ہی آئی تھیں۔

ماں اسے سمجھاتی رہی لیکن اس نے ہمیشہ سنی ان سنی کر دی تھی، اسی لیے وہ اس راز کو جان نہ سکا، ماں کے پاس غربت کے سوا کچھ بھی نہ تھا، اس نے زندگی میں دکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھا تھا مگر پھر بھی اس کا چہرہ پرسکون ہوتا تھا۔

سوچتے سوچتے کب وقت گزرا اسے پتا بھی نہ چلا، مسجد سے ہونے والی عشاء کی اذان اس کے کانوں میں پڑی تو وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، وہ اس قدر تیزی سے اٹھا تھا جیسے اسے اذان کا ہی انتظار تھا، اس نے وضو کیا، سر پہ ٹوپی لی اور نماز ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف چل پڑا، مسجد میں اب بھی تقریباً وہی لوگ تھے، جو مغرب کے وقت آئے ہوئے تھے اب بھی ان لوگوں نے پہلے کی طرح کرم دین کے مسجد میں آنے پر ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

مسجد سے واپسی پر کرم دین رات کا کھانا کھانے کے بعد گھر واپس آ گیا، اس نے قریب ہی دیوار پر ٹنگی ہوئی وہ تسبیح اٹھا لی جو اس کی ماں ہر وقت ہاتھ میں لیے رہتی تھی، اس نے تسبیح ہاتھوں میں لی تو اسے ایسا لگا جیسے اس کی ماں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہو، اب تسبیح اس کے ہاتھوں میں تھی لیکن اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا پڑھے، تسبیح بار بار غیر ارادی طور پر اس کے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو رہی تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ پڑھنے کی بجائے اس سے کھیل رہا تھا، پھر کچھ دیر بعد اس کے منہ سے خود

بخود ''اللہ......اللہ۔'' کے الفاظ ادا ہونے لگے اور تسبیح کے دانے ایک ایک کرکے گرنے لگے۔ تسبیح کرتے ہوئے وہ لیٹ گیا تھا، اس کی زبان سے خدا کا ذکر جاری تھا پھر آہستہ آہستہ نیند غالب آنے لگی، کچھ ہی دیر بعد تسبیح اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر اس کے سینے پر گرگئی اور وہ سوگیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو مساجد سے اذانِ فجر کی آواز اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی، مسجدوں میں اذانیں تو ہر روز ہوتی تھیں مگر اس نے کبھی ایک بار بھی فجر کی اذان نہیں سنی تھی اور اگر کبھی آواز اس کے کانوں میں پڑی بھی تھی تو اگلے ہی لمحے نیند کی وجہ سے اسے کبھی ہوش نہیں رہا تھا کہ اذان ہوئی تھی، جب اس کی آنکھ کھلتی تو دن چڑھ چکا ہوتا تھا۔

اذان کی آواز سنتے ہی اس نے چارپائی چھوڑ دی تھی، ایک عرصے کے بعد وہ سکون سے سویا تھا، ورنہ اکثر راتیں سوتے جاگتے، سوچتے اور ڈرتے ہوئے گزر جاتی تھیں، لیکن اس رات اسے بہت اچھی نیند آئی تھی۔

نماز ادا کرنے کے بعد وہ گھر لوٹا تو اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ رات کو کافی سولیا، اب دوبارہ لیٹنے سے بہتر ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت کی جائے، اس نے قرآن پاک اٹھایا تو اس کے غلاف پر اس قدر مٹی پڑی ہوئی تھی کہ غلاف کا رنگ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، اس نے آہستہ سے غلاف اتارا اور قرآن پاک ایک طرف اونچی جگہ رکھ دیا، پھر صحن میں جاکر غلاف سے مٹی جھاڑنے لگا، اس نے کئی بار زور زور سے جھٹکوں کے ساتھ غلاف پر پڑی مٹی کی تہیں جھاڑیں، مٹی جھڑنے سے غلاف کا سبز رنگ صاف دکھائی دینے لگا تھا۔

غلاف کی مٹی جھاڑنے کے بعد اس نے قرآن پاک کو بھی ہاتھوں میں پکڑ کر ہلکا ہلکا سا تھپتھپایا تو اس میں سے بھی کافی مٹی نکل کر اڑی، مٹی جھاڑنے کے بعد اس نے قرآن پاک کو چوما اور پھر اپنی دونوں آنکھوں سے لگایا، ایسا کرتے ہوئے ایک روشنی اس کے اندر تک پھیل گئی تھی، جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتا تھا مگر اسے سکون محسوس ہو رہا تھا۔

قرآن پاک، کرم دین کے سامنے کھلا پڑا تھا، اس کی نظر قرآن پاک کے الفاظ پر پڑ رہی تھی مگر وہ پڑھ نہیں رہا تھا، وہ سوچنے لگا کہ جب تک اس کی ماں زندہ رہی، اس نے قرآن پاک کی تلاوت میں کبھی کوئی ناغہ نہیں کیا تھا، پھر یہی عادت عائشہ کی رہی، وہ بھی اپنی ہر صبح کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے کیا کرتی تھی مگر ایک وہ ہے جس نے کبھی بھول کر بھی قرآن پاک کھول کر نہیں دیکھا تھا، بچپن میں اس نے میاں جی سے ہی قرآن پاک پڑھا تھا مگر اس کے بعد اسے نہیں یاد تھا کہ کبھی اس نے قرآن پاک کی تلاوت کی ہو، بہت سی سوچیں اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھیں، وہ کچھ دیر تک انہیں سوچوں میں گم رہا، پھر اسے احساس ہوا کہ وہ قرآن پاک کھولے بیٹھا ہے، اس نے ایک دو صفحات پڑھے اور پھر بند کرکے چوما اور غلاف چڑھا کر واپس اسی جگہ رکھ دیا، جہاں سے اٹھایا تھا۔

......☆☆☆......

کرم دین کے شب و روز میں اچانک تبدیلی آئی تھی، ماں جب تک زندہ رہی اسے سمجھاتی رہی، مگر اس نے کبھی مسجد کا رخ نہیں کیا تھا، بیوی نے بھی بار بار نماز کے متعلق سمجھایا تھا مگر اس نے کبھی کوئی اثر نہ لیا، اب اسے کہنے اور سمجھانے والا کوئی بھی نہیں رہا تھا، لیکن اب جیسے ہی اذان کی آواز اس کے کانوں میں پڑتی، وہ وضو کرتا اور مسجد کی طرف چل پڑتا اور ہر صبح فجر کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت بھی ضرور کرتا۔

وہ عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد واپس آکر اپنی چارپائی پر لیٹ جاتا تھا، لیٹتے ہی اسے نیند آجاتی، پھر رات بھر وہ سکون سے سویا رہتا اور صبح فجر کی اذان کی آواز سے ہی اس کی آنکھ کھلتی، اب بھی کسی کسی روز اسے سوتے میں ڈر لگنے لگتا تھا مگر وہ پہلے کی طرح پریشان نہیں ہوتا تھا، وہ چارپائی کے پائے سے لٹکی تسبیح اٹھاتا اور آیت الکرسی کا ورد کرنے لگتا یا بار بار کلمہ طیبہ پڑھتا، ایسا کرنے سے اس کا ڈر دور ہوجاتا اور پھر سے آنکھ لگ جاتی۔

......☆☆☆......

وہ سونے کی تیاری کررہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، ایک مدت سے کسی نے اس کے دروازے پر دستک نہیں دی تھی، جب کسی سے میل ملاقات نہ رہی ہو، کسی کا آنا جانا نہ ہو تو رات کی تاریکی میں ہونے والی دستک پر پریشان ہوجانا فطری بات تھی، کرم دین کے پاس ایسا کچھ بھی نہیں تھا، جس کے لٹنے کی اسے فکر ہوتی، یوں بھی لوٹنے والے کبھی دستک دے کر نہیں آیا کرتے، اس نے بلاخوف وخطر دروازے کی کنڈی کھول دی۔

''آ......آ......آپ؟'' دروازے پر میاں جی کو کھڑے دیکھ کر کرم دین نے حیران ہوکر دریافت کیا، کیونکہ اسے نہیں یاد تھا کہ محلے میں اس نے میاں جی کو کبھی کسی کے بھی گھر جاتے دیکھا ہو، میاں جی نے کرم دین کی حیرانی کو محسوس کرلیا تھا مگر خاموش رہے تھے۔

''میاں جی! آپ...... اور میرے گھر پر؟'' کرم دین نے میاں جی کو خاموش پاکر دریافت کیا۔

''ہاں۔ عشاء کی نماز کے بعد لیٹ گیا تھا۔ مگر نیند نہیں آرہی تھی، بہت دنوں سے تم سے ملنا بھی چاہ رہا تھا۔ اس لیے چلا آیا۔''

''اچھا کیا میاں جی۔'' یہ کہہ کر کرم دین خاموش ہوگیا، میاں جی بھی چپ تھے پھر کرم دین بول پڑا ''میاں جی یہاں کیوں کھڑے ہیں...... اندر آجائیں ناں؟''

''بھئی تم اندر آنے کو کہو گے تو آؤں گا ناں۔ زبردستی تو تمہارے گھر میں نہیں گھس سکتا۔'' میاں جی نے آہستہ سے بات کی۔

''اصل میں میاں جی! آج آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے خوشی ہی اس قدر ہورہی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔''

''چلو کرم دین! اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

''آجائیں میاں جی! آجائیں......'' کرم دین نے ایک طرف ہٹتے ہوئے میاں جی کے لیے راستہ بناتے ہوئے کہا۔

اب وہ دونوں پاس پاس بیٹھے تھے، کرم دین، میاں جی کے آنے پر بہت خوش تھا مگر ڈر بھی رہا تھا کہ اب میاں جی نہ جانے کیا کہہ دیں گے، وہ اس قدر سہما ہوا تھا کہ پریشانی کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔

کرم دین کی حالت میاں جی سے چھپی نہیں رہی تھی، وہ کچھ دیر تک اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتے رہے پھر بولے ''جب کچھ روز قبل پہلی بار تم مغرب کی نماز پڑھنے مسجد میں آئے تو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ تم میرے کئی بار پیغام بھجوانے پر بھی کبھی مسجد میں نہیں آئے تھے۔ اس روز تم آئے اور خاموشی سے نماز ادا کرکے لوٹ گئے، مگر میں مغرب سے عشاء تک یہی سوچتا رہا کہ تم عشاء کی نماز کے لیے بھی مسجد میں آؤ گے یا نہیں اور جب تم آئے تو جانتے ہو کرم دین، خوشی سے میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔ میں جانتا ہوں اس روز مسجد میں آنے پر لوگ تمہیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن میں نے شکرانے کے دو نفل ادا کیے اور خدا کے حضور دعا کی تھی کہ جس محبت، جذبے اور شوق سے تم مسجد میں آئے تھے وہی لگن ہمیشہ قائم رہے۔'' بات کرتے ہوئے میاں جی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے، انہوں نے رومال سے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا اور کہنے لگے۔ ''میں جانتا ہوں کوئی بھی محلے دار تم سے بات کرنے کو تیار نہیں، میں محسوس کرسکتا ہوں، گلی میں سے گزرتے ہوئے جب کوئی تمہیں دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہوگا تو تمہارے دل پر کیا بیتتی ہوگی۔ تمہیں کس قدر دکھ ہوتا ہوگا، مگر میں اتنا کہوں گا کہ تم نے خدا سے تعلق جوڑنے کی جو کوشش شروع کی ہے اسے ٹوٹنے مت دینا۔ ایک بار خالق سے تعلق جڑ گیا تو اس کی مخلوق بھی خود بخود تم سے ناتا جوڑ لے گی......''

بات کرتے ہوئے میاں جی رکے تو کرم دین بول پڑا ”میں نے کئی بار آپ سے بات کرنا چاہی مگر نہیں کر سکا میاں جی۔“

”مجھے معلوم ہے، تم ہر روز ہر نماز کے بعد مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کہہ نہیں پاتے تھے۔ تمہاری اسی بات نے کئی دنوں سے مجھے اس قدر پریشان کر رکھا تھا کہ آج میں خود چل کر یہاں آگیا ہوں۔ میں نے سوچا کہ سارے لوگ میرے پاس چل کر آتے ہیں، اگر میں کسی کے پاس جاؤں گا تو کیا فرق پڑ جائے گا“

”میاں جی۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا میں اتنا برا ہوں کہ لوگوں نے مجھ سے بات کرنا بھی چھوڑ دیا ہے کیا میرے گناہ اتنے زیادہ ہیں کہ مجھے معافی ہی نہ مل سکے؟“

”خدا کی ذات ہر بڑے سے بڑے گناہ کو معاف کر دینے والی ہے۔ مایوسی خود ایک گناہ ہے تم بھی مایوس مت ہو، اوپر والا سب ٹھیک کر دے گا۔“

”مجھے بھی معافی مل جائے گی ناں میاں جی؟“

”کیوں نہیں، جو بھی خدا سے سچے دل سے معافی مانگ لے خدا اسے ضرور معاف کر دیتا ہے۔ وہ غفور الرحیم ہے، معاف کر دینا تو اس کی صفات میں سے ایک ہے اور جب وہ خدا ہو کر معاف کر دیتا ہے تو مخلوق خدا کون ہوتی ہے کسی کو معاف نہ کرنے والی۔“ بات کرتے ہوئے میاں جی اٹھ کھڑے ہوئے، انہیں اٹھتے دیکھ کر کرم دین بھی اٹھ گیا۔

”اب میں چلتا ہوں کرم دین...... گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے...... پھر کسی روز بیٹھ کر بہت سی باتیں کریں گے......“ میاں جی نے اٹھتے ہوئے بات کی اور کرم دین کو گلے لگا لیا، میاں جی نے کرم دین کو اس قدر محبت سے اپنے سینے سے لگایا تھا کہ اسے اپنے سارے بدن میں ٹھنڈک سی محسوس ہونے لگی، اسے پہلی بار اس بات کا تجربہ ہو رہا تھا کہ آلِ رسول ﷺ کی قربت سے دل و جان کو کس قدر سکون ملتا ہے۔

میاں جی چلے گئے تھے، کرم دین انہیں دروازے تک چھوڑنے گیا تھا پھر دروازہ بند کر کے وہ واپس اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا تھا، کوئی انسان، انسانوں کی بستی میں رہتا ہو اور کسی انسان سے بات بھی نہ کر پائے، اس سے بڑھ کر اس کے لیے اور کیا تکلیف دہ بات ہو سکتی ہے، وہ یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ ایک عرصے کے بعد کسی نے اس قدر محبت سے اس سے بات کی تھی۔

......☆☆☆......

میاں جی نے شاید کسی نہ کسی طریقے سے مسجد میں آنے والے نمازیوں کو کرم دین کے بارے میں سمجھا دیا تھا، یہ اسی کا اثر تھا کہ اب کوئی مسجد میں آنے پر اسے چبھتی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھتا تھا، وہ مسجد میں آ کر وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کرتا تو وہ بھی اسے سلام کا جواب دیتے، نماز سے فارغ ہو کر سبھی نمازی ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے تو وہ بھی آگے بڑھ کر سب سے مصافحہ کرتا، وہ میاں جی سے مصافحہ کرتا تو وہ پیار سے اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے۔

”میاں جی! میرا دل چاہتا ہے کہ آج میں اپنے دل کی ساری باتیں، سارے دکھ، آپ کے سامنے کھول کر رکھ دوں۔“ سب نمازیوں کے جانے کے بعد موقعہ پا کر کرم دین نے بات شروع کی۔

”کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میاں جی نے شفقت بھرے انداز میں کہا۔

میاں جی کی طرف سے اشارہ پا کر کرم دین شروع سے آخر تک وہ سب کچھ بیان کرنے لگا جو حرف حرف سچ تھا، تھوڑی ہی دیر میں اس نے اپنی زندگی کی کتاب کے صفحات میاں جی کے سامنے کھول کر رکھ دیے تھے، اس نے وہ کچھ بھی بتا دیا تھا جو کسی اور کو معلوم نہیں تھا، وہ بولتا گیا، میاں جی غور سے سنتے رہے، جب وہ اپنی ساری کہانی سنا چکا تو میاں جی نے حیران ہو کر دریافت کیا ”تو اب تمہارا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟“

”اب تک تو جیسے تیسے دن کٹتے ہی رہے ہیں، مگر

اب اور دن نہیں گزر پائیں گے۔“

”تو پھر تم نے کچھ تو سوچا ہوگا؟“ میاں جی نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

”سوچنے کی مہلت ہی کہاں ملی ہے میاں جی۔ میں تو ایک عرصے سے پاگلوں جیسی زندگی گزارتا آیا ہوں اور کوئی پاگل اتنا کچھ کہاں سوچ سکتا ہے۔“

کرم دین کی باتوں نے میاں جی کو تڑپا کر رکھ دیا تھا، وہ کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے پھر بولے ”خدا سے لگاؤ لگائے رکھو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

......☆☆☆......

کرم دین نے میاں جی کو وہ سب کچھ بتا دیا تھا، جو وہ اب تک کرتا آیا تھا، مگر اس نے مبارک اور صابر والی بات چھپا لی تھی، یہی بات اس کے سینے میں کانٹے کی طرح چبھ گئی تھی، اسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ جب اس نے میاں جی سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا یہاں تک کہ اپنے بیوی بچوں کی موت کی ذمہ داری بھی قبول کر لی تھی تو پھر وہ مبارک کے پاگل پن اور صابر کی موت والی بات کیوں چھپا گیا تھا۔

وہ فجر کی نماز کے بعد اٹھ کر جانے لگا تو میاں جی نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور ایک وزیٹنگ کارڈ کرم دین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے ”کرم دین تم ایسا کرنا آج ان سے ملنا، انہیں میرا بتانا، میں نے ان سے تمہارے بارے میں بات کی ہوئی ہے، خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میاں جی نے پیار سے کرم دین کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دی تو کرم دین کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، سفید داڑھی کے ساتھ ساتھ سفید بھنوؤں والے آلِ رسول ﷺ شفقت بھرے لہجے میں اسے پیار سے حوصلہ دے رہے تھے، ان کے نرم ہاتھوں کا لمس پا کر اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے، اس نے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کر لیا اور یوں اس کے آنسو ہاتھوں میں ہی جذب ہو گئے اور بہنے سے بچ گئے۔

......☆☆☆......

گھر آتے ہی کرم دین نے سائیکل کو اچھی طرح صاف کیا، پھر ناشتے سے فارغ ہو کر میاں جی کا دیا ہوا وزیٹنگ کارڈ جیب میں ڈال کر گھر سے نکل گیا۔ فیکٹری اس کے لیے نئی نہیں تھی، وہ پہلے بھی کئی بار اس کے سامنے سے گزرا تھا اس لیے اسے وہاں پہنچنے میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

وہ اس شخص کے سامنے بیٹھا تھا جس کا کارڈ دے کر میاں جی نے اسے وہاں بھیجا تھا، وہ میاں جی کے کہنے پر چلا تو آیا تھا مگر اس خیال سے ڈر رہا تھا کہ وہ شخص نہ جانے کیسے کیسے سوالات کرے گا، وہ اس سے قبل بھی ملاقات کے لیے ایسے بہت سے لوگوں کے سامنے پیش ہو چکا تھا اور جانتا تھا کہ ایسے میں کیسے کیسے سوالات کیے جاتے ہیں، مگر خلاف توقع اس سے کسی قسم کا کوئی بھی سوال نہیں کیا گیا تھا اور مینجر کو بلا کر اسے ملازمت پر رکھنے کی ہدایات جاری کر دی گئی تھیں۔

جن حالات سے کرم دین گزر رہا تھا، اس کا خیال نہیں تھا کہ اب اسے کبھی سکھ کا کوئی پل نصیب ہو پائے گا، لیکن اب اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ وہ یونہی ادھر ادھر بھٹکتا رہا اور سکون ملا تو اس شخص کے ذریعے جسے نیچا دکھانے کا کوئی بھی موقعہ کبھی اس نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔

نماز پنجگانہ ادا کرنے اور قرآن پاک کی تلاوت کی برکات سے رفتہ رفتہ اس کی دماغی کیفیت بہتر ہونے لگی تھی، اب اسے اپنے ہی گھر میں ڈر بھی نہیں لگتا تھا، بیوی اور بچوں کے جگہ جگہ بکھرے ہوئے اعضاء دکھائی دینے سے بھی جان چھوٹ گئی تھی مگر اب دن رات یہ بات اسے ستانے لگی تھی کہ اس نے مبارک اور صابر والی بات میاں جی کو کیوں نہیں بتائی تھی۔

”میاں جی کچھ بوجھ اور بھی ہیں۔ جو ابھی تک میں اپنے سینے پر لیے پھرتا ہوں۔ وہ بوجھ کسی پل مجھے سکون سے بیٹھنے نہیں دیتے۔“ موقع پا کر کرم دین نے بلا تمہید

بات شروع کی۔
"کس بوجھ کی بات کر رہے ہو کرم دین؟" میاں جی نے حیران ہو کر دریافت کیا۔
"جس روز میں نے اپنے سینے میں دفن اپنی بے ترتیب زندگی کے سارے راز آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیے تھے۔ کچھ ایسی بھی باتیں تھیں جو اس روز میں آپ کو بتا نہیں پایا تھا' مگر اب وہی باتیں میرے سینے پر بوجھ بن گئی ہیں، جنہیں اٹھاتے اٹھاتے میں تھک گیا ہوں۔"
"ڈرو نہیں۔ اگر کوئی ایسی بات ہے تو وہ بھی بتا ڈالو۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"
"میاں جی مبارک کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔"
"ہاں! وہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے اور اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔"
"جی میاں جی! وہی مبارک' اسے اس حالت تک پہنچانے والا میں ہوں۔ میں نے ہی بابا سائیں کے کہنے پر اپنے سر سے کالے علم کا بوجھ اتارنے کے لیے چلہ کاٹنے کے لیے اسے تیار کیا تھا۔ جہاں سے ڈر کر وہ بھاگا اور اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔"
"بس یہی بوجھ تھا یا کچھ اور بھی ہے؟" میاں جی نے انتہائی افسردہ لہجے میں سوال کیا۔
"ایک بوجھ اور بھی ہے میاں جی۔"
"وہ کیا؟"
"جس نوجوان کی لاش قبرستان سے ملی تھی...... اس کی موت کا سبب بھی میں ہی بنا تھا۔"
"تم کہیں صابر کی بات تو نہیں کر رہے؟"
"جی میاں جی! وہ بھی کالا علم سیکھنا چاہتا تھا' محض اسے پرکھنے کی غرض سے میں اسے قبرستان لے گیا تھا مگر وہ انتہائی ڈرپوک نکلا اور۔" اس سے آگے کرم دین کوئی بات نہ کر سکا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔
کرم دین، میاں جی کو جھٹکے پہ جھٹکے دے رہا تھا، وہ سر کو پکڑے گردن جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے، یہ باتیں ان کے لیے غیر متوقع تھیں، اس لیے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں، کرم دین کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ "جو سچ تھا وہ میں نے بتا دیا۔ اب میرے جرموں کی جو بھی سزا ملے، میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔"
میاں جی نے کرم دین کی بات سن لی تھی مگر ان سے بات نہیں ہو پا رہی تھی، کرم دین اب اس انتظار میں تھا کہ میاں جی اس سلسلے میں کیا فیصلہ سناتے ہیں، کچھ دیر تک دونوں ہی خاموشی سے گردن جھکائے بیٹھے رہے، پھر میاں جی نے ایک لمبی سانس چھوڑی اور بولے۔
"میں تمہیں لے کر خود ان کے گھر جاؤں گا۔ ان دونوں کے والدین جو بھی فیصلہ کریں گے وہ تمہیں ماننا ہوگا۔"
"مجھے منظور ہے میاں جی!" کرم دین نے افسردہ لہجے میں بات کی۔
کرم دین جو بوجھ دل پہ اٹھائے پھرتا تھا اس نے وہ بھی اتار ڈالا تھا، وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اب آگے چل کر اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا مگر اندر سے مطمئن تھا، میاں جی نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ ذہنی طور پر تیار رہے، جس روز بھی صابر اور مبارک کے گھر جانا ہو گا وہ اسے بتا دیں گے۔
میاں جی نے اس معاملے میں تین چار روز تک ہر پہلو پر غور کیا تھا، ہر بات کو سچ کے پلڑے میں ڈال کر دیکھا تھا، تب کہیں جا کر فیصلہ کیا تھا کہ اس معاملے پر پردہ ڈالنے کی بجائے ان دونوں کے ہاں جانا بہتر ہے، اس کے لیے انہوں نے عشاء کی نماز کے بعد کا وقت مقرر کیا تھا، کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ دن کے اجالے میں ان کے ہاں جائیں اور خواہ مخواہ وہاں لوگ جمع ہونے پر کوئی تماشہ بنے۔
☆☆☆......
کرم دین گردن جھکائے میاں جی کے ساتھ ساتھ اس مجرم کی طرح چل رہا تھا، جسے پولیس والے ہتھکڑی لگا کر عدالت میں پیش کرنے کے لیے لے جا رہے ہوں۔ میاں جی کرم دین کو لے کر مبارک کے ہاں پہنچے

تھے، ان کے دروازے پر پہنچتے ہی میاں جی نے دروازے پر لگی گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا، دروازہ اللہ داد نے کھولا تھا، دروازے پر میاں جی کو دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا میاں جی بول پڑے...... "میں تمہارے ساتھ کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔ میرے ساتھ کرم دین بھی آیا ہے، اگر تم کہو تو اندر بیٹھ کر بات کریں۔"
اللہ داد کے لیے میاں جی کا اس کے گھر آنا کسی اعزاز سے کم نہیں تھا، وہ انہیں اندر لے جانے سے بھلا کیسے انکار کر سکتا تھا۔
"میاں جی! یہ آپ ہی کا گھر ہے اجازت کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ آجائیں۔" اللہ داد بات کرتے ہوئے انہیں ساتھ لے کر چل پڑا۔
اللہ داد نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور انہیں اندر بٹھا دیا، پھر میاں جی کے کہنے پر اس نے فاطمہ کو بھی وہیں بلا لیا، میاں جی کے ساتھ کرم دین کو دیکھ کر کچھ کچھ بات فاطمہ کی سمجھ میں آنے لگی تھی، مگر اللہ داد مکمل طور پر بے خبر تھا، کیونکہ مبارک کے دماغی توازن کھو بیٹھنے کے پیچھے جو کہانی تھی، فاطمہ نے اسے اللہ داد سے ابھی تک چھپا رکھا تھا، وہ بیٹے کی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر رو لیتی تھی مگر اس بات کی ہوا اپنے شوہر کو نہیں لگنے دیتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اللہ داد یہ سن کر بھڑک اٹھے گا اور پھر نہ جانے غصے میں آ کر کیا کر بیٹھے۔
"میاں جی! کوئی چائے پانی لاؤں آپ کے لیے؟" فاطمہ نے بیٹھتے ہی دریافت کیا۔
"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ تم یہ بتاؤ مبارک کی حالت اب کیسی ہے؟"
میاں جی کے منہ سے مبارک کا نام سن کر فاطمہ کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور ماتھے پر پسینہ آ گیا، وہ یہ سوچ کر کانپنے لگی تھی کہ جس راز کو اس نے اب تک اپنے خاوند سے چھپائے رکھا وہ کھلنے ہی والا تھا، کیونکہ کرم دین کی موجودگی اس کے لیے کسی خطرے سے خالی نہیں تھی۔
"اب تو کافی بہتر ہے۔ شروع شروع میں بہت ڈرتا تھا لیکن اب وہ پہلے والی حالت نہیں رہی۔ علاج ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ جب اس کے دل سے وہ ڈر ختم ہو جائے گا، جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے تو یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔" فاطمہ نے اس خوف سے تفصیلی جواب دیا کہ کسی طرح بات ٹل جائے۔
"مبارک اب ہے کہاں؟"
"اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ہے۔"
"میں کرم دین کو ساتھ لایا تھا۔"
"یہ بھی اپنا ہی ہے میاں جی۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو اسے بھی ساتھ لے آئے۔"
میاں جی بات کھولنا چاہ رہے تھے مگر فاطمہ نے جان بوجھ کر انہیں بات پوری نہ کرنے دی اور درمیان میں ہی بول پڑی اور خاوند کی نظروں سے بچ کر میاں جی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے، مگر میاں جی سمجھ نہیں پائے تھے، اس لیے پھر بولے "اصل میں کرم دین کا یہ کہنا ہے کہ۔"
"کرم دین بھی ٹھیک ہی کہتا ہوگا' مگر اس کا علاج ہم جس ڈاکٹر سے کروا رہے ہیں اس نے ہمیں پوری تسلی کروائی ہے کہ مبارک ٹھیک ہو جائے گا۔" فاطمہ نے ایک بار پھر میاں جی کی بات کاٹی تھی اور خاوند سے بچ بچا کر پھر سے ہاتھ جوڑے تھے، اس بار فاطمہ کے جڑے ہوئے ہاتھوں پر میاں جی کی نظر پڑ گئی تھی، وہ کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے ہی والے تھے کہ اچانک مبارک وہاں آ گیا، اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور ہاتھ میں اینٹ پکڑ رکھی تھی، وہ آتے ہی کرم دین کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا، اسے دیکھ کر فاطمہ اور اللہ داد اس کی طرف دوڑے مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی مبارک نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اینٹ کرم دین کے سر پر دے ماری، اینٹ لگنے سے کرم دین کے سر سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے

تھے، مبارک کو اس بات کی ذرا بھی پروا نہ تھی، وہ ابھی تک وہیں تنا کھڑا تھا، فاطمہ اور اللہ داد اسے پکڑنا چاہتے تھے مگر کرم دین نے انہیں روک دیا اور سر سے بہنے والے خون کی پروا کیے بغیر آگے بڑھ کر مبارک کو اپنے سینے سے چمٹا لیا، میاں جی بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور مبارک کی پیٹھ پر پیار سے تھپکیاں دینے لگے تھے۔

کچھ دیر تک کرم دین نے اسی طرح مبارک کو اپنے سینے سے لگائے رکھا، اب اس کا تنا ہوا بدن ڈھیلا پڑ گیا تھا اور احساس ندامت سے سر بھی جھک گیا تھا، اور وہ اینٹ جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی، اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گری تھی۔

فاطمہ نے آگے بڑھ کر مبارک کو سنبھال لیا تھا، لیکن کرم دین کے سر سے بہنے والا خون اس کے کپڑوں پر بھی لگ گیا تھا۔

"تم اسے لے کر اندر چلو۔ میں کرم دین کے سر پر کوئی کپڑا باندھ دیتی ہوں تاکہ خون بہنے سے رک جائے۔" فاطمہ نے بیٹے کو خاوند کے حوالے کرتے ہوئے کہا اور اللہ داد بیٹے کو بازوؤں سے پکڑ کر اندر لے گیا۔

"خدا کے لیے اس بات کو یہیں دفن کر دیں میاں جی۔" اللہ داد کے کمرے سے نکلتے ہی فاطمہ نے میاں جی کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بات شروع کی "جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ کرم دین نے مبارک کو زبردستی چلہ کاٹنے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔ اس میں مبارک کی اپنی مرضی شامل تھی اور اس معاملے میں، میں بھی اس کے ساتھ شریک تھی۔ خدا کے لیے مبارک کے باپ کے سامنے اس بات کا ذکر نہ کیجیے گا، ورنہ یہاں قیامت ٹوٹ پڑے گی، اگر کرم دین آپ کے ساتھ معافی مانگنے آیا ہے تو میں نے اسے دل سے معاف کیا۔"

کرم دین کے سر سے بہت سا خون بہہ گیا تھا، فاطمہ جلدی سے ایک کپڑا اور کچھ روئی لے آئی، جہاں سے خون بہہ رہا تھا، اس نے وہاں تھوڑی سی روئی رکھ کر کپڑے کی پٹی بنا کر باندھ دی تھی اور باقی روئی سے اس کے ماتھے اور چہرے پر لگے ہوئے خون کو صاف کرنے لگی تھی، تھوڑی دیر بعد اللہ داد بھی مبارک کو لٹا کر وہیں آ گیا تھا، اس کے آتے ہی میاں جی بھی اٹھ کھڑے ہوئے، انہیں اٹھتے دیکھ کر کرم دین بھی اٹھ گیا تھا۔

"لو بھئی اللہ داد ہم چلتے ہیں۔ خدا تمہارے بیٹے کو صحت دے۔"

"میاں جی آپ آئے، مگر کچھ کھایا نہ پیا۔" اللہ داد نے میاں جی کو اٹھتے دیکھ کر کہا۔

"بس جس کام کے لیے آئے تھے وہ تو ہو گیا۔ کیا کھانا اور کیا پینا۔" میاں جی نے اللہ داد سے بات کی تھی، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا جبکہ فاطمہ نے میاں جی کا کہا ہوا ایک ایک لفظ پوری طرح جان لیا تھا۔

وہ دونوں وہاں سے نکلے تو کافی رات ہو چکی تھی۔ "کرم دین! اب واپس اپنے اپنے گھروں کو چلتے ہیں۔ خون بہہ جانے سے تمہیں کمزوری بھی محسوس ہو رہی ہو گی اور تمہارے کپڑوں پر بھی جگہ جگہ خون کے داغ لگے ہوئے ہیں، ایسی حالت میں صابر کے گھر جانا مناسب نہیں لگتا، پھر کسی روز چلیں گے۔" میاں جی نے مبارک کے ہاں سے نکلتے ہی بات کی۔

"جو آپ کا حکم میاں جی!" کرم دین نے کسی سعادت مند بچے کی طرح میاں جی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا اور پھر بولا "چلیں۔ میں آپ کو گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔ اندھیرے کی وجہ سے کہیں آپ ٹھوکر کھا کر گر نہ جائیں۔" یہ کہتے ہوئے کرم دین نے میاں جی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کے گھر کی طرف چل پڑا۔

میاں جی گھر میں داخل ہونے لگے تو بولے "کرم دین اللہ اللہ کیا کرو اور ساتھ ہی ساتھ استغفر اللہ، استغفر اللہ بھی پڑھتے رہا کرو۔"

"ٹھیک ہے میاں جی! ضرور پڑھوں گا۔" کرم دین نے میاں جی سے وعدہ کیا اور خدا حافظ کہتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

......☆☆☆......

ایک بوجھ ذہن سے اتر گیا تھا اور دوسرا ابھی باقی تھا، سر کا زخم بھرنے میں کئی دن لگ گئے تھے مگر وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ مبارک نے دیوانگی میں ہی سہی، اس کے سر پر اینٹ مار کر اپنا غصہ اتار لیا تھا، اسے اس بات کا بھی اطمینان تھا کہ مبارک کی حالت رفتہ رفتہ بہتر ہو رہی تھی، اس کے دل سے مبارک کی صحت یابی کے لیے دعا نکلتی تھی، تاکہ اکلوتے بیٹے کی وجہ سے اس کے ماں باپ جس پریشانی سے گزر رہے تھے، انہیں اس سے نجات مل سکے۔

مبارک کے متعلق سوچتے ہوئے کرم دین اپنے ماضی میں جھانکنے لگا تھا، وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا، اس نے کبھی ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت پانے کی خواہش میں کس کس کو روندتا چلا آیا تھا، کتنے گھر اجڑے تھے اور کتنے ہی گھروں میں صف ماتم بچھی تھی، ماں کے بعد عائشہ بھی اسے ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنے کا درس دیتی رہی مگر اس نے شکر ادا کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔

وہ چارپائی پر بیٹھا تھا، اس نے دور کہیں سے پازیب کی آواز سنی تھی، مگر ادھر ادھر نظر دوڑانے پر بھی اسے وہاں کوئی دکھائی نہیں دیا تھا، پازیب کی آواز آہستہ آہستہ قریب ہوتی جا رہی تھی، دور سے اسے کوئی لڑکی اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دی تھی، وہ لڑکی ابھی کافی فاصلے پر تھی مگر کرم دین نے اسے پہچان لیا تھا، وہ اس بات سے آگاہ تھی کہ پازیب کی چھن چھن کرم دین کی کمزوری تھی، اسی لیے وہ جان بوجھ کر پازیب پہن کر اس سے ملنے آئی تھی، وہ ایک مدت کے بعد اسے دیکھ رہا تھا، پازیب کی چھن چھن اسے مدہوش کر رہی تھی، اسے دیکھتے ہی کرم دین کے بدن میں نشہ سا چھا گیا تھا اور وہ اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اب وہ اس قدر قریب آ کھڑی ہوئی تھی کہ اس کے سانسوں کی خوشبو اسے دیوانہ کر رہی تھی، اس کے چہرے کی معصومیت اور پاکیزگی کرم دین کی بے قراری میں مزید اضافہ کر رہی تھی، کرم دین نے اسے سینے سے لگانے کے لیے اپنی بانہیں پھیلا دی تھیں، مگر وہ آگے بڑھنے کی بجائے دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"اس قدر بے رخی بھی اچھی نہیں ہوتی عائشہ۔"

"تمہیں اس بات کی کب سے پروا ہونے لگی۔"

"ایسا نہ کہو عائشہ! تم میرا پیار ہو، میری محبت، میرا عشق، میرا جنون ہو تم۔"

"سب جھوٹ۔ تمہیں مجھ سے نہیں دولت سے عشق تھا۔ تم نے مجھ سے پیار کیا ہی کب تھا۔ دولت ہی تمہاری پہلی اور آخری محبت تھی۔"

"میری غلطیوں کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔"

"تم تو اپنی ہی دنیا میں مست تھے۔ سزا تو میں نے بھگتی ہے۔"

"بس عائشہ بس، اب لوٹ آؤ۔ اب مجھ سے تنہا جیا نہیں جاتا۔"

"اب کیوں پریشان ہوتے ہو۔ یہ تنہائیاں تو تمہاری اپنی خریدی ہوئی ہیں۔"

"میں بکھر کر رہ گیا ہوں عائشہ! کیا تم مجھے سمیٹ نہیں سکتی؟"

"نہیں، اب یہ میرے لیے ممکن نہیں۔ میں تم سے بہت دور جا چکی ہوں، اب کبھی تم مجھے بلانا بھی چاہو گے تو بلا نہیں پاؤ گے۔" عائشہ نے بات کی اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی، کرم دین نے آگے بڑھ کر اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے دوڑ لگا دی، وہ بھی اس کے پیچھے دوڑا تھا مگر اسے چھو نہیں پایا تھا اور وہ چلی گئی تھی، اسی لمحے کرم دین کی آنکھ کھل گئی تھی، اب بھی اس کی نگاہیں عائشہ کو تلاش کر رہی تھیں مگر وہ تو کب کی جا چکی تھی۔

ایک عرصے کے بعد ایسی رات آئی تھی جب وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا، ورنہ وہ سکون کی نیند سونے لگا تھا، اگر کبھی اسے نیند نہ بھی آ رہی ہوتی تو وہ تسبیح کرنے لگتا تھا، ایسا کرنے سے اسے اس قدر سکون ملتا کہ وہ

کچھ ہی دیر میں سو جاتا تھا، مگر یہ رات خود کو لعنت ملامت کرتے ہوئے گزر رہی تھی، اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا، اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور وہ بچوں سے ملنے کے لیے تڑپ اٹھا تھا۔

اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس کے سسرال والے اس سے کیا سلوک کریں گے، اس نے دروازے کی گھنٹی بجادی تھی۔

''کون؟'' اندر سے پوچھا گیا تھا۔

''میں کرم دین ہوں۔''

کرم دین کا نام سن کر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تھا اور خاموشی چھائی رہی تھی۔ ''دروازہ کھولو میں کرم دین ہوں۔'' کرم دین نے کچھ دیر انتظار کے بعد پھر سے کہا۔

''اب کیا لینے آئے ہو یہاں؟'' اس بار اس کی ساس نے سوال کیا تھا۔

''میں اپنے بچوں سے ملنے آیا ہوں چاچی۔''

''کون سے بچے؟''

''میرے بچے! عمر اور ماجدہ۔''

''جب ہماری بچی نہیں رہی تو ان سے بھی تمہارا کوئی تعلق نہیں رہا۔''

''بس ایک بار انہیں دیکھ لینے دو چاچی...... پھر میں چلا جاؤں گا۔''

''ایسا ممکن نہیں۔ تم جا سکتے ہو۔'' بات کرتے ہی غفوراں وہاں سے چلی گئی تھی۔

کرم دین نے باہر کھڑے اس کے قدموں کی آواز سنی تھی، جو آہستہ آہستہ دور ہوتے چلے گئے تھے، وہ کچھ دیر تک اس امید پر وہیں کھڑا رہا کہ شاید دروازہ کھل جائے، اس نے ایک دو بار پھر سے ڈور بیل بھی بجائی تھی مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا تھا اور وہ مایوس ہو کر وہاں سے واپس چل پڑا تھا۔

وہ گھر پہنچا تو اسے پیٹ میں شدید درد محسوس ہوا تھا، وہ کچھ دیر تک برداشت کرتا رہا مگر درد کی شدت بڑھتی جا رہی تھی، پھر اوپر تلے اسے کئی بار موشن آئے اور وہ نڈھال ہو کر چارپائی پر گر گیا، وہ دیر تک اسی کیفیت میں لیٹا رہا پھر ہمت جمع کی اور ڈاکٹر کے پاس چلا گیا، اس کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر نے اسے دوائی دینے کے ساتھ ساتھ کچھ ٹیسٹ بھی لکھ دیے تھے۔

دوائی لینے سے جب طبیعت کچھ سنبھل گئی تو اس نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق قریب ہی لیبارٹری میں بلڈ اور یورین کے مطلوبہ ٹیسٹ کروانے کے لیے دے دیے تھے، ڈاکٹر کا شک درست ثابت ہوا تھا، رپورٹ آنے پر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا اور اس نے کرم دین کو مکمل علاج کروانے کا مشورہ دیا تھا۔

......☆☆☆......

میاں جی کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اس رات مبارک کے گھر میں کچھ بھی ہو سکتا تھا، اس لیے انہوں نے کسی بھی قسم کی بدمزگی سے بچنے کے لیے فیصلہ کیا تھا کہ صابر کے گھر جانے کی بجائے اس کے والدین کو اپنے پاس بلا لیا جائے انہوں نے دن میں ہی ان کے ہاں پیغام بھجوا دیا تھا کہ بہت ضروری بات کرنی ہے اس لیے وہ عشاء کی نماز کے بعد آ جائیں میاں جی نے اپنے اس پروگرام کے متعلق کرم دین کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔

مرحوم صابر کی والدہ اور والد کے ساتھ اس کا بھائی نادر بھی چلا آیا تھا، میاں جی اور کرم دین بھی موجود تھے، صابر کے اہل خانہ ابھی تک اپنے وہاں بلائے جانے کا سبب نہیں جانتے تھے، مگر وہاں کرم دین کی موجودگی نے ان کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

''تم لوگ یقیناً یہ سوچ کر پریشان ہو رہے ہو گے کہ آج میاں جی نے ہمیں یہاں کس مقصد کے لیے بلایا ہے؟'' میاں جی بات کرتے ہوئے رکے پھر خود ہی بولے ''دراصل میں تم لوگوں سے مرحوم صابر کے بارے میں کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا تھا۔''

میاں جی کے منہ سے صابر کا نام سن کر اس کے والدین اور بھائی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، وہ تینوں ہی اس سوچ میں پڑ گئے تھے کہ میاں جی، صابر کے بارے میں ایسی کون سی بات کرنے والے تھے، جس کے لیے انہوں نے رات کی تاریکی میں انہیں وہاں بلوایا تھا، ان کے دل میں طرح طرح کے خیالات جنم لے رہے تھے اور وہ بے چینی سے یہ سننے کے لیے منتظر تھے کہ میاں جی اب کیا کہتے ہیں جبکہ میاں جی بات شروع کرنے کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش میں خاموش بیٹھے تھے، ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ بات کا آغاز کہاں سے کیا جائے، انہوں نے آنکھوں سے اپنی موٹے شیشوں والی عینک اتاری اور جیب سے رومال نکال کر اسے صاف کرنے لگے، اس کمرے میں پانچ افراد موجود تھے مگر خاموشی اس قدر گہری تھی کہ ان کے سانس لینے کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں، پھر جیسے میاں جی کو وہ الفاظ مل گئے جن کی انہیں تلاش تھی اور بولے۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ صابر کی موت کس طرح واقع ہوئی؟''

میاں جی کا سوال سن کر تینوں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''لیکن کرم دین جانتا تھا۔''

''کرم دین؟'' تینوں نے ایک ہی وقت میں حیران ہو کر دریافت کیا۔

''ہاں۔ کیونکہ اس روز کرم دین ہی صابر کو قبرستان لے گیا تھا۔''

میاں جی کی بات سن کر صابر کے گھر والوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے، پھر جیسے نادر کو کچھ ہوش آ گیا اور وہ دہاڑا۔ ''تم نے میرے بھائی کو مارا؟ تم نے؟ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے نادر بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور میاں جی کے پاس بیٹھے ہوئے کرم دین پر جھپٹ پڑا، یہ حملہ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ کرم دین کو سنبھلنے کا بھی موقعہ نہ مل سکا، نادر نے اسے نیچے گرا لیا اور اس کے چہرے اور گردن پر گھونسے مارنے لگا، میاں جی اور نادر کے والدین نے مل کر اسے ایسا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی بھی طرح ان کے قابو میں نہیں آ رہا تھا اور جہاں موقعہ ملتا کرم دین کے جسم پر ضربیں لگا رہا تھا، ان تینوں نے مل کر جیسے تیسے سمجھا بجھا کر بمشکل نادر کو قابو میں کیا، جبڑے پر گھونسے لگنے سے کرم دین کے دانتوں سے خون بہنے لگا تھا مگر نادر کو اس کی کوئی پروا نہ تھی۔

''میری ایک بات یاد رکھنا۔ اب تم میرے ہاتھوں سے نہیں بچ پاؤ گے۔'' نادر ان تینوں کی گرفت میں تھا پھر بھی اچھل اچھل کر کرم دین کو دھمکیاں دے رہا تھا۔

''تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے ہو۔ پہلے سکون سے بیٹھ کر پوری بات جان لو پھر جو دل میں آئے وہ کرنا۔ ایک انسان محض خوف خدا کی وجہ سے صابر کی موت کی حقیقت تم لوگوں کے سامنے لانا چاہ رہا ہے اور تم اس کی بات سننے کی بجائے اسے جانوروں کی طرح پیٹنے لگ گئے، جہاں اتنا عرصہ گزر گیا اور تم کچھ جان نہیں پائے اور شاید تم نے کبھی جاننے کی کوشش بھی نہیں کی ہو گی، اگر وہ اب بھی خاموش رہتا تو تم کیا کر لیتے؟'' میاں جی نے نادر کو اپنے پاس بٹھا کر پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میاں جی۔ آپ جو بھی بتانا چاہتے ہیں وہ مجھے بتائیں۔'' میاں جی کی بات سن کر صابر کے والد نے کہا اور پھر نادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ اس کی طرف سے بے فکر رہیں۔ اب یہ کچھ نہیں بولے گا۔''

''میں بتانا یہ چاہ رہا تھا کہ صابر خود اپنی مرضی سے چل کر کرم دین کے پاس گیا تھا۔ وہ جنات کو قابو کرنے کے لیے اس سے عملیات سیکھنا چاہتا تھا۔ کرم دین محض اس کی بہادری کا امتحان لینے کے لیے اس رات اسے وہاں لے گیا تھا، قبرستان کے جس کونے سے صابر کی لاش ملی، وہاں رات کے سناٹے میں اسے محض لکڑی کا کیل ٹھونک کر واپس آنے کو کہا تھا، وہاں کیل ٹھونکتے ہوئے اندھیرے کی وجہ سے اس کی چادر بھی پھنس گئی اور

جب وہ اٹھا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی جن بھوت یا چڑیل نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا ہے اور وہ ڈر کر وہیں گر پڑا اور یوں اس کی موت واقع ہوگئی۔ تب سے کرم دین اپنے دل پر یہ بوجھ لیے پھرتا رہا، کیونکہ سچ بتانے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔"

میاں جی نے تمام تفصیل بیان کی تو مرحوم صابر کے والدین کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، جوان بیٹے کی موت کا زخم پھر سے تازہ ہوگیا تھا اور وہ روئے جا رہے تھے جبکہ نادر مسلسل کھا جانے والی نظروں سے کرم دین کو گھور رہا تھا، کچھ دیر تک صابر کے والدین آنسو بہاتے رہے، پھر خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے چل دیے، نادر بھی ان کے ساتھ ساتھ ہولیا تھا، مگر میاں جی نے جان بوجھ کر انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"میں جاؤں میاں جی؟" کچھ دیر بعد کرم دین نے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اب تم بھی جا کر آرام کرو۔ پریشان نہیں ہونا، سچ کی راہ پر چلتے ہوئے اس طرح کی مشکلات پیش آجایا کرتی ہیں لیکن پریشانیوں سے گھبرا کر کبھی حق کی راہ مت چھوڑنا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ساری رکاوٹیں خود بخود دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔"

کرم دین نے میاں جی کی بات توجہ سے سنی اور پھر کچھ کہے بغیر گردن ہلا کر خاموشی سے وہاں سے نکل گیا۔

گھر پہنچ کر کرم دین بہت رویا، اسے اپنے آنسوؤں پر کوئی قابو نہیں رہا تھا، وہ رونا نہیں چاہتا تھا مگر آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے، وقت نے اسے اس قدر تنہا کر ڈالا تھا کہ کوئی اسے چپ کروانے اور آنسو صاف کرنے والا بھی نہیں رہا تھا، رات اسی کیفیت میں کٹ گئی تھی اور مسجدوں سے فجر کی اذان کی آوازیں آنے لگی تھیں، اذان کی آواز سن کر کرم دین نماز کے لیے تیاری کرنے لگا، وہ مسجد کے لیے گھر سے نکلنے والا تھا کہ کوئی دروازے کو پیٹنے لگا، اس نے دروازہ کھولا تو وہاں پولیس کی وردی پہنے کچھ اہل کار کھڑے تھے، نادر بھی ان کے ہمراہ تھا، پولیس کے ساتھ نادر کو کھڑا دیکھ کر ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

"ہم تمہیں صابر کے قتل کے جرم میں گرفتار کرنے آئے ہیں۔" ایک پولیس اہل کار کی آواز کرم دین کے کانوں میں پڑی۔

"اگر اجازت ہو تو میں نماز پڑھ لوں؟"

"نماز اب تھانے میں ہی پڑھنا۔"

"میں دروازے پر لگانے کے لیے اندر سے تالا لے آؤں۔"

"تم اس کے ساتھ جاؤ۔ یہ کہیں بھاگ ہی نہ جائے۔" حوالدار نے ایک سپاہی سے مخاطب ہو کر کہا۔

حوالدار کا حکم سن کر وہ سپاہی کرم دین کے ساتھ ہو لیا، کرم دین نے اندر کے دروازوں کی کنڈیاں لگا کر ان پر تالے لگائے تمام بلب بند کیے اور دروازے پر لگانے والا تالا لے کر باہر آگیا، تب تک وہاں کچھ محلے دار بھی جمع ہو گئے تھے اور بڑے شوق سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

کرم دین کو فجر کی نماز کے وقت مسجد میں نہ پا کر میاں جی کو تشویش ہوئی تھی مگر انہوں نے کسی نمازی سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی، میاں جی جانتے تھے کہ کرم دین ظہر اور عصر کی نمازیں فیکٹری ہی میں ادا کرتا تھا جبکہ دوسری نمازیں باجماعت ادا کرنے وہ باقاعدگی سے مسجد میں ہی آتا تھا، انہیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ جب سے کرم دین نے نماز ادا کرنا شروع کی تھی، تب سے اس نے کبھی کوئی نماز قضا نہیں کی تھی، یہی سوچ کر ان کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔

نماز سے فارغ ہو کر تمام نمازی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے اور قرآن پاک پڑھنے کے لیے میاں جی کے پاس آنے والے بچے اپنا اپنا سبق یاد کر رہے تھے، میاں جی کو کرم دین کی فکر لگی ہوئی تھی، آخر ان سے رہا نہ گیا اور انہوں نے ایک لڑکے کو بلا کر کرم دین کے

بارے میں جاننے کے لیے اس کے گھر بھیج دیا، وہ لڑکا تھوڑی ہی دیر میں واپس آگیا اور آکر اطلاع دی کہ اس کے گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔

یہ بات اور بھی پریشان کر دینے والی تھی کہ رات کو عشاء کی نماز کے بعد بھی وہ دیر تک ان کے پاس تھا پھر وہ صبح صبح کہاں چلا گیا تھا، دن چڑھ آیا تھا، قرآن پاک پڑھنے کے لیے آئے ہوئے بچے بھی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونے لگے تھے میاں جی نے دو تین لڑکوں کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ کسی طرح کرم دین کے متعلق معلومات حاصل کر کے آئیں۔

لڑکوں نے واپس آنے میں کافی دیر لگا دی تھی، ان کی واپسی تک میاں جی مسجد میں ہی بیٹھے انتظار کرتے رہے، یہ بات میاں جی کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی کہ پولیس قتل کے الزام میں کرم دین کو گرفتار کر کے تھانے لے گئی تھی۔

......☆☆☆......

کرم دین نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں کبھی اسے اس طرح کے حالات سے گزرنا پڑے گا مگر تھوڑے ہی عرصے میں اس نے میاں جی سے ہر حال میں خدا کی رضا جان کر صبر اور شکر ادا کرنا سیکھ لیا تھا، اسے قتل کے جرم میں سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا مگر وہ اسے بھی خدا کی رضا جان کر سکون سے ایک طرف بیٹھا خدا کو یاد کر رہا تھا، وہ خدا جو اس کی تمام تر نافرمانیوں کے باوجود اسے بھولا نہیں تھا۔

میاں جی کو اس قدر دکھ پہنچا تھا کہ انہیں گھر میں بیٹھنا مشکل ہوگیا، وہ صورت حال جاننے اور کرم دین کو تسلی دینے کے لیے خود تھانے پہنچ گئے، ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی وجہ سے میاں جی خود چل کر تھانے آئے تھے، علاقے کے سبھی لوگ آل رسول ﷺ میں سے ہونے کی وجہ سے انہیں جانتے تھے اور ان کی دل سے قدر کرتے تھے، تھانے دار سے لے کر سپاہیوں تک سارا عملہ ان کے آگے بچھا جا رہا تھا۔

تھانے دار نے انتہائی احترام کے ساتھ انہیں اپنے سامنے والی کرسی پر بٹھایا اور خود ان کے سامنے باادب کھڑا ہو کر بولا۔

"مجھے بلا لیا ہوتا میاں جی! آپ نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں کی؟"

"کبھی کبھی ایسے حالات بھی پیدا ہو جاتے ہیں برخوردار کہ خود آئے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔"

"آپ حکم کریں میاں جی! آپ کی خدمت کے لیے تو ہم جی جان سے حاضر ہیں۔"

"میں یہاں کرم دین کے لیے آیا ہوں۔"

"اوئے سنا نہیں تم نے، جلدی سے کرم دین کو یہاں لے آؤ۔" تھانے دار نے پاس کھڑے سپاہی کو رعب سے حکم دیا، سپاہی نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور کرم دین کو لے آیا، کرم دین سلاخوں کے پیچھے سکون سے بیٹھا تسبیح کر رہا تھا، کوئی فکر اور پریشانی اس کے چہرے پر دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر اس نے میاں جی کو دیکھا تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میاں جی اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے اپنے سینے سے لگا کر پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دینے لگے "تم ابھی سے گھبرا گئے کرم دین۔ سچ کی راہ پر چل پڑے ہو تو ہمت رکھو۔ اس راہ پر چلتے ہوئے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ کامیابی ہمیشہ انہیں کے حصے میں آتی ہے۔"

میاں جی کے سمجھانے سے کرم دین کی ہمت بندھ گئی تھی، اس لیے اس نے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا اور سکون سے میاں جی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"برخوردار! تم مقتول صابر کے ورثاء کو بھی یہیں بلا لو تاکہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات ہو سکے۔" میاں جی نے تھانے دار کو دیکھتے ہوئے کہا، جو ابھی تک میاں جی کے احترام میں ان کے سامنے باادب کھڑا تھا اور میاں جی کے کہنے پر بھی اپنی کرسی پر نہیں بیٹھا تھا۔

"میاں جی! آپ گھر چلیں، میں تھوڑی ہی دیر میں ان سب کو لے کر وہیں حاضر ہو جاؤں گا، آپ چاہیں تو کرم دین کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔" تھانے دار نے بات کی۔

"یہ بات تھانے میں ہی ہو تو اچھا ہے۔ ویسے بھی میں وہاں محلے میں اس بات کا تماشہ نہیں بنانا چاہتا۔"

"جیسے آپ کی خوشی، میاں جی!"

تھانے دار کے حکم پر ایک اے ایس آئی اور دو سپاہی گئے اور کچھ ہی دیر بعد نادر اور اس کے والد، نذیر کو تھانے میں لے آئے ان دونوں نے تھانے دار کے کمرے میں کرم دین کے ساتھ میاں جی کو دیکھا تو پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکے مگر انہوں نے کوئی بات نہ کی اور خاموشی سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"میں نے رات کو تم لوگوں کو اپنے پاس بلا کر کس قدر پیار سے سمجھایا تھا مگر شاید تمہیں میری باتیں اچھی نہیں لگیں۔" میاں جی نے نادر اور اس کے والد کو دیکھ کر بات کی۔

"جن کا جوان بیٹا قتل ہوا ہو وہ خاموشی سے تو نہیں بیٹھ سکتے میاں جی!" نادر بول پڑا۔

"تم کیا کہتے ہو نذیر؟"

"ہم نے مل جل کر ہی عدالت میں جانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

نذیر کی بات سن کر میاں جی، نادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "یہ تو گرم خون ہے، مگر تم نے تو دنیا دیکھی ہے۔ کرم دین کو عدالت میں گھسیٹ کر تمہیں کیا حاصل ہوگا؟"

"میرا بیٹا قتل ہوا ہے میاں جی! اس کے قاتل کو سزا ملنی ہی چاہئے اور میں اسے عدالت سے سزا ضرور دلواؤں گا۔"

"اگر تمہارا بیٹا کرم دین کے ہاتھوں قتل ہوا ہوتا تو یقین کرو۔ میں بھی تمہیں عدالت جانے سے نہ روکتا لیکن جن حالات میں تمہارے بیٹے کی جان گئی... وہ اور تھے...... اور پھر تم خود ہی سوچو...... اگر کرم دین اب بھی خاموش رہتا تو کیا تم کبھی یہ بھی جان سکتے تھے کہ تمہارا بیٹا قبرستان میں کیوں گیا تھا۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو، اگر کسی طرح کرم دین کو عدالت سزا سنا بھی دیتی ہے تو تمہیں کیا حاصل ہوگا؟"

"اگر اسے سزا ہو جاتی ہے تو مجھے دلی تسلی ہوگی۔"

"ایک راستہ معاف کر دینے والا بھی ہے۔"

"ہم اسے کسی صورت معاف نہیں کریں گے۔"

"معاف کر دینے والوں کو خدا بھی پسند کرتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں میاں جی...... مگر معاف کر دینا اتنا بھی آسان نہیں اور ویسے بھی معاف کر دینے کا حوصلہ مجھ میں نہیں۔"

"میرا کام تمہیں سمجھانا تھا نذیر۔ مجھے محض انسانیت کے ناتے کرم دین سے ہمدردی ہے۔ عدالت کا کسی مجرم کو اس کے کسی جرم کی سزا دینے کا مقصد بھی اسے یہ احساس دلانا ہوتا ہے کہ اس نے جو کیا وہ غلط تھا اور کرم دین کو تو پہلے ہی اپنی سبھی غلطیوں کا احساس ہو چکا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ پچھتاوے کی آگ میں جل کر وہ جس راہ پر چل نکلا ہے۔ وہ اس راہ سے ہٹ جائے۔"

"چل اٹھ ابا! بہت باتیں سن لیں۔ اب باقی کی باتیں عدالت میں ہی ہوں گی۔" نادر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے غصے میں کہا۔

"زیادہ جذبات میں نہ آؤ۔ کچھ ہوش سے کام لو۔ میاں جی کی بات تو خدا بھی نہیں ٹالتا۔ ہم تم کیا چیز ہیں؟" نادر کی بات سن کر تھانے دار نے سمجھانے کے لیے بات کی۔

"میاں جی کی ہم بھی بہت عزت کرتے ہیں، لیکن عدالت میں جانا ہماری مجبوری بھی ہے اور حق بھی۔" نادر نے بات کی اور کوئی جواب سنے بغیر باہر کی طرف چل پڑا، نذیر بھی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا تھا، تھانے دار انہیں روکنا چاہتا تھا مگر میاں جی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

باپ بیٹا وہاں سے چلے گئے تھے، کمرے میں کچھ دیر تک مکمل خاموشی چھائی رہی، میاں جی گردن جھکائے بیٹھے تھے تھانے دار اور کرم دین انہیں دیکھ رہے تھے، کچھ دیر یہی کیفیت رہی پھر میاں جی اٹھ کھڑے ہوئے، انہیں اٹھتے دیکھ کر کرم دین نے بھی کرسی چھوڑ دی۔

"لو بھئی برخوردار! تم اپنے مہمان کو سنبھالو میں چلتا ہوں۔" میاں جی نے تھانے دار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر کرم دین کو سینے سے لگاتے ہوئے بولے "تم ہمت نہیں ہارنا اور نہ کسی حال میں خدا کو بھولنا۔ بس اوپر والے پر بھروسہ رکھنا کیونکہ جو وہ کرتا ہے وہی صحیح ہوتا ہے۔"

میاں جی نے کرم دین کو سینے سے لگایا تو اس کی آنکھوں سے یہ سوچ کر آنسو بہہ نکلے تھے کہ میاں جی جیسی بزرگ ہستی اس گناہ گار کے لیے اس قدر ہمدردانہ رویہ رکھتی ہے، اس نے کوئی بات نہیں کی تھی مگر تھانے دار بول پڑا "میاں جی آپ چاہیں تو اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں سب کچھ خود ہی سنبھال لوں گا۔"

"نہیں برخوردار! میں کسی بھی طرح اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تم نے مجھے اتنی عزت دی، خدا تمہیں خوش رکھے۔" میاں جی نے اداس لہجے میں بات کی اور بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے چل پڑے۔

......☆☆☆......

صابر کے قتل کے جرم میں کرم دین کے گرفتار کیے جانے کی خبر اب چھپی نہیں رہی تھی، گھر گھر اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی، نادر اور نذیر، کرم دین کو عدالت میں گھسیٹ کر لے جانے کے لیے غصے میں بھرے تھانے سے گھر لوٹے تھے، اس پر لوگوں کے مشوروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا، جو بھی آیا تھا اس نے یہی کہا تھا کہ وہ ہر حال میں عدالت سے کرم دین کو سزا دلوائیں، وہ تو پہلے سے ہی یہی پروگرام بنائے بیٹھے تھے، اب ان کے ارادوں میں اور بھی مضبوطی آ گئی تھی۔

میاں جی کے جانے کے بعد تھانے دار دیر تک تنہا بیٹھا تمام پہلوؤں پر غور کرتا رہا تھا، وہ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر پہنچا اور یونیفارم تبدیل کر کے بے دلی سے کھانا کھا کر لیٹ گیا تھا مگر اسے عجیب سی بے چینی گھیرے ہوئے تھی، اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور گیراج میں کھڑی گاڑی میں بیٹھ کر گھر سے نکل گیا۔

تمام اہل خانہ کھانا کھانے کے بعد سکون سے سو رہے تھے، جب دروازے پر لگی گھنٹی بج اٹھی تھی، گھنٹی بجنے پر سب کی آنکھ کھل گئی تھی، نادر نے دروازہ کھولا تھا۔

"تھانے دار صاحب! آپ اور اس وقت یہاں؟" دروازے پر کھڑے تھانے دار کو دیکھتے ہی نادر نے سوال کیا۔

"تم ڈرائینگ روم کا دروازہ کھولو۔ اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" تھانے دار نے کہا۔

تھانے دار کے کہنے پر نادر نے خاموشی سے ڈرائینگ روم کا دروازہ کھول دیا، دروازہ کھلنے پر تھانے دار کے ڈرائینگ روم میں داخل ہونے تک نذیر بھی وہیں آ گیا تھا۔

"اچھا ہوا تم بھی آ گئے۔ ورنہ میں نے خود بھی تمہیں بلوانا ہی تھا۔" نذیر پر نظر پڑتے ہی تھانے دار نے بات کی۔

"خیر تو ہے ناں۔ تھانے دار صاحب۔" نذیر نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔

"خیر ہوتی تو میں اس وقت سول کپڑوں میں یہاں کیوں آتا؟"

"کیا ہوا تھانے دار صاحب؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا، لیکن تم عدالت چلے گئے تو پھر بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"عدالت تو ہم جائیں گے ہی تھانے دار صاحب۔"

"کیا ہوگا عدالت میں جا کر؟"

"ہمیں انصاف ملے گا۔"

"نہ تمہارے پاس گواہ، نہ کوئی ثبوت۔ عدالتوں کے چکر کاٹتے رہ جاؤ گے اور حاصل کچھ نہیں ہوگا۔"

"کیا آپ ہمیں ڈرانے آئے ہیں؟"

''نہیں میں ڈرانے نہیں آیا میں تو بس تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ جس شخص کے لیے میاں جی جیسی بزرگ ہستی خود چل کر پہلی بار تھانے آئی، اسے عدالت میں مت گھسیٹو۔ اور پھر ذرا سوچو تو سہی تمہارے گھر میں دو وقت کی روٹی تو بمشکل پوری ہو پاتی ہے، کیس کے لیے وکیلوں کی فیسیں کہاں سے دے پاؤ گے۔ میری ایک بات اور یاد رکھنا، اگر کرم دین تمہارے بیٹے کا قاتل ہوتا تو میں کبھی بھی تمہیں عدالت جانے سے نہ روکتا۔ میرا کام تمہیں سمجھانا تھا، اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے، کرم دین کو معاف کر کے میاں جی کی دعائیں لینی ہیں یا اسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنا ہے۔'' بات کرتے ہی ان کا جواب سنے بغیر تھانے دار اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پھر ان سے ہاتھ ملانے کے بعد وہاں سے نکل گیا۔

تھانے دار کے جانے کے بعد ان دونوں نے دروازہ بند کیا اور خاموشی سے اپنی اپنی چار پائیوں پر جا لیٹے، تھانے دار کے آنے سے قبل وہ سکون سے سو رہے تھے مگر تھانے دار نے ان دونوں کی نیند اڑا کر رکھ دی تھی، وہ دونوں ہی بار بار کروٹیں بدل رہے تھے، اپنے اپنے بستروں پر جانے سے پہلے وہ انصاف کے لیے عدالت جانے کا فیصلہ کر کے سوئے تھے مگر تھانے دار نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''تھانے دار نے تو ہمیں مشکل میں ہی ڈال دیا ہے۔'' نذیر نے صبح ناشتے کے وقت اپنی بیوی اور بیٹے کی موجودگی میں بات کی۔

''کیسی مشکل ابا جی! تھانے دار کچھ بھی کہتا رہے، ہم نے عدالت میں جانا ہے اور جا کر ہی رہیں گے۔'' نادر نے تلخ لہجے میں کہا۔

''تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

''ہاں۔ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

''تو جاؤ پھر وکیلوں کو فیس دو اور اکیلے ہی عدالتوں کے چکر کاٹو۔'' نذیر نے انتہائی غصے کے عالم میں بات کی۔

''اگر ہم اس طرح پیچھے ہٹ گئے تو لوگ کیا کہیں گے؟''

''لوگوں کا کیا ہے۔ لوگ تو تماشہ دیکھتے ہیں...... اور پھر یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے ہم جیسے چاہیں کریں، لوگوں کو اس سے کیا۔''

''اس گھر میں تو بات کرنا ہی فضول ہے۔'' نادر نے تلخ لہجے میں کہا اور غصے کی حالت میں دروازے کو زور سے بند کر کے باہر نکل گیا۔

......☆☆☆......

پولیس نے جب کرم دین کو گرفتار کیا تھا تو وہ سر پر ٹوپی لیے اور ہاتھ میں تسبیح پکڑے نماز ادا کرنے کے لیے گھر سے نکلنے والا تھا، اس وقت کرم دین کے کہنے پر بھی انہوں نے اسے نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں دی تھی، مگر جب سے میاں جی تھانے سے ہو کر گئے تھے، تھانے کا عملہ ہر طرح سے کرم دین کے ساتھ بھر پور تعاون کر رہا تھا، اسے نماز ادا کرنے کے لیے حوالات میں ہی جائے نماز دے دی گئی تھی، اس نے تمام نمازیں باقاعدگی سے ادا کی تھیں اور پھر رات کو عشاء کی نماز کے بعد تسبیح لے کر ذکر خدا میں لگ گیا تھا، اسے ایسا کرنے سے اس قدر سکون مل رہا تھا کہ اسے پتا بھی نہ چلا کب اس کی آنکھ لگ گئی صبح جب اسے ڈیوٹی پر موجود سپاہی نے نماز ادا کرنے کے لیے جگایا تو اس کی آنکھ کھلی۔

......☆☆☆......

دن بھر نذیر اور نادر میں کئی بار گرما گرم بحث ہو چکی تھی، نادر کسی بھی طرح اس بات کے لیے راضی نہیں ہو رہا تھا کہ کرم دین کو عدالت میں لے جانے کی بجائے معاف کر دیا جائے، نذیر نے تھک ہار کر نادر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے، مگر پھر اچانک نادر کے ذہن میں جانے کیا بات آئی کہ اس نے باپ کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

وہ دونوں باہمی مشورے سے میاں جی کے پاس آئے تھے اور انہیں کرم دین کو معاف کر دینے اور اس پر مقدمہ نہ کرنے کے بارے میں بتایا تھا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں نے باہمی رضامندی سے درست فیصلہ کیا ہے۔'' نذیر اور نادر کے منہ سے کرم دین کو معاف کر دینے کی بات سن کر میاں جی نے بات کی اور پھر بولے ''میں جانتا ہوں، جن کا بیٹا قتل ہو جائے ان کے دل پر کیا گزرتی ہے...... اسی لیے تو اسلام مقتول کے ورثاء کو بدلہ لینے کا پورا پورا حق دیتا ہے، صابر کے معاملے میں بھی اگر ایسا کچھ ہوتا تو میں تمہیں کبھی بھی انصاف کے حصول سے نہ روکتا، لیکن یہ تو تم بھی جان ہی گئے ہو کہ اس قتل میں کرم دین کا کتنا ہاتھ ہے۔''

''جو کچھ بھی ہوا میاں جی! ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ بس ہم نے کرم دین کو دل سے معاف کیا۔''

''بدلہ لینے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی معاف کر دینے والے کو خدا اور اس کا رسول ﷺ بھی پسند کرتے ہیں اور خدا تمہیں بھی اس کا اجر ضرور دے گا...... اب تم تھانے میں جا کر انہیں کرم دین کو معاف کر دینے کے بارے میں تحریری بیان دے دو تاکہ وہ کرم دین کو حوالات سے نکال دیں'' میاں جی نے انتہائی نرم لہجے میں پیار سے انہیں سمجھایا۔

باپ، بیٹا میاں جی کی بات سن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے نکل کر سیدھے تھانے پہنچ گئے، پھر ان کے تحریری بیان کے فوراً بعد کرم دین کو حوالات سے آزاد کر دیا گیا۔

......☆☆☆......

وہ حوالات سے نکل کر سیدھا میاں جی کے پاس گیا تھا، میاں جی نے اسے دیکھتے ہی پیار سے اپنے سینے سے لگا لیا تھا مگر وہ ان کے سینے سے لگ کر رونے لگا تھا۔

''اب کیوں روتے ہو؟ اب تو تمہارے دل کے سارے بوجھ ایک ایک کر کے ختم ہو گئے ہیں، اب تو تمہیں سکون کی گھڑیاں نصیب ہوں گی۔'' میاں جی نے کرم دین کو روتے ہوئے دیکھ کر بچوں کی طرح سمجھایا۔

''میاں جی میں تو یہ سوچ کر رو رہا ہوں کہ اگر میری زندگی میں آپ نہ آتے تو میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرتا، آپ نے قدم قدم پر نہ صرف میری رہنمائی کی بلکہ میرا بھر پور ساتھ دیا۔''

''کرم دین میری ایک بات یاد رکھنا کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا، ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں، یہ سب خدا کی مرضی سے ہو رہا ہوتا ہے۔ بس اب تم رونا دھونا بند کرو اور گھر جا کر آرام کرو'' میاں جی نے کرم دین کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

میاں جی کی بات سن کر کرم دین خاموشی سے وہاں سے چل پڑا اور گھر آ کر چار پائی پر لیٹ گیا، چار پائی پر لیٹتے ہی یہ سوچ کر اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ دو دن حوالات میں گزار کر آیا تھا مگر محلے میں سے کسی نے بھی آ کر اس کا حال تک نہیں پوچھا تھا، اسی لمحے میاں جی کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے ''جب کبھی کوئی پریشانی تمہیں آ گھیرے تو خدا کو یاد کیا کرو، اور ہر حال میں اس کا شکر ادا کرتے رہا کرو''۔ یہ خیال آتے ہی اس نے تسبیح ہاتھ میں لے لی اور ذکر خدا میں لگ گیا، تھوڑی ہی دیر میں اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور تسبیح اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے سینے پر گر گئی تھی۔

وہ رات بھر سکون سے سویا رہا تھا، روز کی طرح فجر کی اذان کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی، اس نے مسجد میں باجماعت نماز ادا کی اور پھر گھر واپس آ کر تلاوت کلام پاک سے فارغ ہو کر چار پائی پر بیٹھ گیا، یہ وقت اس کے ڈیوٹی پر جانے کا تھا مگر اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا، وہ حوالات میں بند ہونے کی وجہ سے پچھلے دو دن سے فیکٹری نہیں گیا تھا، مگر اس روز بھی اس کا جسم اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا اس لیے اس نے ایک اور چھٹی کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔

وہ حوالات میں ٹھیک سے سو نہیں پایا تھا اس لیے ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد لیٹتے ہی اس کی پھر سے آنکھ لگ گئی تھی، دروازے پر دستک ہونے لگی تھی، دستک کی آواز سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا، اس نے دروازہ کھولا تو سامنے چاچی کھڑی تھی۔

''آؤ چاچی آؤ۔'' چاچی کو دروازے پر کھڑے دیکھ

کر خوشی اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کرم دین نے کہا۔

”میں نے سوچا آج کرم دین کو ہی دیکھ آؤں۔“ چاچی نے برقعہ اتار کر ہاتھ میں پکڑ کر اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”شکر ہے چاچی! آج کسی کو میرا بھی خیال آیا۔“

”مجھے پتا چلا تھا کہ تم تھانے سے واپس آ گئے ہو۔ اسی لیے تمہاری خیریت جاننے آئی ہوں۔“

”یہ تو تمہاری مہربانی ہے چاچی۔“

”مہربانی والی تو خیر کوئی بات نہیں لیکن گھر کی ویرانی دیکھ کر بہت تکلیف ہو رہی ہے۔“

”جب گھر والے ہی نہ رہیں تو گھر ویران ہی ہو جایا کرتے ہیں چاچی۔“ کرم دین نے اداس لہجے میں بات کی۔

”تم کسی طرح اپنے بچوں کو ہی لے آتے‘ گھر میں کچھ تو رونق رہتی۔“

چاچی کی بات سن کر کرم دین نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا۔ ”ایک بار گیا تھا چاچی لیکن انہوں نے مجھے ایسے دھتکار دیا جیسے کوئی کسی بھکاری کو دھتکارتا ہے پھر اس کے بعد کبھی وہاں جانے کا حوصلہ نہیں ہوا۔“

”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا آخر تم داماد تھے ان کے۔“

”جب ان کی بیٹی ہی نہ رہی تو پھر کیسا داماد‘ اور ویسے بھی میں نے ان کی بیٹی کو کون سے سکھ دیے تھے جو وہ داماد کا خیال کرتے۔“

”تم دوسری شادی کر لو۔“

”نہیں چاچی اب نہیں۔“

”کیوں اب کیا ہوا؟“

”اب ہر کوئی عائشہ جیسی تو ہو نہیں سکتی۔ وہ بس ایک ہی تھی جو خدا نے میرے نصیب میں لکھی تھی، مگر میں ہی اس کی قدر نہ کر سکا۔ دراصل ہمیں ناشکری کی عادت پڑ چکی ہے۔ جب ہم سے کوئی نعمت چھن جاتی ہے، تب ہمیں اس نعمت کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے‘ مگر جو نعمت ایک بار چھن جائے وہ دوبارہ کہاں ملا کرتی ہے چاچی۔“

”میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی تھی۔ باقی جیسے تمہاری خوشی۔“ چاچی نے بات کی اور برقعہ سنبھالتے ہوئے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چاچی آج تم آئی ہو تو مجھے بہت اچھا لگا۔ تم ہماری بڑی ہو، بس اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کرو۔“

”اللہ خیر کرے گا۔“ چاچی نے کہا اور چل دی۔

......☆☆☆......

کرم دین تین روز بعد فیکٹری آیا تھا، وہ اس بات سے خوف زدہ تھا کہ اسے فیکٹری مینیجر کی باتیں سننا پڑیں گی، وہ ڈرتے ڈرتے اپنی ڈیوٹی پر جا کھڑا ہوا تھا، لیکن وہ اس بات پر حیران تھا کہ مینیجر تو کیا اس کے سپروائزر نے بھی اسے تین دن تک غیر حاضر رہنے کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا، کرم دین اس بات سے بے خبر تھا کہ میاں جی نے فیکٹری کے مالک کو فون پر تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا اور اسے تاکید بھی کر دی تھی کہ وہ ڈیوٹی پر واپس آئے تو اس سے کسی قسم کی پوچھ گچھ نہ کی جائے۔

رفتہ رفتہ حالات پھر سے معمول پر آنے لگے تھے، کرم دین نے خود کو گھر سے فیکٹری، فیکٹری سے گھر اور گھر سے مسجد تک محدود کر لیا تھا، وہ فیکٹری میں ہوتا تو پورا وقت جی جان لگا کر محنت سے کام کرتا، ہر روز ظہر، عصر اور کبھی کبھار مغرب کی نمازیں اسے فیکٹری میں ہی ادا کرنا پڑتیں، جیسے ہی اذان کی آواز اس کے کانوں میں پڑتی، وہ وہیں کام چھوڑ دیتا اور جلدی سے وضو کر کے نماز پڑھنے لگتا اور نماز سے فارغ ہوتے ہی پھر سے کام پر آ کھڑا ہوتا، فیکٹری کا مالک یہ دیکھ کر حیران ہوتا کہ ڈیوٹی کے دوران نمازیں ادا کرنے کے لیے کرم دین کا جتنا وقت لگتا تھا وہ چھٹی کے بعد باقاعدگی سے اتنے ہی وقت کے لیے کام کرتا رہتا تھا۔

اسے ایسا کرتے دیکھ کر فیکٹری کے مالک نے مینیجر

کے ذریعے کہلوایا تھا ”اس کا جو وقت نماز کے لیے لگتا ہے وہ پورا کرنے کے لیے اسے دیر تک کام کرنے کی ضرورت نہیں۔“ لیکن اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا ”میں نماز خدا کے لیے پڑھتا ہوں اور نہیں چاہتا کہ کسی کے دل میں کبھی یہ خیال آئے کہ وہ فیکٹری کے اس وقت میں نماز ادا کرتا ہے جس کے لیے اسے اجرت دی جاتی ہے، اس لیے میں بخوشی ایسا کرتا ہوں تاکہ میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہ رہے۔“

جب سے کرم دین نے میاں جی کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے بارے میں یہ کہتے سنا تھا ”خدا غفور الرحیم ہے وہ اپنے حقوق تو معاف کر دے گا لیکن بندوں کے حقوق کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ تب سے کرم دین حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد پر بھی خصوصی توجہ دینے لگا تھا، وہ تنہا زندگی بسر کر رہا تھا، اس پر کوئی اضافی ذمہ داریاں بھی نہ تھیں، اس لیے ہر ماہ فیکٹری سے ملنے والی تنخواہ میں سے اخراجات کے بعد ایک معقول رقم بچ جاتی تھی، جس سے وہ چپکے سے کسی نہ کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کر دیتا تھا، ایسا کرتے ہوئے وہ جس قدر خوشی اور سکون محسوس کر رہا ہوتا تھا، ایسے لمحات اس سے پہلے زندگی میں کبھی اسے میسر نہیں آئے تھے۔

بچپن میں ایک بار قرآن مجید پڑھنے کے بعد کرم دین نے ایک مدت تک قرآن پاک کو کبھی کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا، پھر میاں جی کی صحبت سے اسے قرآن پاک کی تلاوت کا اس قدر شوق ہوا کہ وہ ہر روز جب تک تلاوت نہ کر لیتا اسے سکون نہیں آتا تھا، لیکن قرآن پاک کی تلاوت کے دوران اسے بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے اسے زیادہ نہیں تو کم از کم اس کا مفہوم و ترجمہ تو معلوم ہونا چاہیے، تاکہ اسے پڑھتے ہوئے یہ تو پتا چلے کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے اس میں کیا بیان کیا جا رہا ہے، اسی لیے وہ میاں جی سے قرآن پاک کے ترجمہ و تفسیر کا درس لینے لگا تھا، وہ جیسے جیسے قرآن مجید کو سمجھتا جاتا تھا، اسے اپنی گزری ہوئی زندگی سے گھن آنے لگتی تھی اور وہ رات کی تنہائی میں سجدے میں سر رکھے گڑگڑا کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہتا تھا۔

نماز کے بعد تمام نمازی مسجد سے چلے گئے تھے، جو دو چار رہ گئے تھے وہ بھی کچھ دیر میاں جی کے پاس بیٹھنے کے بعد ایک ایک کر کے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے، اب مسجد میں کرم دین اور میاں جی رہ گئے تھے، اسے بیٹھے دیکھ کر میاں جی جان گئے تھے کہ اس نے ضرور کوئی نہ کوئی بات کرنا ہوگی، کیونکہ وہ کرم دین کی اس عادت سے بخوبی آگاہ تھے کہ جب بھی اس نے کوئی بات کرنا ہوتی وہ اسی طرح تمام نمازیوں کے جانے کا انتظار کرتا اور پھر جب سب نمازی وہاں سے چلے جاتے تو وہ بات کرتا تھا۔

”کیا بات ہے کرم دین کچھ کہنا چاہ رہے ہو؟“ کرم دین کو پاس بیٹھے دیکھ کر میاں جی نے سوال کیا۔

”جی میاں جی۔“

”کہو کیا کہنا ہے۔“ میاں جی نے پیار سے دریافت کیا۔

”میاں جی! عرصے سے ایک خواہش میرے دل میں پل رہی تھی اور میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ کوشش بھی کرتا رہا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو بتاؤں؟“

”جو کہنا چاہتے ہو کہو کرم دین۔“

”میاں جی۔ میں حج کے لیے جانا چاہ رہا ہوں۔“

”ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ...... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔“

”اگر آپ اجازت دیں تو میں حج کے لیے درخواست دے دوں۔“

”یہ تو بہت بڑی نیکی اور سعادت کا کام ہے۔ اگر تمہارے پاس وسائل ہیں تو ضرور جاؤ۔“

”میں نے تھوڑے تھوڑے کر کے حج کی نیت سے دو لاکھ روپے جمع کیے ہیں، ان دنوں درخواستیں بھی جمع

ہورہی ہیں، میں چاہ رہا ہوں کہ میں بھی درخواست جمع کروادوں۔“
”نیکی کے کام میں دیر کیسی۔ بسم اللہ کرو اور درخواست جمع کروادو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“ میاں جی نے شفقت بھرا ہاتھ کرم دین کی پیٹھ پر پھیرتے ہوئے کہا۔
میاں جی کی بات سنتے ہی کرم دین اٹھ کھڑا ہو اتھا، وہ اٹھا تو میاں جی بھی اٹھ گئے، پھر وہ دونوں ایک ساتھ مسجد سے باہر نکل آئے، کرم دین گھر پہنچا تو بہت خوش تھا، کبھی خوشی سے، کبھی یہ سوچ کر اس کی آنکھیں بار بار ڈبڈبا جاتی تھیں کہ وقت نے اسے اس قدر تنہا کر دیا تھا کہ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنی خوشی میں شریک کرسکتا، ایک مدت کے بعد وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا اور رات کروٹیں بدلتے ہوئے کٹ گئی تھی۔
کرم دین نے حج کی درخواست جمع کروانے کے لیے فیکٹری سے چھٹی لے رکھی تھی، اس کا خیال تھا کہ وہ سکون سے کسی قریبی بینک میں جا کر درخواست جمع کروا آئے گا، اس نے رات کو ہی دو لاکھ روپے گن کر حفاظت سے رکھ لیے تھے، وہ نکلنے ہی والا تھا کہ چاچی آ گئی، وہ خاموشی سے کرم دین کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔
”کیا بات ہے چاچی۔ آج تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو؟“ چاچی کو خاموش بیٹھے دیکھ کر کرم دین نے دریافت کیا۔
کرم دین کا سوال سن کر چاچی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے اور وہ کرم دین کی بات کا کوئی جواب نہیں دے پائی تھی۔
”خیر تو ہے ناں؟“ کرم دین نے چاچی کو روتے دیکھ کر سوال کیا۔
چاچی نے ہاتھ میں پکڑے اپنے برقعے سے آنسو صاف کیے اور بولی ”ان بے چاروں کا ایک بیٹا تو قبر میں جا سویا اور اب دوسرا ابھی چارپائی پر پڑا موت کی راہ دیکھ رہا ہے۔“
”تم کس کی بات کر رہی ہو چاچی؟“
”میں نذیر کے بیٹے، نادر کی بات کر رہی ہوں ابھی ابھی میں انہیں کے ہاں سے آرہی ہوں۔“
”اسے کیا ہوا؟“ کرم دین نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔
”وہ ایک عرصے سے گردوں کے مرض میں مبتلا تھا اور اس کا علاج بھی ہو رہا تھا، اب اس کے دونوں گردے کام کرنا چھوڑ گئے ہیں، نادر کے ماں باپ نے رو رو کر برا حال کرلیا ہے۔ صابر کے بعد نادر ہی ان کی اکلوتی اولاد ہے، اگر خدانخواستہ اسے بھی کچھ ہو گیا تو وہ بے اولاد ہو جائیں گے۔“
”کوئی راستہ تو ہوگا نادر کو بچانے کا؟“
”ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اگر کسی طرح اس کا ایک گردہ تبدیل کردیا جائے تو اس کی جان بچ سکتی ہے۔“
”تو پھر وہ گردہ تبدیل کروالیں۔“
”ان غریبوں کے گھر میں دو وقت کی روٹی تو پوری ہوتی نہیں۔ گردے کے لیے دو لاکھ روپے کہاں سے لائیں گے؟“ بات کرتے ہوئے ایک بار پھر چاچی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے، پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور آنکھوں میں آنسو لیے وہاں سے نکل گئی۔
چاچی کے آنسوؤں نے کرم دین کو بھی رلا دیا تھا، چاچی کے آنے سے پہلے وہ گھر سے نکلنے کے لیے تیار بیٹھا تھا مگر اس کی باتوں نے اسے پریشان کر ڈالا تھا اور وہ سوچنے لگا تھا کہ اگر خدانخواستہ نادر کو کچھ ہو گیا تو اس کے والدین تو بے موت مارے جائیں گے، وہ دیر تک بیٹھا سوچتا رہا پھر اٹھا اور رقم اور حج کی درخواست کے لیے ضروری کاغذات احتیاط سے جیب میں ڈال کر بینک جانے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔
اسے بینک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی، وہاں حج کے لیے درخواستیں جمع کروانے والوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں، وہ بھی اپنا فارم پر کر کے قطار میں لگ گیا اور

اپنی باری کا انتظار کرنے لگا، قطار میں کھڑے ایک بار پھر چاچی کی باتوں نے اسے آگھیرا تھا، نادر کے متعلق سوچتے ہوئے اس کی عجیب سی کیفیت ہوگئی تھی، ایک ایک کر کے لوگ فارغ ہوتے جا رہے تھے اور وہ کھڑکی کے قریب ہوتا جا رہا تھا، اب اس سے آگے صرف دو افراد رہ گئے تھے، ان کے بعد اس کی باری تھی لیکن وہ باری آنے سے پہلے ہی قطار سے باہر نکل آیا اور حج کے لیے درخواست جمع کروائے بغیر ہی گھر کی طرف واپس چل پڑا، گھر پہنچ کر اس نے پھر سے رقم سنبھال کر رکھ دی اور خود کو چارپائی پر گرا دیا۔
رات تک اس نے تمام کام نمٹائے تھے مگر اس کا ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا، اس کے دل پر ایک بوجھ سا تھا جو کسی پل اسے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا، جب ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تو اس نے حج کے لیے رکھی ہوئی رقم اٹھائی اور گھر سے نکل پڑا، اب اس کے قدم نادر کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے، دستک دینے پر نذیر نے دروازہ کھولا تھا، وہ رات گئے کرم دین کو اپنے دروازے پر کھڑے دیکھ کر پریشان ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا، وہ ایک طرف ہٹ گیا اور خاموشی سے کرم دین کو اندر آنے کا راستہ دے دیا۔
”سنا ہے نادر بہت بیمار ہے؟“ کرم دین نے بیٹھتے ہی بلاتمہید بات کی۔
”ہاں۔“ نذیر نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا اور پھر بولا ”اس کے دونوں گردے خراب ہو گئے ہیں۔ بس اب وہ تھوڑے ہی عرصے کا مہمان ہے، اسی لیے تو اس کے سسرال والوں نے اس کی منگنی بھی توڑ ڈالی ہے“ نذیر نے بات کی اور بات کرتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
نذیر کو روتے دیکھ کر کرم دین کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے تھے، پھر اس نے خود کو سنبھالا اور بولا ”کوئی تو علاج ہوگا اس کا؟“
”اگر اس کا ایک گردہ بھی تبدیل کردیا جائے تو اسے زندگی مل سکتی ہے، مگر اتنے پیسے کہاں سے لائیں؟“ نذیر نے مسلسل روتے ہوئے کہا۔
”خدا کے گھر سے کبھی مایوس نہیں ہوا کرتے۔“ کرم دین نے حوصلے سے بات کی اور پھر جیب سے دو لاکھ روپے نکال کر نذیر کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولا ”یہ رکھ لیں۔ اور تسلی سے اس کا علاج کروائیں۔ خدا سب ٹھیک کردے گا۔ بس ایک احسان مجھ پر ضرور کر دیجیے گا، اس رقم کے بارے میں کسی سے ذکر نہ کیجیے گا۔“
رقم نذیر کے ہاتھوں میں تھی، وہ بے یقینی کے عالم میں کبھی کرم دین کو دیکھنے لگتا اور کبھی ہاتھ میں پکڑے ہوئے نوٹوں پر نظر ڈالتا تھا، اس سے کوئی بات بھی نہیں ہو پا رہی تھی اور وہ آنسو بہائے جا رہا تھا۔

علامہ اقبال

☆ علی گڑھ میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ علامہ اقبال بھی تشریف فرما تھے کالج کے لڑکوں نے علامہ سے گرہ لگانے کو کہا اور مصرعہ تھا۔
مچھلیاں ہوں دشت میں پیدا ہرن پانی میں
علامہ اقبال ایسے بکھیڑوں سے پرہیز ہی کیا کرتے تھے۔ مگر طالب علموں کے اصرار پر کہا۔
اشک سے بھریں جنگل، آہ سے سوکھیں دریا
مچھلیاں ہوں دشت میں پیدا ہرن پانی میں
☆ علی بہادر حبیب اللہ پندرہ برس لندن میں گزار کر 1938 میں لاہور واپس آئے۔ ایک دن وہ علامہ اقبال کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انگلستان کا ذکر چل نکلا۔ جس پر علی بہادر حبیب اللہ نے بڑے ہی فخر سے کہا۔ ”کہ میں تو صرف آٹھ برس کی عمر میں انگلینڈ چلا گیا تھا۔“ اس پر علامہ اقبال مسکرائے اور ازراہ مذاق کہا۔
”لیموں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے۔“
(عبداللہ عاطر..... منگلا کینٹ)

"صبر کریں اور حوصلے سے کام لیں اور باقی کے کام اوپر والے پر چھوڑ دیں، وہ جو کرتا ہے وہی ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔" کرم دین نے نذیر کو تسلی دی اور خاموشی سے گھر واپس چل پڑا۔

☆☆☆......

کرم دین، میاں جی کے پاس بیٹھا تھا، نذیر اور نادر بھی وہیں آ گئے، کرم دین نے ایک مدت کے بعد نادر کو دیکھا تھا، موت کے خوف نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ ڈالا تھا اور وہ اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ پہچانا نہیں جا رہا تھا، سلام دعا کے بعد وہ دونوں میاں جی کے قریب ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

"کیا بات ہے نادر! تم اس قدر بجھے ہوئے کیوں دکھائی دے رہے ہو؟" میاں جی نے نادر کو دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ بہت بیمار ہے میاں جی! اس کے گردوں کا آپریشن ہے، کل ہم اسے ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ آپ کے پاس دعا کے لیے آئے تھے۔" نادر کی بجائے نذیر نے جواب دیا۔

"اللہ شفاء دینے والا ہے۔ خدا کرے یہ جلد ٹھیک ہو کر گھر واپس آئے۔" میاں جی نے دعا دی۔

"آمین......آمین۔" نذیر اور کرم دین نے ایک ساتھ کہا، نادر کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اس لیے وہ کچھ بول نہیں پایا تھا۔

"اچھا میاں جی اجازت۔" نذیر نے اٹھتے ہوئے کہا، نادر بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ہمت سے کام لو اور خدا پر بھروسہ رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میاں جی نے نادر کو روتے ہوئے دیکھ کر اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔

انہیں اٹھتے دیکھ کر کرم دین بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا، نادر کو روتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے تھے، اس نے نادر سے سلام لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو نادر اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"نہیں......نہیں۔ روتے نہیں۔" نادر کو تسلی دیتے ہوئے کرم دین خود بھی رونے لگا تھا۔

اس وقت میاں جی کے حجرے میں عجیب سماں تھا، ان چاروں ہی کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ رو رہے تھے اور ایک دوسرے کو حوصلہ بھی دے رہے تھے، کچھ دیر بعد نذیر اور نادر وہاں سے چلے گئے تھے مگر حجرے میں اب بھی اداسی پھیلی ہوئی تھی۔

نادر کو ہسپتال داخل کروا دیا گیا تھا، آپریشن کی تیاری کے لیے اس کے تمام ٹیسٹ لیے جانے لگے تھے، محلے میں آتے جاتے کسی نہ کسی سے کرم دین کو نادر کے بارے میں معلومات مل جاتی تھیں یا پھر نماز کے بعد مسجد میں نادر کے متعلق بات چھڑ جاتی تو اس کے بارے میں پتا چل جاتا تھا، جس روز نادر کا آپریشن ہونا تھا، وہ دن کرم دین کے لیے پریشانی کے عالم میں گزر رہا تھا، اس کی ہر سانس کے ساتھ نادر کے لیے دعا نکل رہی تھی، اس روز میاں جی نے بھی ہر نماز کے بعد نادر کی صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کی تھی۔

آپریشن کامیاب ہوا تھا، جیسے ہی نادر کے کامیاب آپریشن کی خبر محلے میں پہنچی تھی، ہر کوئی ایک دوسرے کو خوشی سے یہ خبر دے رہا تھا، کرم دین نے بھی خدا کے حضور سجدہ شکر ادا کیا تھا اور نادر کے گھر جا کر اس کی ماں کو بیٹے کی نئی زندگی ملنے پر مبارک باد دی تھی۔

کچھ روز بعد نادر صحت یاب ہو کر ہسپتال سے واپس گھر آ گیا تھا، یہ خبر ملتے ہی کرم دین اسے دیکھنے ان کے گھر گیا تھا، آپریشن سے قبل بیماری کی وجہ سے نادر کے چہرے پر جو مردنی چھائی ہوئی تھی وہ ختم ہو گئی تھی، ڈاکٹروں نے اسے کچھ دن تک آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا، اس لیے وہ چارپائی پر ہی لیٹا ہوا تھا، کرم دین کو دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے اسے اٹھنے سے منع کر دیا تھا۔

"اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟" کرم دین نے نادر کے پاس بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"اب تو ٹھیک ہوں میں۔" نادر نے آہستہ سے جواب دیا۔

"اللہ نے بڑا کرم کیا، ورنہ تمہاری جو حالت تھی وہ دیکھی نہیں جاتی تھی۔"

"یہ سب تمہاری وجہ سے ممکن ہوا ہے۔"

"آئندہ کبھی بھولے سے بھی یہ بات اپنی زبان پر مت لانا۔ میاں جی کہا کرتے ہیں سارے کام اللہ کی رضا سے ہوتے ہیں۔ بس تم بھی اسی کا شکر ادا کرو۔"

کرم دین نے نادر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پیار سے کہا، اسی وقت کچھ اور محلے دار اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے وہاں آ گئے تھے، اس لیے کرم دین جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆......

حج پروازوں کا آغاز ہو چکا تھا، حج کے دن قریب آتے جا رہے تھے، حج کے لیے جانے والے خوش نصیب اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے مل کر بخوشی سفر پر روانہ ہو رہے تھے۔

"تمہاری فلائٹ کس دن ہے کرم دین؟" نماز کے بعد میاں جی نے چلتے چلتے کرم دین سے پوچھا۔

"میں تو حج پر نہیں جا رہا میاں جی۔" کرم دین نے بات کی۔

کرم دین کی بات سن کر میاں جی کو جھٹکا لگا تھا، اس لیے فوراً بولے۔ "مگر تم نے حج کی درخواست تو دی تھی۔"

"نہیں میاں جی۔ میں نے درخواست نہیں دی تھی۔"

میاں جی کو ایک اور جھٹکا لگا تھا، وہ حیران ہو کر بولے "لیکن اس روز تم نے خود مجھ سے حج پر جانے کی بات کی تھی۔"

"بس میاں جی! کہا تو تھا۔ لیکن درخواست نہیں دے سکا تھا۔" کرم دین نے رک رک کر بات کی۔

"تمہارے لہجے سے ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔"

میاں جی سے غلط بیانی کرنا یا جھوٹ بولنا کرم دین کے لیے ممکن نہیں تھا، اس لیے اسے وہ بات بتانا پڑی جسے اس نے اب تک کسی پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا، اس کی بات سن کر میاں جی چلتے چلتے وہیں رک گئے تھے۔

"تم نے اتنا بڑا کام کر دکھایا اور کسی کو خبر تک نہیں ہونے دی۔"

صحیح وارث

فرحانہ بیگم نے گھر میں داخل ہوتے ہی ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ تمام گھر والے فوراً اکٹھے ہو گئے گھبرایا گھبرایا سا اس کا باپ ظہور احمد بھی پہنچ گیا اور لرزیدہ آواز میں بولا۔ "کیا بات ہے بیٹی فرحانہ! آج خیریت تو ہے؟"

"ابو جان! عادل خان مجھے مسلسل دو ماہ سے تنگ کر رہا ہے۔" فرحانہ بیگم نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "میں اس کمینے عادل خان کو جو بڑا خان بنا پھرتا ہے کو ابھی حوالات میں بند کروا کر الٹا لٹکوا کر چھترول کرواتا ہوں۔ ہائے رے لوگوں۔ آج کل لڑکوں میں تو ذرا بھی شرم وحیا نہیں ہے۔" ظہور احمد نے نہایت غصے سے کہہ کر جیب سے موبائل نکالنا چاہا تو اس کی بیٹی فرحانہ بیگم نے کہا۔

"نہیں ابو جان میں عادل خان کو اس بھی سخت سزا دینا چاہتی ہوں۔"

"بیٹی فرحانہ وہ کیا؟"

"ابو جان! وہ یہ کہ آپ عادل خان سے میری شادی کروا دیں۔" فرحانہ بیگم نے چہرے کو سخت اور ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے جواب دیا۔ یہ سنتے ہی ظہور احمد نے تالی بجائی اور مسکرا کر بولا۔

"بیٹی فرحانہ! تم انتقام کے معاملے میں بالکل اپنی مرحوم ماں شہناز بیگم پر گئی ہو۔"

(محمد شفاعت حسین......ضلع خانیوال)

"آپ خود ہی تو کہا کرتے ہیں میاں جی۔ نیکی کروتو اس طرح کہ دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔"

کرم دین نے اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کہہ ڈالی تھی، اس کی بات سن کر کچھ پل کے لیے میاں جی حیران وپریشان کھڑے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے رہے، پھرانہوں نے بے اختیار کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا کر اس قدر بھینچ لیا کہ کرم دین کو میاں جی کے سینے میں ہونے والی دل کی دھڑکن اپنے سینے میں اترتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی، اس پل وہ اس قدر سرور محسوس کر رہا تھا کہ اسے یہ سوچ کر اپنی قسمت پر رشک آنے لگا تھا کہ وہ آل رسول ﷺ کے سینے سے لگا کھڑا تھا، وہ میاں جی کے سینے سے جدا ہوا تو اس پر عجیب سی کپکپی طاری تھی، اب وہ اپنے دل میں ہونے والی دھک دھک کی جگہ دل سے نکلنے والی اللہ...... اللہ کی صدا کو با آسانی محسوس کر رہا تھا، وہ اسی کیفیت میں گھر آ کر خاموشی سے چادر لپیٹ کر لیٹ گیا تھا۔

☆☆☆......

کرم دین نے اپنے اندر بہت سے روگ پال لیے تھے مگر اس نے کبھی کسی پر اپنی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دی تھی، اس کی حالت اس لکڑی کی سی تھی، جسے دیمک اندر سے چاٹ گئی ہو مگر باہر سے وہ صحیح سلامت دکھائی دے رہی ہو لیکن ایک ہلکے سے جھٹکے سے بھی وہ زمین پر ڈھیر ہو جائے، بیماریوں اور پریشانیوں نے اسے وقت سے بہت پہلے بوڑھا کر دیا تھا، ڈاکٹر کئی بار اسے اس کی اندرونی حالت سے آگاہ کر چکا تھا مگر اس نے ہمیشہ سنی ان سنی کر دی تھی، وہ جن حالات سے گزر رہا تھا ان کی وجہ سے بلڈ پریشر اور شوگر نے ایک ساتھ اسے گھیر لیا تھا، رہی سہی کسر ہیپاٹائٹس سی نے پوری کر ڈالی تھی۔

جب سے ایک دو بار چاچی نے اسے تکلیف کی حالت میں تڑپتے ہوئے دیکھا تھا، وہ بے چین رہنے لگی تھی، کرم دین نے اسے قسم دی تھی کہ وہ اس کی بیماری کے بارے میں کسی سے بھی ذکر نہ کرے، اس لیے وہ ایک عرصے تک اندر ہی اندر کڑھتی رہی، آخر کرم دین کی حالت دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا اور وہ میاں جی کے پاس جا پہنچی۔

"میاں جی آپ کو معلوم ہے، کرم دین دوسروں کی مدد کے لیے کس قدر بھاگ دوڑ کرتا ہے۔" چاچی نے میاں جی سے کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔"

"تو کیا ہمارا فرض نہیں بنتا کہ ہم بھی اس کی پریشانیوں میں اس کے کچھ کام آئیں؟ وہ کسی کو کچھ نہیں بتاتا میاں جی! میں نے ان آنکھوں سے اسے تکلیف سے تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"مجھ سے تو اس نے بھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔"

"میاں جی اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے، میں چاہتی ہوں کسی طرح آپ اس کے بچوں کو اس سے ملوا دیں۔"

"ایسی بات ہے تو میں کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔"

"ان کا پتا میں آپ کو بتا دوں گی۔ آپ جائیں گے تو وہ آپ کی بات کبھی نہیں ٹالیں گے۔"

"ٹھیک ہے میں کسی روز ان کے ہاں چلا جاؤں گا۔" میاں جی نے تسلی دی۔

چاچی سے کسی کی بھی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی، کرم دین کی بات کرتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، جب میاں جی نے کرم دین کے سسرال میں جانے کا وعدہ کیا تو اسے حوصلہ ہو گیا تھا، اس لیے وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی۔

ہیپاٹائٹس نے کرم دین کو الجھا کر رکھ دیا تھا، اس کا پیٹ پھول گیا تھا اور چہرے کی رنگت سیاہ ہونے لگی تھی، وہ فیکٹری سے بھی چھٹیاں کرنے لگا تھا، مگر اس

کے باوجود گرتا پڑتا باجماعت نماز ادا کرنے مسجد میں ضرور پہنچ جاتا تھا، اس کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر میاں جی نے اسے سمجھایا تھا۔ "اسلام میں اتنی تو رعائت ہے کہ اگر کسی بیماری یا تکلیف کی وجہ سے مسجد میں جانے میں دشواری ہو تو گھر پہ نماز ادا کر لو۔" میاں جی کی بات سننے کے بعد وہ بمشکل کوشش سے ایک دو نمازیں ادا کرنے مسجد میں آتا تھا، باقی کی نمازیں گھر پر ہی پڑھ لیتا تھا، مگر رفتہ رفتہ وہ ایسا بھی نہ کر سکا۔

کہیں سے میاں جی کے کانوں میں بھی یہ بات پڑ گئی تھی کہ ڈاکٹر کرم دین کو چیک کرنے گھر پر ہی آیا تھا، ڈاکٹر نے کرم دین کو تو کچھ نہیں بتایا تھا مگر اس نے محلے کے کسی شخص کو بتا دیا تھا کہ اب وہ چند دن کا ہی مہمان ہے، پھر بھی کچھ محلے دار اسے ہسپتال لے گئے تھے۔

میاں جی نے چاچی کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ کر دروازے پر لگی گھنٹی بجا دی تھی، دروازہ کھولنے کرم دین کا سسر مشتاق آیا تھا، مشتاق نے میاں جی کو دروازے پر کھڑے دیکھا تو ایک پل کے لیے وہ اپنی آنکھیں جھپکنا ہی بھول گیا تھا، اس کی نہ صرف کئی بار میاں جی سے ملاقات ہو چکی تھی بلکہ کئی بار وہ ان کی امامت میں نماز ادا کر چکا تھا۔

"بسم اللہ...... بسم اللہ...... ہماری قسمت کہ آج میاں جی خود چل کر ہمارے گھر تشریف لائے ہیں۔" مشتاق نے چہرے پر مسکراہٹ سجائے میاں جی کو دیکھ کر کہا اور پھر بولا "آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں میاں جی! اندر آ جائیں۔"

مشتاق کے کہنے پر میاں جی اس کے ساتھ ساتھ چل پڑے، میاں جی کو ڈرائینگ روم میں بٹھا کر مشتاق نے دیگر اہل خانہ کو بھی ان کے آنے کی اطلاع کر دی تھی، اس روز کام سے چھٹی ہونے کی وجہ سے اکرم اور اکبر بھی گھر پر ہی تھے، وہ بھی میاں جی کا سن کر وہیں آ بیٹھے تھے۔

"یہ بات تو تم لوگ بھی سمجھتے ہو کہ میں یہاں بلا وجہ نہیں آیا۔" میاں جی نے بات کی۔

"میاں جی یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے بزرگ ہمارے اس غریب خانے پر تشریف لائے۔"

"دراصل میں یہاں کرم دین کے بچوں کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔"

"لیکن میاں جی کرم دین سے اب ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں رہا۔"

"زبان سے کہہ دینے سے تعلق ٹوٹ نہیں جایا کرتے۔ وہ کل بھی ان بچوں کا باپ تھا اور آج بھی وہ رشتہ اسی طرح قائم ہے۔"

"میاں جی ہماری اتنی اوقات نہیں کہ ہم آل رسول ﷺ کے سامنے اونچی زبان میں بھی بات کریں، لیکن کرم دین کی حرکتوں سے میری بیٹی اور اس کے دو معصوم بچوں کی جان گئی اسی لیے میں ان دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لے آیا تھا، وہاں ہوتے تو شائد اب تک یہ بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوتے۔" مشتاق نے رندھی ہوئی آواز میں بات کی۔

"دیکھو مشتاق! میں یہاں تم سے کوئی بحث کرنے نہیں آیا۔ میں کرم دین کے بچوں کو اس لیے لینے آیا ہوں کہ شاید انہیں دیکھ کر کرم دین کی حالت کچھ سنبھل جائے۔ وہ جس کرب سے گزر رہا ہے شاید بچوں کو دیکھ کر اس میں کچھ کمی آ جائے۔"

"کیا ہوا کرم دین کو؟" میاں جی کی بات سن کر مشتاق نے پریشان ہو کر پوچھا، اکرم اور اکبر بھی پریشان ہو گئے تھے۔

"یہ تم خود چل کر دیکھ لو تو زیادہ بہتر ہے...... لیکن اتنا ضرور کہوں گا، اگر آپ لوگ اب بھی اس سے نہ ملے تو شاید پھر بہت دیر ہو جائے۔" بات کرتے ہوئے میاں جی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

''ہم بچوں کو لے کر ابھی چلتے ہیں میاں جی۔'' مشتاق نے بات کی اور پھر اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جلدی سے عمر اور ماجدہ کو لے آؤ۔''

باپ کی بات سنتے ہی اکرم اور اکبر خاموشی سے وہاں سے باہر چلے گئے، ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد اندر سے خواتین کے رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگی تھیں، رونے کی آواز سن کر مشتاق بھی اندر چلا گیا تھا، کچھ دیر تک رونے پیٹنے کی آوازیں ڈرائینگ روم میں بیٹھے میاں جی کے کانوں میں پڑتی رہیں، پھر مشتاق نے آکر اطلاع دی کہ وہ لوگ جانے کے لیے تیار ہیں۔

بچوں کے ساتھ مشتاق، اکرم اور اکبر نے جانے کا پروگرام بنایا تھا مگر غفوراں بھی ضد کر کے ان کے ساتھ چل پڑی تھی، وہ سب میاں جی کے ہمراہ کرم دین کے ہاں پہنچے تھے، انہیں راستے میں ہی کرم دین کی حالت مزید بگڑنے اور ڈاکٹروں کا اس کے لیے دعائیں کرنے کو کہہ کر ہسپتال سے فارغ کر دینے کی اطلاع مل گئی تھی، گھر کے باہر بہت سے محلے دار جمع تھے، میاں جی نے کسی سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی اور خاموشی سے گھر کے اندر داخل ہو گئے تھے، بچے اور دیگر افراد بھی میاں جی کے پیچھے پیچھے ہو لیے تھے، گھر کے اندر بھی بہت سے لوگ افسردہ کھڑے تھے اور کرم دین آنکھیں بند کیے چارپائی پر لیٹا تھا۔

''کیا بات ہے کرم دین! تم آنکھیں کیوں نہیں کھول رہے؟'' میاں جی نے رندھی ہوئی آواز میں بات کی۔

کرم دین کے کانوں میں میاں جی کی آواز پڑی تھی مگر وہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں کھول نہیں پایا تھا۔

میاں جی نے کچھ پل کے لیے انتظار کیا اور پھر بولے۔ ''کرم دین تم کہا کرتے تھے ناں، محلے میں کوئی بھی مجھ سے بات نہیں کرتا۔ آنکھیں کھول کر دیکھو آج محلے کے کتنے لوگ تمہیں ملنے کے لیے آئے کھڑے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میاں جی کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو بہہ نکلے تھے، مگر کرم دین کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔

''کرم دین ذرا دیکھو تو سہی آج تم سے ملنے تمہارے بچے بھی آئے ہیں۔'' میاں جی نے کرم دین کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا، ایسا کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر کرم دین کی آنکھوں پر گر پڑے تھے۔

میاں جی کی آواز کرم دین کے کانوں سے ٹکرائی تھی اور اس نے پوری کوشش سے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دی تھیں، سامنے ہی آنکھوں میں آنسو لیے اس کے دونوں بچے کھڑے تھے، جواب بڑے ہو گئے تھے، ان کے ساتھ ہی عائشہ کے والدین اور بھائی بھی کھڑے آنسو بہا رہے تھے، کرم دین نے بچوں کو دیکھ کر بانہیں پھیلا دی تھیں، عمر اور ماجدہ روتے ہوئے باپ کے سینے سے لپٹ گئے تھے، کرم دین نے ان دونوں کا ماتھا چوما اور پیار کیا، پاس کھڑے ہوئے لوگوں کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے، دونوں بچے اس کے سینے سے لپٹے ہوئے تھے، کرم دین نے آنکھیں کھولے رکھنے کی بہت کوشش کی تھی، وہ بچوں کو جی بھر کے دیکھ بھی نہیں پایا تھا کہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہوتے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی تھیں۔

ختم شد

❖